کوڑھ کی کاشت

پاکستان کے لٹنے کی درد بھری داستان



حقّی حق

کوڑھ کی کاشت

حکمرانوں کی حرص وہوس کا ڈسا ہوا پاکستان

ڈاکٹر حقی حق

شفیق پبلی کیشنز
شفیق بک سینٹر
چوک گڑھی شاہو لاہور پاکستان
فون: 042-6304761

زبیر احمد
نے
شفیق پبلیکیشنز سے
شائع کی

اشاعت:

سرورق:

قیمت:

برطانیہ 6 پاؤنڈ

ISBN 969-8443-18-5

لائبریری آف کانگریس (واشنگٹن ڈی۔سی) نمبر: JQ629.A56 C 638 2000

تقسیم کنندہ: جہانگیر بک ڈپو

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879

سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086

سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609

سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781

سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568

سیلز ڈپو حیدرآباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

۲۰- بلیئرنگ ڈپو

Website:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

انتساب......

وطن کی قہرزدہ زمین کے نام جس کی ہریالی، نمو
اور یافت میں کوڑھ سمو دیا گیا ہے جہاں
اب کوڑھ کی فصل کاشت کی جاتی ہے۔
کوڑھ بیجنا ، کوڑھ کاٹنا اور کوڑھ اُگانا

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَایَخْرُجُ اِلَّانَكِدًا كَذَالِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ۝

اور جو ستھری زمین ہوتی ہے اس کی پیداوار تو خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی) تو بہت کم نکلتی ہے۔ اسی طرح ہم ہمیشہ دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں۔ (سورہ اعراف)

پیش لفظ

1980ء کا عشرہ ہمارے وطن کی تاریخ میں یوں تو کئی حوالوں سے یاد رکھا جائے گا لیکن اس عشرے کا اہم ترین حوالہ، اس دہائی کی سب سے اہم یافت ہمارے معاشرے میں مُک مکا کی صنعت کا عروج ہے۔

کوڑھ کی کاشت اس صنعت کے بتدریج عروج کا احوال اور ان عوامل اور رویّوں کی نشان دہی کی کوشش ہے جو اس صنعت کے لیے بارش کے پہلے قطرے سے ژالہ باری کے موجودہ گھمسان تک سبھی کچھ ہیں۔

اس عشرے میں دیکھتے ہی دیکھتے، راتوں رات، آناً فاناً اور چل سو چل ہمارے ہاں مک مکا کا کوڑھ ایسا پھلا پھولا کہ انفرادی سطح سے اجتماعی سطح تک اور اداروں سے حکومت تک سب اس کوڑھ کی زد میں آگئے۔ مک مکا کا یہ کوڑھ اب ہماری مستند پہچان معتبر حوالہ ہمارے قومی کردار کا جزوِ اعظم، سب سے زیادہ بار آور جنس اور سب سے بڑی قومی صنعت ہے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مک مکا کا طرزِ عمل، انتہائی مصالحت آمیز رویہ اور بددیانتوں کو تحفظ فراہم کرنا روبہ تنزل معاشروں، تاراج ہوجانے والی قوموں اور مسقوط ہوجانے والے ملکوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ دو بڑی واضح مثالیں تو ہماری اپنی ہی ہیں۔ سقوط مسلم ہسپانیہ و مسلم ہندوستان کے آخری سالوں کا احوال اور ہماری موجودہ صورتحال میں گہری مماثلت اور بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اب ہمارے کھیتوں، کھلیانوں میں جیسے اِسی کوڑھ کی کاشت کی جاتی ہو، کوڑھ بیجنا، کوڑھ اُگانا اور کوڑھ کاٹنا۔

اب جنس قبیح، ناآسودہ و مکروہہ پر پلنے اور پرورش پانے والوں کو نتیجتاً مک مکا کا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے اور اس کی کئی قسمیں اور مختلف صورتیں مروج ہیں جن میں عمل اور اعمال کا کوڑھ، نیت اور نظریے کا کوڑھ، بے حسی اور بدنیتی کا کوڑھ، مسلک اور مصالحت کا کوڑھ سرفہرست ہیں۔

معاشرے کی نس نس میں اور ہر رگ و ریشے میں یہ کوڑھ رچ گیا ہے اور رنگ بھی چوکھا لایا ہے۔ اکثر پوشیدہ، بیشتر ظاہرہ اور اکثر و بیشتر برسرِعام، شفاف، عریاں، بنا لاگ لپیٹ اور چھپائے نہ چھپنے والا۔

مختلف طبقے، افراد، حلقے، گروہ، آبادیاں اور برادریاں طرح طرح کے کوڑھ میں مبتلا ہیں۔ اپنے اپنے دکھ کی طرح اپنا اپنا کوڑھ، اپنے اپنے سودے اور ہر ایک کی اپنی قیمت، مال وافر، بکاؤ مال بے حساب، خوب کماؤ، لوٹ کھسوٹ، پردہ پوشی، مصلحت اور مک مکاؤ۔

حسب توفیق و حسب حوصلہ لوگ ایک، ایک سے زیادہ، اکثر کئی کئی اور کہیں کہیں ہر طرح کے کوڑھ میں مبتلا ہیں لیکن مک مکا کا کوڑھ سب کا سانجھا سب کا مشترکہ ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ معاشرے کے اس برص آلودہ اور کوڑھ زدہ بدن میں مزید کتنے سانس رہ گئے ہیں اور انتظار یہ ہے کہ ان جذامی جسموں کی آخری فصل کون کاٹے گا، یہ فصیل کس سے تاراخت ہوگی اور کب تک!

ڈاکٹر حنفی حق — شکاگو

28 اگست 1999ء — امریکہ

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تکمیل کا باعث جناب زبیر احمد صاحب کا مخلصانہ سلوک ہے حالانکہ پبلشر ہونے کے ناطے سے ان کا سلوک مخلصانہ ہونے کی بجائے سودے بازی والا اور مخاصمانہ ہونا چاہیئے تھا۔ ان کی دینداری اور دھیمے پن سے یوں لگتا ہے کہ یا تو وہ غلط فیلڈ میں ہیں یا پبلشرز کے بارے میں رائے عامہ حقائق پر مبنی نہیں ہے۔

اسی طرح زمان احمد نیازی صاحب نے انتہائی قلیل وقت میں دن رات ایک کر کے کمپوزنگ کا مشکل مرحلہ آسان کر دیا، ان کی محنت اور اخلاص نے وقت کی کمی کو آڑے نہیں آنے دیا اور سرورق کی تکمیل میں جناب ذاکر صاحب کی مہارت اور مشورہ بہت کام آیا۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔ میں تہہ دل سے سب کا احسان مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔

ڈاکٹر حقی حق

عرض مصنف

سچ پوچھئے تو "کوڑھ کی کاشت" میں کوئی ایسی نئی بات تو نہیں تھی کہ چند ماہ کی مدت ہی میں اس کے دوسرے ایڈیشن کا تقاضا کیا جانے لگتا۔ نہ پاکستان کے لوٹے جانے کا واقعہ نیا ہے نہ کوڑھ کے کاشت کار اور نہ ہی اس موضوع پر کتابیں، قارئین کے سینکڑوں خطوط، ردعمل، اخباری تبصروں ، تنقیدی مضامین، ادارتی تجزیوں اور عوامی آراء کی روشنی میں کوڑھ کی کاشت کی اس حیران کن پذیرائی کی ہمیں تو ایک ہی وجہ سمجھ آ سکی ہے کہ آج کا قاری باخبر اور اپنی رائے میں استوار ہے وہ لٹیروں پر نفرین بھیجنے میں کسی سے پیچھے ہے نہ ان کی شناخت میں کسی مصلحت کا شکار۔

عوامی ہاتھ کا خائن گردنوں تک نہ پہنچنا بنیادی تبدیلی کی راہ میں سب سے بڑا پتھر رہا ہے۔ کوڑھ کی کاشت ان گردنوں کو ناپنے کا مؤثر ترین پیمانہ نہ سہی ایک اکائی، ایک نقطہ آغاز اور ایک احتسابی حوالہ ضرور ہے اور یہی عوامی پسندیدگی کی وجہ ہے۔

کوڑھ کی کاشت کے بارے میں جو بات تنقیداً کہی گئی ہے کہ کتاب کی زبان درشت اور لہجہ سخت ہے حقیقتاً یہی ہمارے حق میں ہے کہ جہاں لہجے زبان، الفاظ اور اظہار مصلحت سے آلودہ اور مفادات سے سرنگوں ہوں وہاں سیدھی بات اور دو ٹوک لہجہ بھی زبان کی تلخی اور لہجے کی سختی کا تاثر پیدا کر دیتا ہے اور یہ بات غیر معمولی لگتی ہے حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہرگز نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کلمہ حق باآواز بلند کہنے کی روایت مروج رہی ہے ہمارے اسلاف میں جبے کے اضافی کپڑے کا حساب مانگنے والے اور حساب دینے والے دونوں موجود رہے ہیں، دوسرا یہ کہ جنہوں نے ہمارے ملک کی زمینیں، مال اسباب، حمیت و حرمت کو لوٹا ہے انہیں ہم دل ہی دل میں جو کچھ کہتے ہیں اور کہنا چاہتے ہیں وہ تو احاطہ تحریر میں لایا ہی نہیں جاسکتا، لٹیروں، ڈاکوؤں اور بدعنوانوں کو جس قدر بھی درشت کہا جاسکے اور لوٹ مار کی جس قدر بھی مذمت کی جاسکے کم ہے، ہمیں اس پر اعتراض، شرمندگی اور پشیمانی ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔

''کوڑھ کی کاشت'' کو اشاعت سے عوامی پسندیدگی کے مرحلے تک لانے میں کئی دوستوں کا بے لوث تعاون اور حوصلہ افزائی شامل رہی ہے لیکن کچھ افراد اور اداروں کا خصوصاً احسان مند ہوں کہ جنہوں نے ہمارے نقطہ نظر سے عدم مطابقت کے باوجود بھی اپنے اخباروں، کالموں، جرائد اور رسائل میں ہماری کتاب پر اپنے تبصرے، اداریے، تنقید اور مضامین کو جگہ دے کر نہ صرف فراخدلی کا ثبوت دیا بلکہ صحت مند رجحان کی بنیاد ڈالی۔ ان میں اُردو ڈائجسٹ، نوائے وقت، جنگ، ندائے ملت، خبریں، پاکستان، دی نیوز، دی نیشن، تقاضے، حکایت، زندگی، تکبیر، محترم منو بھائی، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، ڈاکٹر انور سدید، ارشاد احمد عارف، عطاء الحق قاسمی، عباس اطہر، حسن نثار، محمد عامر ہاشم خاکوانی، طاہر انجم و دیگر محترم دانشور حضرات اور میرے پبلشر زبیر احمد صاحب شامل ہیں۔ میں ان سب کا احسان مند ہوں۔

ڈاکٹر حقی حق

شکاگو۔امریکہ

آئین جوانمرداں' حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

محترم ڈاکٹر حقّی حق شکاگو بورڈ آف ایجوکیشن امریکہ سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب امریکہ سے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی ہیں۔ رہتے تو یہاں سے سات سمندر پار ہیں لیکن ان کا دل ہر لمحہ پاکستان میں دھڑکتا ہے۔ وطن کی محبت میں نہ صرف کڑھتے رہتے ہیں بلکہ جلتے بھی رہتے ہیں۔

"کوڑھ کی کاشت" میں ڈاکٹر حقی حق نے بڑی تحقیق و عرق ریزی سے ایسے تمام حقائق مجتمع کئے ہیں جو وطن کے ان سپوتوں کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کس کس طرح انہوں نے اس دھرتی کے خون کو چوسا اور کس کس طرح اس دھرتی کو کوڑھ زدہ کیا۔ ان سپوتوں میں علماء' سیاستدان' جاگیردار' بیوروکریٹس اور فوجی افسران بھی شامل ہیں۔

"کوڑھ کی کاشت" میں آپ کو جابجا اندازہ ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب بہت زیادہ آزردہ ہونے کے ساتھ ساتھ تلخ بھی ہو گئے ہیں۔ یہ تلخی کسی ذاتی عناد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اور صرف اس پاک اور سوہنی دھرتی کی الفت اور محبت

میں در آئی ہے۔ ''کوڑھ کی کاشت'' میں بہت سے ''شرفاء'' اپنا آئینہ دیکھیں گے۔

میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ ''کوڑھ کی کاشت'' کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی گوناں گوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر دو دفعہ پاکستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا مسودہ اگست 1999ء میں میرے سپرد کیا۔ آج 14 جنوری 2000ء کو اس کی اشاعت مکمل ہوئی لیکن اگست 1999ء سے جنوری 2000ء کے دوران میاں نواز شریف صاحب کی حکومت کی جگہ فوجی حکومت برسر اقتدار آ گئی ہے۔

اللہ رب العزت سے دُعا ہے کہ وہ ہمارے وطن عزیز پر کرم فرمائیں اور فوجی حکومت کو توفیق دیں کہ وہ اس کوڑھ زدہ دھرتی کو سرسبز و شاداب بنائیں، مزید کوڑھ پھیلاؤ کا باعث نہ بنیں۔

کوڑھ کی کاشت کا دوسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔ اللہ رب العزت کے صد شکر و احسان کے بعد مجھے ان تمام محترم اہلِ قلم احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے کوڑھ کی کاشت پر اپنی بے لاگ آراء و تبصروں سے نوازا۔ ان سینکڑوں قارئین کا اور ان بے حساب ادب دوستوں کا شکریہ کہ جنہوں نے مجھے اور ڈاکٹر صاحب کو خطوط لکھے۔ کچھ اہلِ قلم کی آراء شاملِ اشاعت ہیں۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب
زبیر احمد (ناشر)
جولائی ۲۰۰۰ء

نظریہ مک مکا

نظریہ مک مکا
میں تو میں
تو بھی کھا

جائز اور ناجائز کاموں کے لئے سرکاری وغیر سرکاری اہل کاروں کو رشوت دے دینا ہی مک مکا نہیں ہے۔ مک مکا کا نظریہ، تعریف، توجیہہ اور افادیت اس سے کہیں زیادہ وسیع البنیاد، ہمہ صفت و ہمہ جہت ہے۔ مک مکا ہمارے معاشرے میں ایک جامع نظریہ، ایک نو وارد ضابطہ حیات اور ایک مسلمہ و فیصلہ کن اُصول کے طور پر اُبھرا ہے ایک ایسا معمول روزمرہ جسے سب مانتے ہیں، قدم قدم پہ کام آنے والا تریاق، ایک تیر بہ ہدف سو فیصد۔ ہر کوئی اسی قباحت کا قائل اور اسی طرف کو مائل ہے۔

یہ یک طرفہ راستہ ہے آپ اس طرف سے آتو سکتے ہیں مگر جا نہیں

سکتے۔ یہ ون وے ٹریفک کے لئے ہے اس طرف سے جانا ٹریفک کے اصول اور قانون کی خلاف ورزی ہے۔ مگر آپ پھر بھی ادھر سے ہی جا رہے ہیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ نتیجتاً" ٹریفک پولیس کا سارجنٹ آپ کو روک لیتا ہے اور آپ کے اور سارجنٹ کے درمیان خاصا اشتعال انگیز مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ آپ کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کو کچھ ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ آپ نے اس یک طرفہ راستہ میں مخالف سمت سے داخل ہو کر صریحاً ضابطے کو توڑ دیا ہے آپ قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود بھی دھاندلی، دھمکی، دھونس، دباؤ اور اونچی آواز کی بنیاد پر آپ اپنا دفاع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ادھر سارجنٹ صاحب بضد ہیں کہ وہ آپ کا چالان ضرور کریں گے۔ حالانکہ دونوں فریقین جانتے ہیں کہ چالان ہو گا نہیں۔ اگر حقیقتاً چالان ہو جانے کا معمولی سا شائبہ بھی آپ کے گمان میں ہوتا تو آپ اس مخالف سمت سے ہرگز ہرگز داخل نہ ہوتے۔

تکرار بڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ مجمع بھی بڑھ گیا ہے کچھ تماش بین اپنی اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ بالآخر مجمع میں سے وہ آوازہ بلند ہوتا ہے کہ جس کے سنتے ہی فریقین نہال ہو جاتے ہیں۔ باؤ جی اوتھے ضرور جانا اے ایتھے ای مکالو (یعنی وہاں ضرور جانا ہے یہیں فیصلہ کرلو)،

بسم اللہ دونوں فریقوں کے دل کی بات کسی نے تو کہی۔ وہ بات جسے کہنے میں آپ کی انا، سبکی اور حجاب حائل تھا سرعام کہہ دی گئی ہے۔ سارجنٹ صاحب بھی آپ کو یہی یاد دلانا چاہتے تھے لیکن اس وقت ضرورت مند آپ ہیں یہ پہل آپ کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ یہ مسئلہ بہرحال حل ہو گیا ہے۔ تندو تلخ مکالمہ اب مذاکرات اور مصالحت کی طرف مڑ جاتا ہے۔ "ایتھے ای مکالو" کی دل پذیر اور خوش کن مصالحانہ دعوت پر یکایک فریقین کے تنے

ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں' آواز میں نرمی' لہجے میں ٹھہراؤ اور چہرے پر چاپلوسی کا رنگ در آتا ہے۔ دونوں طرف سے جو چیلنج ایک دوسرے کو دیئے جا رہے تھے واقفیت کا دباؤ ڈالا جا رہا تھا نفرین بھیجی جا رہی تھی اب اس کی جگہ امن' اپنائیت اور دھیمے پن نے لے لی ہے۔ آپ کو بھی یکایک سارجنٹ کی اتھارٹی کا خیال آجاتا ہے اور سارجنٹ بھی آپ کے نظریہ ضرورت قانون شکنی کو تسلیم کر لیتا ہے۔ قانون توڑنے کے آپ کے حق اور ضرورت کو کسی حد تک مان لیا جاتا ہے۔ اب مجمع بھی چھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ جان گئے ہیں کہ فریقین اب آمادہ مک مکا ہیں انہیں چلے ہی جانا چاہئے۔ دونوں فریق سمجھ دار ہیں وہ جانتے ہیں کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔

مک مکا کی یہ سب سے ادنیٰ' اولین اور عوامی قسم ہے صبح سے شام تک شاہراہوں پر اور دفتروں میں' گھروں میں اور بازاروں میں' عدالتوں میں اور بالاخانوں میں' بیٹھکوں میں اور چوباروں میں غرضیکہ جگہ جگہ ایسے لاکھوں سودے ہر وقت طے ہوتے ہیں۔ ہر جگہ اسی طرز عمل کی عملداری اور اسی رویے کو رسوخ حاصل ہے۔ قباحت اس سودے میں صرف یہی نہیں ہے کہ ایک سرکاری اہل کار کو رشوت دے کر خود کو چالان ہو جانے سے محفوظ رکھا گیا بلکہ اصل مسئلہ وہ پس منظر اور ذہنی اور نفسیاتی رویہ ہے جو اس سودے سے وابستہ ہے۔ خرابی کی جڑ وہ منفی اور ناپسندیدہ اپروچ ہے جو مک مکا سے پیوستہ ہے۔ آپ کا یہ یقین کامل کہ ضابطے کو توڑا جا سکتا ہے' قانون کی کلائی مروڑی جا سکتی ہے' قانون نافذ کرنے والوں کو خریدا جا سکتا ہے' آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ قانون سے بالا اور ضابطوں سے بالاتر ہیں۔ اگر یہ یقین موجود ہو کہ یک طرفہ راستے کی خلاف ورزی پر آپ بہرحال پکڑے جائیں گے' آپ کا چالان ہو گا آپ کو ٹریفک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہونا

پڑے گا' سزا کے طور پر جرمانہ ہوگا عین ممکن ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس منسوخ یا معطل ہو جائے۔ قانون توڑنے پر آپ کی کوئی سفارش' واقفیت اور دباؤ کام نہیں آئے گا۔ چرب زبانی اور قانون توڑنے کا کوئی جواز آپ کو نہیں بچا سکتا ہے تو آپ تمام عمر میں ایک دفعہ بھی اس یک طرفہ راستہ سے داخل نہیں ہوں گے۔

اصل المیہ اور قباحت معاشرے میں رشوت کے لین دین سے زیادہ اس یقین کامل کی ہے کہ قانون شکنی سے بچاؤ کی صورت موجود ہے۔ اسلامی ضابطہ حیات کی دلدادہ وپرستار قوم اور نظریے کے زور پر وجود میں آنے والا ملک اب مک مکا اور ضرورتوں کے نظریے سے مسلح ہے' رواں دواں ہے' پھل پھول رہا ہے۔

رشوت پولیس والوں کو دی جا رہی ہو کہ منتخب نمائندوں کو امتحانی مراکز کے ناظم کو یا نکاح خوانوں کو' جھوٹے گواہوں اور بد خواہوں کو یا قبضہ گروپ سے اپنی زمین اور گھر واگزار کرانے کے لئے بدمعاشوں کو یا آشناؤں کے ساتھ بھاگ جانے والی بیبیوں کا اپنے شوہر سے فسخ نکاح کا فتویٰ جاری کرنے والے فتویٰ فروشوں کو رشوت کا یہ سارا لین دین جو عوامی سطح پر مروج اور فروغ پذیر ہے یہ کل کا محض جزو بلکہ معمولی جزو' صرف ایک پہلو اور خرابی کی ادنیٰ ترین صورت ہے جب کہ مک مکا ایک مکمل اور سوچا سمجھا رویہ ہے ایک ایسا رویہ اور طرز عمل جو کثیر المقاصد ہے۔ صد اطراف اور شش جہت' ہشت پہلو اور تہ بہ تہ' کثیر الجہات اور پرت اندر پرت' انفرادی کردار پر محیط' اجتماعی کردار پر مسلط اور قومی کردار پر سایہ فگن' ہر کوئی حسب ضرورت و حسب حوصلہ مک مکاؤ سے مستفید ہو رہا ہے۔

مک مکا چونکہ مکمل انسانی اور معاشرتی رویے اور کردار کے ظاہری' باطنی

اور نفسیاتی عوامل پر مشتمل ہمارے ضمیر' ضرورتوں تربیت' ترجیحات اور ترغیبات کا عکس ہے سو عین ممکن ہے بلکہ قیاس اغلب ہے کہ مک مکا سے جو کام آپ لے رہے ہیں۔ میری ضرورت اس سے مختلف ہو اور میں اسے کسی اور طرح سے ذرا مختلف طریقے سے زیادہ شاطرانہ زاویے سے استعمال کر رہا ہوں۔

ٹریفک سارجنٹ برسرعام کرنسی نوٹوں کی صورت میں مک مکا پر آمادہ ہے' صحافیوں اور قلمکاروں کی ضرورت' مطمع نظراور پیشہ ورانہ عروج غیر ملکی دورے کے لئے حکومتی وفد میں شامل ہو جانا ہے' ریٹائر ہونے والے کلیدی عہدے داروں' ججوں' آرمی کے جرنیل اور بیورو کریٹس کی نظر دوچار مربع زمین کی یافت پر ہے۔ عوامی نمائندے مزید قرضوں کے حصول اور پرانے قرضوں کو معاف کرانے کے چکر میں ہیں' ووٹر بددیانت اور کئی بار کے آزمائے ہوئے خائن کو بار بار منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ قصبے اور تحصیل کی سطح پر لوکل پاور بروکر سرکاری زمینوں کو طویل مدت کے لئے پٹے پر حاصل کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی دوسری یا تیسری نسل ان زمینوں پر قابض ہو جاتی ہے۔ یہ سب صورتیں مک مکا کے مختلف اظہار کی ہیں۔ بددیانت رویے کو اپنی اپنی ضرورت' رسائی اور کامیابی کے لیے درجہ بہ درجہ سطح پر استعمال کرنے سے مک مکا کا ہمہ گیر معاشرتی میکانزم وجود میں آچکا ہے۔

فردا" فردا" ہر کسی نے مک مکا کی رسی کو مضبوطی سے تھاما ہوا ہے۔ بلکہ گردنوں میں ڈالی ہوئی ہے۔ اکثر وبیشتر لوٹ کھسوٹ' رشوت اور جہنم کی اس کھوتی پر سوار ہیں جب کہ کسی کسی نے مک مکا کی اسی کھوتی کو مستقل جپھی بھی ڈالی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں صورت حال ایسی بھی ہے کہ اہل ایمان کو مک

مکا کی اس کھوتی نے بھی دبوچا ہوا ہے اگر یہ اس کے نرغے سے اور آغوش سے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔

میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

ہمارے معاشرے کا انفرادی واجتماعی کردار اور رویوں کے اساسی عناصر نظریہ مک مکا کا مکمل عکس ہیں' رویے کا اظہار کسی بارے میں بھی کیا جا رہا ہو' کسی بھی سطح پر کیا جا رہا ہو مک مکا سے ضرور آلودہ ہوتا ہے لاکھ چھپایا جائے مگر مک مکا کی جھلک جھلکتی رہتی ہے۔ لالچ' بددیانتی' بدنیتی' لوٹ کھسوٹ' منافقت اور مصالحت چھپائے نہیں چھپتی۔

نظریہ مک مکا کے زیر اثر معاشرے کے مختلف طبقوں' حلقوں' افراد' اداروں اور حکومت کے درمیان انٹر ایکشن کے لئے ایک غیر تحریری معاہدہ وجود میں آگیا ہے۔ ایک ایسی انڈر سٹینڈنگ ان سب کے درمیان قائم ہو گئی ہے کہ بنا کہے' مانگے بغیر مک مکا کا پہیہ خود کار انداز میں رواں رہتا ہے۔ مک مکا کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ اقدامات' فیصلے' طریقے اور نتائج' عمل اور دائرہ عمل مک مکا کے حصار کے اندر اندر رہتے ہیں۔ ایک ایسی دستاویز موجود ہے جس پر کچھ بھی تحریر نہ ہونے کے باوجود اُسے مستند مانا جاتا ہے۔

نچلی اور عوامی سطح سے اونچے طبقے اور طبقہ اشرافیہ تک ہر طرح کا بکاؤ مال اور بیوپاری میسر وموجود ہیں سودے طے کئے جا رہے ہیں خدمات پیش کی جا رہی ہیں معاوضے پر مذاکرات ہو رہے ہیں مک مکا اور مول تول اپنے عروج پر ہے بددیانتی کی صنعت کو ہمارے ہاں ایسا عروج پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

ضمیر' ضرورت' عزت نفس' ایمان اور آبرو کی یوں کھلے عام نیلامی ہمارے معاشرے میں مروج نہیں تھی۔ شخصی وزن اوصاف کے حوالے کی بجائے مارکیٹ ویلیو کے ناطے سے مقرر کیا جا رہا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ

آپ کسی کے لئے کیا کر سکتے ہیں' کس قدر کار آمد ہیں آپ کا حسن ظن کیا ہے۔ قیمت فروخت کیا ہے۔ آپ اپنی حمیت' ایمان اور اصول کے بدلے میں کیا چاہتے ہیں آپ خود کو کتنے میں بیچتے ہیں خدمات کا معاوضہ یک مشت طلب کر رہے ہیں یا بعد از فروخت بھی دیکھ بھال تحفظ اور سروس کا دیرپا پیکج آفر کر رہے ہیں۔ آئی چلائی اور ایک ہی دفعہ آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں یا مستقلاً" ناموری کے خواہش مند ہیں آپ کا مطمع نظر کیا ہے کیا صرف اسلام آباد میں مفت کا پلاٹ چاہئے یا عمرہ وفد میں شمولیت' زمین لیز پر چاہئے یا قرضہ معاف کرانا ہے' بیٹی کو غیر ملکی سکالر شپ لے کر دینا چاہتے ہیں یا بیٹے کو ثقافتی وفد میں شامل کرانا ہے۔ بیرون ملک علاج کے لئے زرمبادلہ کی ضرورت ہے یا تحفظ چاہئے۔ کیا آپ کسی ایسے سرپرست کی تلاش میں ہیں جو آپ کو قبول کرلے اور ہر طرح کے جرائم پر چھتری تان دے یا اپنے خلاف کسی محکمانہ کارروائی کو روکنا چاہتے ہیں۔ پوزیشن' عہدہ' اختیار کے متقاضی ہیں یا کسی سرکاری ٹھیکے کے حق میں ہیں۔ کار امپورٹ کرنے کے لئے کسٹم ڈیوٹی معاف کرا دینے والے ایم این اے کی تلاش ہے یا ایجنٹ کی' سمگلروں سے آشنائی چاہتے ہیں یا صالحین سے۔ ذخیرہ اندوزوں کی رفاقت درکار ہے یا عالموں سے میل ملاپ' آپ کا کام بہرحال ہو جائے گا لیکن اس ہو جانے میں آپ کا باوزن ہونا شرط ہے۔

مفادات' غرض' بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ کی مصنوعات کی اس منڈی میں طرح طرح کے لوگ نظر آتے ہیں کوئی فروخت کنندہ اور کچھ فروخت شدہ۔ کوئی کوئی بیک وقت دونوں کہ جیسا بھی سودا طے ہو جائے ان بیوپاریوں میں سربراہ حکومت و سربراہ مملکت سے لے کر نچلے درجے کے عام ملازمین تک شامل ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر ہو کہ سرکاری ہو' سویلین ہو کہ فوجی ہو' نیم

سرکاری ہو یا نیم رضامند لیکن اللہ کا شکر اور احسان خاص یہ ہے کہ بہرحال موجود ہے اور ہر طرح کی خدمات بیچی اور خریدی جا سکتی ہیں۔ اس شعبے میں ہماری خود کفالت کا ایک عالم گواہ ہے۔

کم از کم اس میدان میں ناکامی کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔ کامیابی ہی کامیابی ہے۔

مک مکا کی اس منڈی میں مال فروخت دلچسپ اور دل لبھاؤ اور مال خرید یونیک اور نیارا ہے خریدنے اور بیچنے والے بڑے شاطر بڑے گھاگ تیز نظر' معاملہ فہم اور انسانی کھال کے آر پار تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان سودے بازوں اور ساہوکاروں میں مختلف پیشوں کے پیشہ ور خلیفے' محکموں کو دیمک کی طرح کھا جانے والے ڈیموکریٹس' غیر معیاری کارکردگی اور ناپسندیدہ صورت حال کو سٹیٹسٹکس کا تڑکا اور ٹیکنیک کا بج لگا کر دل افروز اور حوصلہ افزاء قرار دینے والے ٹیکنوکریٹس، تعلیمی روک تھام کے ماہرین، ناکام پالیسیاں بنانے والے مشیر، عوامی نمائندگی کے دعوے دار بالشتیے، عدلیہ کے کوتاہ قامت مخبر، غیر مردوں کا دل لبھانے والی عورتیں' صحافی' رنڈیاں' سمگلر' گرگے' سماجی کارکن' لوفر' این جی اوز' ایجنٹ' خدمت کمیٹیوں کے ممبران' ٹاؤٹ' رسہ گیر' اٹھائی گیرے' پاور بروکر' میچ میکر جو ایک راشی اور خائن کا دوسرے راشی اور خائن سے ناطہ جوڑنے کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ سرکاری امانتوں اور خفیہ اطلاعات کے نقب زن' غرضیکہ کونسا شعبہ ہے کہ جس کے مردم خور نمائندے اس منڈی میں موجود نہیں ہیں۔

سامان خرید وفروخت بھی بیچنے والوں سے کچھ کم دلچسپ اور کم عبرت آموز نہیں ہے۔ یہاں گواہی بیچی جا رہی ہے۔ باآواز بلند اعلان کیا جا رہا ہے میں اللہ کو حاضر وناظر جان کر' اس کی مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر' اسی کتاب

پر کہ اگر اسے پہاڑوں پر نازل کیا جاتا تو پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگتے' یہ گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے یہ جرم نہیں کیا بلکہ یہ جرم فلاں ابن فلاں نے کیا' میں نے دیکھا اور اس بھری معزز عدالت میں حلفاً بیان کر دیا۔ میں جھوٹی شہادت کا چیمپئن ہوں' میں سلطانی گواہ' وعدہ معاف گواہ ہر طرح کا گواہ بن سکتا ہوں مجھ سے مک مکا کر لو میری طرف آؤ میں ہی تمہیں بچا سکتا ہوں اور تمہارے حریفوں کو پھنسا سکتا ہوں۔

یہاں تحفظ بیچا جا رہا ہے۔ جس کو بھی کردہ جرائم پر تحفظ درکار ہے مجھ سے رجوع کرے میں بد دیانتوں' سیاہ کاروں اور راشیوں کی آخری امید ہوں' میں محافظت میں یکتا ہوں میں یہاں کا حکمران ہوں۔

کوئی یہاں وراثت اور ولدیت بیچ رہا ہے کوئی شناخت فروش ہے۔ دن کو منصفی اور رات کو مخبری کرنے والے انصاف بیچ رہے ہیں۔

سرکاری خفیہ فیصلوں کو قبل از وقت فاش کرنے والے عہدیدار ہیں جو لمحہ بھر میں کروڑوں کا زر مبادلہ ادھر سے ادھر کر دینے پر قادر ہیں' یہ عہدیدار ذخیرہ اندوزوں کی چاندی اور بازاروں میں تاریکی پھیلا دینے میں طاق ہیں۔ یہاں مفادات بیچے اور خریدے جا رہے ہیں میں ماہر مشاطگی وسیاسی جوڑ توڑ کا بادشاہ ہوں میں آگ اور پانی' دائیں اور بائیں' بھیڑیے اور بکری کو یک جان کر سکتا ہوں میری پناہ میں آجاؤ میری مانگ مان لو' فائدہ ہی فائدہ ہے۔

میں ٹیکس ماسٹر ہوں میرے ہاتھ پہ بیعت کرلو میں ٹیکس کے قاعدے قانون تک آپ کی مرضی کے مطابق بدلوا سکتا ہوں' امپورٹ ایکسپورٹ' کوٹہ' سیلز ٹیکس' جنرل ٹیکس' سرچارج میں چاہوں تو آپ کی خاطر پوری معیشت پر زلزلہ طاری کردوں۔ میں بنکوں کا ان داتا ہوں قرضے معاف کرانے

سے لے کر ناجائز حرام کی کمائی کے کالے دھن کو جائز' مبارک اور مستحسن قرار دینے تک سارے کام کر سکتا ہوں بس میرا خیال رکھو میرا نام نہ آنے دو۔ میرے بچوں کو باہر کے ملکوں میں ڈالروں کی ترسیل جاری رکھو۔ ان کو شکایت نہ ہو۔ جب تک وہ خوش رہیں گے تم بھی خوش رہو گے میں بھی خوش رہوں گا۔ ہم سب خوش اور خوش حال رہیں گے۔

مجھے دانش ور کہا جاتا ہے میں نظریہ سازی کا کام کرتا ہوں۔ میری دانش کا راز اور میرے ہنر کا عروج اس میں ہے کہ میں ایسے ایسے ناقابل عمل' گنجلک' ادق اور ناموزوں نظریے پیش کروں جو ابتری' افراتفری نفاق اور منافرت پھیلانے کا سبب بنیں۔ غیر جماعتی ایوان' یک جماعتی نظام' محدود جمہوریت' دو ایوان' قومی حکومت' فری اکانومی' کھلی معیشت' روٹی کپڑا اور مکان' نظریہ ضرورت اور ضابطہ مک مکا' یہ کارنامے میری دانش کی دلیل ہیں۔ مجھے امت رسول اللہ میں بدامنی' بدنیتی اور انتشار پھیلانے کا اعزاز حاصل ہے۔

اس طرف مناظرہ باز' مسلک ساز اور تعصب پھیلاؤ گروپ ہے۔ اس گروپ کے زیر انتظام نئے مسلک تراشے جاتے ہیں' مذہبی گروہ بندی اختراع جاتی ہے تعصب پھیلایا جاتا ہے۔ رکوع و سجود میں مشغول مسلمانوں کو ذبح کرنے کی قباحت کربلا کے بعد اب ہمارے ہاں دہرائی جا رہی ہے۔ یہ گروہ اپنی خدمات کی نوعیت میں بڑا منفرد اور بہت ممتاز اور مشاق ہے۔ لہٰذا اجرت بھی زیادہ اور مراعات بھی۔ اس گروپ کی خدمات کی طلب بھی بہت ہے اپنے تو اپنے ان کی خدمات اور ہنرمندی کے طلبگار تو غیر ملکی حکومتیں اور تخریبی ادارے تک ہیں۔ ہر کہیں ان کا لوہا مانا جاتا ہے۔ یہ اس کے حقدار بھی ہیں' بے گناہوں کو قتل کرنے کے لئے جس شقاوت' لوہا اعصاب اور یزیدیت

کی ضرورت ہوتی ہے اس وصف کے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔

آخر میں یہ ایک گدھ نما گروہ صف آراء ہے اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مردار کھانے میں لاثانی' جیبیں تراشنے میں یکتا اور بدنیتی میں بلا مقابلہ ہے۔ یہ گروہ ہر دور' ہر حکومت اور ہر عہد کا مراعات یافتہ' لاڈلا اور ہمیشہ کا معزز و محترم ہے۔ ان میں اسمبلیوں کے سپیکر ہیں' وزراء ہیں' ایم این اے اور ایم پی اے ہیں' سینیٹر اور صنعتکار ہیں۔ جاگیردار اور اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ ان جیب کتر اوصاف لوگوں کا فن یہ ہے کہ یہ سرکاری واجبات کی ادائیگی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اور سرکاری خزانے میں پیسہ جمع کرانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں ایسے ایسے اور ایسی ایسی دلربا اور مقتدر شخصیتیں شامل ہیں جو موروثی جاگیردار' معصوم شکل' دل لبھاؤ مگر دلیر اس قدر کہ باہر کے ملکوں کے سیلاب فنڈ تک کے چیک حکومت کے اکاؤنٹ کی بجائے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرا دینے کی مرتکب' کسی نے فون کے لاکھوں کے بل دبائے ہوئے ہیں اور کسی نے گیس اور بجلی کے' کوئی پانی کے بل روکے ہوئے ہے کوئی ٹیکس کا نادہندہ ہے کوئی بنک کے قرضوں کا۔ کسی نے سرکاری گاڑیوں سے پرزے اتار لئے ہیں اور کسی نے ٹائر بدلا دیئے ہیں کوئی لاگ بک غائب کئے بیٹھا ہے کوئی سرکاری رہائش گاہوں میں قیام کا بل دیئے بغیر وہاں سے بھاگا ہوا ہے۔ کچھ جاتے جاتے سرکاری سامان بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ تکیے' بستر کی چادریں' تولئے' چھت کے پنکھے' صابن دانیاں' ایئر کنڈیشنر' قالین' دیواری گھڑیاں غرضیکہ مملکت خداداد کا جو مال بھی ہاتھ لگ سکا وہ ان معزز و محترم چوروں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ چوری چکاری سینہ زوری اور بددیانتی کی یہ کارروائیاں موٹی کھال کے ان جواں مردوں اور جوان عورتوں کے لئے معمول' معمولی اور بے ضرر ہیں بلکہ اس لوٹ کھسوٹ کو استحقاق سمجھا جاتا

ہے' حق نمائندگی' چوری کا صوابدیدی حق۔

یہ لوگ کچھ ایسے ہنرمند اور باحوصلہ ہیں کہ لوٹ مار' ہاتھ دکھاؤ' الزامات' رسوائی اور بدنامی کے سارے مرحلوں سے یوں سرخ رو گزر جاتے ہیں کہ ان کے پنڈے پر ندامت کی ایک بوند تک نہیں ٹھہرتی ہے۔ اگلی حکومت اور آنے والے عہد میں پھر اگلی صفوں میں' نئے جوش' ولولے' عزائم' ایجنڈے اور ٹارگٹ کے ساتھ تازہ بتازہ حلف بردار مگر چوری چکاری میں جہاندیدہ و تجربہ کار۔

کوڑھ کی فطرت پھیلنا اور شرط اس کا ہونا اور بیجنا ہے جب کہ دونوں تقاضے پورے کر دیئے گئے ہیں تو اس فصل بار آور زہرباد سے مفر کیسا اور گریز کیونکر ممکن ہے۔ اور بھلا کس کے اختیار میں ہے کہ اسے روک سکے اس کے پھیلاؤ کے آگے بند باندھ سکے' کہ جو مقتدر ہاتھ روک سکتے تھے انہی ہاتھوں نے تو اسے پھیلایا ہے۔ انہی لوگوں نے تو اس کوڑھ کی آبیاری کی ہے کہ جو اسے پھیلنے سے پروان چڑھنے سے روک سکتے تھے۔

اب ہم ہیں کوڑھ کا زہربار ثمراور سنگلاخ زمین ہے اور منزل صرف دور ہی نہیں بلکہ نامعلوم ہے' محض دور ہوتی تو آچکی ہوتی کہ نصف صدی کی مسافت کچھ اس قدر بے مایہ بھی نہیں ہوتی ہے۔

بھٹکے ہوئے اور راہ گم کردوں کا کبھی نہ کبھی صحیح سمت متعین کر لینا عین قرین قیاس ہوتا ہے مگر منزل گریزوں کا نہیں۔ ہم بھٹکے ہوئے اور راہ گم کردہ سے زیادہ منزل گریز لگتے ہیں۔

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ
وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى
بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ ۝

ترجمہ : تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کر دے اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی اِن سب کو متصل کر دے۔ (سورۃ انفال)

روز افزوں و فزوں تر

1980ء کے شروع عشرے میں مک مکا کا لفظ ہماری لغت میں ایزاد، معاشرے پہ سایہ فگن، زبان پہ رواں، رویوں میں راسخ اور روزمرہ طرز عمل کا بنیادی عنصر بن کے ابھرا۔ ضیاء الحق مرحوم کے نظریہ ضرورت کے ساتھ ساتھ نظریہ مک مکا بھی پہلو بہ پہلو پروان چڑھا اسّی کی شروع دہائی میں معاشرے میں متعارف ہونے والا یہ نیا ضابطہ حیات ہمیں ایسا راس آیا اور اس قدر پسند آیا کہ اب ہم بحیثیت مجموعی قوم اسی کے اسیر' اسی کے گردن زدنی اور اسی پر کاربند و کمربستہ ہیں۔ اب یہی اسم اعظم ہے اسی سم سم سے سارے بند دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

کسی بھی تحقیق و کاوش سے یہ پتہ چلانا امر دشوار ہے کہ مک مکا کا یہ قہر جو ہم پر نازل ہوا یہ کسی خاص واقعے سے شروع ہوا یا اسے کسی فرد واحد نے معاشرے میں پلانٹ کر دیا یہ کسی حادثاتی و واقعاتی عمل کے رد عمل کے طور پر شروع ہوا یا پہلے سے ہی موجود معاشرتی رجحان کو مہمیز دے دی گئی یہ ساری وجوہات عین ممکنات میں سے ہیں لیکن اس ضمن میں ایک مفروضہ اور ایک

حقیقت بڑی واضح اور امتیازی ہے۔

مفروضہ تو یہ ہے کہ چونکہ ضیاء الحق کا شخصی کردار دوغلے پن سے آلودہ اور منافقت ومصالحت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان کے طویل اقتدار سے معاشرے میں یہی قباحت پھیل سکتی تھی جو بالآخر اپنے منطقی نتیجے تک پہنچی اور پھیل کر رہی۔ موجودہ معاشرتی تصویر ہو بہو ضیاء الحق کے کردار کی لاریب تفسیر اور ناقابل تردید حقیقت ہے ہمارے آج پر کل کی ضیاء پاشیوں کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ جبر' اکراہ اور نحس کا نقش گہرا اور چھاپ انمٹ ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ضیاء الحق کو اپنے سوا کسی کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی' کوئی قانونی' آئینی' عقلی اور اخلاقی جواز ان کی اس مہم جوئی اور مذموم حرکت کا نہ پہلے کبھی تھا نہ آج ہے جو ان سے سرزد ہو چکی تھی۔ ضیاء الحق جب تک زندہ رہے حکومت اور ملک پر اپنے ناجائز قبضے اور قوم کو یرغمال بنائے رکھنے کے گلٹ میں مبتلا رہے۔ وہ اس احساس محرومی وکمتری' ندامت وخجالت کے حصار سے باہر نہ آسکے کہ ان کے اقتدار کی اساس غاصبانہ اور نامبارک ہے۔ ان کی اس کمزوری اور حمایت کی شدید ضرورت نے انہیں مک مکا کی راہ پر لگا دیا۔ حمایتی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے زور آوروں کو نوازا۔ درمیانے کو لتاڑا اور کمزور کی چمڑی اتروا دی۔ وہ بددیانتوں اور خائن مصاحبوں کو تحفظ دینے کی روایت کے علمبردار' حواریوں اور خوشامدیوں کی پردہ پوشی اور دست درازوں اور کاسہ لیسوں کی سرپرستی کے حوالے سے ہماری تاریخ میں ایک ایسے حکمران کے طور پر زندہ رہیں گے کہ جن کے وجود سے معاشرے میں ایسی قباحتیں پروان چڑھیں جو مسقوط، مفتوح، مسخر اور نامسعود قوموں کا خاصہ ہوتی ہیں۔

ہمیں خدشہ ہے کہ جس روز ذرے ذرے' قطرے قطرے اور پائی پائی

کا حساب لیا جائے گا تو ضیاء الحق مرحوم پر اسلام سے ٹھٹھہ مخول اور چھیڑ خانی کی تعزیر کے علاوہ بھی ایک اور فرد عائد کر دی جائے گی کہ ان کے شوق اقتدار و وجود نا مسعود سے ایک مسلمان معاشرے میں دوغلے پن کا چلن عام' مصالحت کا رنگ گہرا اور مک مکا کا بول بالا ہوا۔

ہمارے آج کے گھمبیر معاشرتی مسائل کی اساس جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہی رکھی گئی اور اگر یہ پہلے سے موجود تھی تب بھی اسی عہد نامبارک میں یہ خوب پھلی پھولی' جنرل ضیاء الحق بلاشبہ اپنے اقتدار کے آخری سالوں تک اپنا ایک حمایتی طبقہ وجود میں لا چکے تھے مگر انہیں ذاتی طور پر اور ملک و قوم کو مجموعی طور پر اس کی بہت بھاری قیمت دینی پڑی۔

انہیں ایک ایک حمایتی کی مانگ فردا" فردا" مانی پڑی اسی طرح سے ہر ایک مخالف کو خاموش کرانے کے لیے الگ الگ شب خون مارنا پڑا' کہیں نقب لگانی پڑی کہیں شگاف ڈالنا پڑا۔ انہوں نے ایک طرف خون آشام مذہبی طبقوں کو ایک دوسرے کے سامنے صف آراء کیا اور دوسری طرف لسانی اور علاقائی قوتوں کو۔ ایک کو کمزور کرنے اور نیچا دکھانے کے شوق میں انہوں نے دوسرے کو دستار بند کر دیا۔ ایسے گروہ تشکیل دیئے گئے اور ایسی تنظیموں کو فروغ دیا گیا جو آج ہمارے معاشرتی وجود اور ملک کی بقاء کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہیں۔ ہتھوڑا گروپ' مراقبہ گروپ' ناموس رسالت گروپ' مومنین گروپ' حقیقی گروپ' مصنوعی گروپ' اغواء برائے تاوان گروپ' دینی مدرسہ گروپ' عمرہ گروپ' سانپ گروپ' بنک لوٹو گروپ' جنت کا طوطا گروپ اور بہشتی ٹوپی گروپ یہ سب گروپ ہمارے کلچر کا کبھی حصہ نہیں رہے تھے۔

آج کے ان بے خوف' موت آشنا' سنپولیا فطرت اور سانپ صفت گروہوں کو دودھ پلا پلا کر جوان کیا گیا ہے نتیجتاً معاشرے میں موجودہ زہر کا

پھیلنا ناگزیر' جرائم کی موجودہ صورت حال منطقی' بددیانتی کا موجودہ معیار متوقع اور معاشرتی ناانصافی اور ابتری کا بول بالا ہونا ہی ہونا تھا۔

اس میں اچنبھے اور حیرانی کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ جس زمین میں کوڑھ بیجا گیا تھا وہاں کوڑھ نے اگنا ہی اگنا تھا۔ اس فصل کو بار آور ہونے میں دیر نہیں لگتی ہے۔

برائی کا بیج توانا اور پختہ ہوتا ہے اور اگر زمین بھی زرخیز اور ثمر شناس ہو' صدیوں کے جبر اور ناانصافی کی گواہ ہو' آبیار غاصب' نامبارک' بے دھیانے' بدنیت اور بد بخت ہوں' بیجے جانے کی رت خون آشام ہو اور ترائی لہو رنگ پانی سے کی گئی ہو تو جنس کے اثرات' ثمرات میں ایک ایسی بد نصیبی اور سیاہ بختی حلول کر جاتی ہے کہ اس جنس سے نہ کسی کا پیٹ بھرتا ہے نہ نیت سیر ہوتی ہے' آسودگی آتی ہے نہ اطمینان' کئی کئی نسلیں ناآسودہ' ناکارہ اور بے توقیر گزر جاتی ہیں۔ معاشرے میں کوڑھ پھیل جاتا ہے اور پھر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

ہماری موجودہ نسل اسی لاجیکل اور نیچرل پراسس کی زد میں ہے کہ جسے صرف کوڑھ لاحق ہی نہیں ہے بلکہ جو کوڑھ بار، کوڑھ آور، کوڑھ اساس اور کوڑھ کاشت بھی ہے۔

ایسے باافراط کوڑھ کا علاج کم اور شفاء کمیاب ہوتی ہے جذامی جسموں اور سرطان سوچ دماغوں کو بچایا نہیں جاسکتا نہ کبھی بچایا جا سکا ہے نہ کبھی بچایا گیا ہے بلکہ اس کا حل ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کوڑھیوں اور غیر کوڑھیوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا جائے۔ کوڑھ کے پھیلاؤ اور اس سے بچاؤ کی کسی اور صورت سے انسانی تاریخ آشنا نہیں ہے۔ یہی نوشتہ دیوار بھی ہے اور آخر کار ہونا بھی یہی ہے۔ فطرت کے قانون سے مفر نہیں ہے۔

سورۃ انفال میں اس بات کو حتمی اور جامع طریقے سے واضح کر دیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ

تا کہ اللہ تعالیٰ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کر دے اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر دے۔ (سورۃ انفال)

موجودہ انجام آشنا نسل کا اضطراب' افلاس اور بے حسی انجام کے تاخیری آغاز کے باعث ہے' اس نسل کی مثال اس قاتل کی سی ہے کہ جو قتل کرنے کے بعد پکڑا نہیں گیا اور اسے ہر لمحے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ وہ اب پکڑا گیا کہ اب پکڑا گیا۔ ایک مخصوص کیفیت اور مدت تک وہ خود کو بچانے کی چھپانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے مگر مکافات عمل اور جرم کا گلٹ بتدریج غالب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر یہی قاتل چاہتا ہے کہ اسے پکڑ لیا جائے۔ کاش اس سے قتل کا' اس کے جرائم کا مواخذہ کیا جائے' وقت گزرتا جاتا ہے اور اقبال جرم کی طلب بڑھتی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ خود بخود یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ فلاں فلاں قتل اور وہ وہ جرم میں نے ہی کیا تھا سننے والے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اب یہ چیخ چیخ کر اقبال جرم کرتا ہے ہر کسی سے کہتا ہے کہ میں ہی وہ قاتل ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے مجھے پکڑ لو مجھ پر فرد جرم عائد کرو۔

سو ہماری نسل اقبال جرم اور سزا یابی کے اس آخری مرحلے میں ہے کہ جنہیں پکڑے نہ جانے' احتساب اور مواخذہ نہ ہونے نے بے قرار کر رکھا ہے ہم لوگ ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ جہاں سزا کی تاخیر اور ہنوز تاخیر

نے ہمیں منجمد' بے حس اور بے عمل بنا رکھا ہے۔

اس بے عملی' بے حسی اور بددلی کی کیفیت سے کوفہ کا وہ دور یاد آجاتا ہے جب حجاج بن یوسف نے کوفہ کی جامع مسجد میں نمازیوں سے کہا تھا کہ اسے کٹنے کے لئے تیار سروں کی فصل نظر آرہی ہے۔ فصل تو ادھر بھی تیار ہے مگر ہمارے حجاج بن یوسف نے تا حال اپنی سیاہ نقاب نہیں الٹائی ہے۔

رد عمل جتنا تاخیر سے ہو اسی قدر شدید ہوتا ہے اور انقلاب جس قدر دیر سے آتا ہے اسی قدر شدید ترین ہوتا ہے۔ مصنوعی' کاغذی اور مفاداتی انقلاب ہم گزر آئے ہیں۔ اصلاحاتی حیلے بہانے' وعدے وعید حکومت سازی اور چلترباز ی کے دور بھی گزر چکے۔

عوامی طبقے کے سوا ہر طبقہ ریاست پر مقتدر رہ چکا ہے۔ جاگیر دار' صنعتکار' بیورو کریٹ' فوجی اور سرکاری اہلکار' طرح طرح کے حاکم بھگتائے جا چکے ہیں ہر طرح کے بہروپیئے اور بونے اپنے سوانگ بھر چکے ہیں اور اللہ کے نظام کے سوا سارے نظام آزمائے جا چکے ہیں' پارلیمانی' صدارتی' جمہوری' اشترا کی حتیٰ کہ ایک ہلکا پھلکا امیرالمومنین تک ہم بھگتائے بیٹھے ہیں لیکن ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے ان میں سے کوئی بھی اور کچھ بھی ہمارے لئے اکسیر ثابت نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔

مملکت خداداد جس وعدے اور یقین دھانی پر حاصل کی گئی تھی جب تک اس عہد کو پورا نہیں کیا جائے گا ہم لوگ راندہ درگاہ و درماندہ ہی رہیں گے۔ خصوصاً موجودہ صورت حال اللہ کی زمین میں اللہ کی حاکمیت اور عوام کی عملداری کی متقاضی ہے اور اس ہونی کو اب مزید ٹالا نہیں جا سکتا یہ اب ہو کر ہی رہے گی کہ بچاؤ کی اب اور کوئی صورت ہے بھی نہیں

کوڑھیوں اور غیر کوڑھیوں کے بیچ اگر اب بھی خط امتیاز نہ کھینچا گیا تو

فطرت کا اپنا قانون اپنا خط تنسیخ کھینچ دے گا۔

جب کہ سورۃ مومنون میں کہہ دیا گیا ہے کہ بالآخر وہی حاکم و وارث ہونے والے ہیں جو امین' دیانتدار اور عہدوں سے فائدے نہ اٹھانے والے ہوں گے تو اس لکھی کو کب تک ٹالا جا سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے

وَالَّذِيْنَ هُم لِاَمٰنٰتِهِم وَعَدِهِم رَاعُونَ○ وَالَّذِيْنَ هُم عَلٰى صَلٰوٰتِهِمْ يُحافِظُونَ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الوَارِثُوْنَ○

اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں پس ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں۔ (سورۃ المومنون)

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ٥ فَمَالَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ٥ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ٥

ترجمہ : اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے جو کہ بانی ضلالت تھے گمراہ کیا سو اب نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے کہ چھڑا لے اور نہ کوئی مخلص دوست کہ خالی دلسوزی ہی کرے۔

(قرآن حکیم)

اصل میں سارے ایک ہیں

ہمارا سب سے بڑا المیہ جس نے ہمیں موجودہ صورت حال تک پہنچا دیا ہے وہ ہماری نااہل قیادت ہے ایک سے بڑھ کر ایک خائن' بددیانت اور مال بٹورو حکمرانوں نے پاکستان جیسی مضبوط نظریاتی ریاست کا دیوالیہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ آج پاکستان کے تاحال قائم رہنے میں ہمارے حکمرانوں کی کوشش کم اور علاقے کی سیاسی صورت حال اور بین الاقوامی مفادات کا تقاضا زیادہ ہے۔ جیسے عراق کے صدر صدام حسین کا تاحال بھی اقتدار میں ہونا صدر صدام حسین کا کمال کم اور ان کے مقتدر رکھنے کی مجبوری زیادہ ہے۔

یہ طے ہے کہ ہمارا حکمران خواہ جو بھی ہو' منتخبہ ہو یا جبری' پیدل ہو یا فوجی' نظریاتی ہو یا سیاسی' ہماری سیاہ بختی یہ ہے کہ اقتدار ملتے ہی حکمرانوں کی کایا پلٹ جاتی ہے' نیت اور نظریہ تبدیل ہو جاتا ہے جس منشور کے دعویٰ اور وعدے کو اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے' ایوان اقتدار میں داخل ہوتے ہی ماتم پر بچھنے والی صف کی طرح اسے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے' بھلا دیا جاتا ہے۔

تحقیق یہ کرنی چاہئے کہ آخر اقتدار کے ایوانوں اور حکومتی قیام گاہوں میں آخر وہ کون سا ایسا آسیب ہے کہ جو راتوں رات مکینوں کی نیت' نظریہ' سوچ اور اعمال کو بدل دیتا ہے' وہ ایسا کون سا عفریت وہاں پوشیدہ ہے جو اچھے بھلے پر عزم' مخلص گمان' اخلاص بھرے اور شائستہ شبہ فرد کو راتوں رات بے حس' طمع کار' بے عمل اور ریاکار بنا دیتا ہے۔

یوں تو کم وبیش ہمارے سبھی حکمرانوں پر رسوائی' لوٹ مار اور اقرباء پروری کا لیبل چسپاں ہے لیکن ان میں سے کچھ دوسرں پر کئی طرح سے فوقیت رکھتے ہیں یہ وہ حکمران ہیں کہ جو اپنے کہے اور کیے گئے وعدوں کو ایفاء کر سکتے تھے' انہیں پورا پورا موقع ملا' وقت دیا گیا لیکن دم رخصت ان کے دامن میں بھی اسی ناکامی' لوٹ مار اور اقرباء پروری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا جو ہمارے ہر حکمران کا خاصہ اور ہماری تقدیر ہے۔

جنرل محمد ایوب خان' ذوالفقار علی بھٹو' جنرل محمد ضیاء الحق اور میاں محمد نواز شریف ہماری قومی تاریخ کے ایسے حکمران ہیں اور ایسے وقت میں قیادت کے منصب پر فائز ہوئے کہ یہ لوگ اس ملک کی کایا اور عوام کی تقدیر پلٹ سکتے تھے۔ ان میں سے دو بھرپور عوامی تائید وحمایت سے اس منصب پر سرفراز ہوئے جب کہ دوسرے دو'غاصبانہ قبضہ کرو' کے اندھیرے سے ابھرے لیکن خاتمہ کم وبیش ایک جیسا' اثر' آثار میں یکساں' ثمر' ثمرات میں نہلے پہ دہلہ' اٹھان اونچی' دعویٰ بلند و بانگ' آغاز خوش کن' رخصتی رسوائی اور انجام رسوا کن' اپنی ذاتی زندگی میں کامیاب اور اپنی ذات کے لئے امرت دھارا جیسی تاثیر رکھنے والے یہ افراد جونہی قوم کے سیاہ وسفید کے مالک بنے تو ان کے فیض سے سفیدی غائب ہو گئی اور فقط سیاہی رہ گئی جسے انہوں نے قوم کے منہ پہ مل دیا جو باقی بچی وہ خود پہ لگالی اور قوم کو زیادہ اندھیرے اور مزید کوڑھ میں

مبتلا کر کے رخصت ہو گئے۔

جنرل محمد ایوب خان سیاسی اور معاشرتی بگاڑ کی اصلاح' سیاستدانوں کو نکیل ڈالنے' ملک بچانے اور بنیادی جمہوریت کا چاند چڑھانے کے اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں اترے' واہ واہ ہو گئی' انہیں ہار پہنائے گئے' فیلڈ مارشل مانا گیا' قائد کی اکلوتی نشانی اور ان کی ہمشیرہ کے مقابلے میں ایوب خان کو منتخب کیا گیا (یہ الگ بات کہ کیسے منتخب کیا گیا) انہیں دس سال دیئے گئے مگر جب وہ رخصت ہوئے تو مملکت خدا داد شکستہ' عوام افسردہ' قومی سلامتی داؤ پر' سرحدیں دونیمگی کی زد میں' سیاست دان بے مہار' بلا نکیل اور اپنے ہی گھر میں نقب لگانے کے لئے برسرپیکار تھے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنرل محمد ایوب خان اس مشن میں کیوں نہ کامیاب ہو سکے جس کے پیش نظر وہ مملکت کے سربراہ بنے تھے۔؟

صدر ایوب خان اپنا ابتدائی امیج' کارکردگی اور اخلاص کیوں نہ قائم رکھ سکے وہ آخر کیوں اس قدر بے آبرو ہوئے حالانکہ وہ سنجیدہ' محب الوطن' اخلاص پیشہ اور صالح فطرت نظر آتے تھے۔ آخر ان کی اس قدر بڑی ناکامی کی وجہ؟

انہوں نے جس دن اقتدار سنبھالا تھا پاکستان زیادہ مضبوط اور خوش حال ملک تھا نسبتاً اس دن کے کہ جب وہ گئے۔ ان کے جانے پر نہ کوئی محدود جمہوریت تھی نہ بنیادی' نہ عوام خوش حال تھے نہ ریاست جن سیاستدانوں کی گردن زدنی پر وہ مامور ہوئے تھے اب ان کی اپنی گردن انہی کے پنجے میں تھی۔ وہ جس بحران کا توڑ کرنے کے لئے آئے تھے اس سے بڑا بحران چھوڑ کر چلے گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو عوامی حاکمیت' اسلامی سوشلزم' سرعام جمہوریت

مساوات اور معاشرتی و معاشی سدھار کے بلاخیز ریلے پر نمودار ہوئے' جان کی بازی لگائی بھی' جیتی بھی' اور ہاری بھی' انہوں نے عوام کو ہنسایا اور قوم کو رلایا لیکن مسائل وہ کسی کے بھی حل نہ کر سکے' وہ جلدی میں تھے وقت واقعی ان کے پاس کم تھا۔ مملکت خداداد کی نظریاتی اساس اور معاشرتی بنیادیں ہلانے کے لئے جتنا وقت درکار ہوتا ہے بھٹو صاحب کو یہ کام بہت کم وقت میں کرنا پڑا۔ انہوں نے راتوں رات ایسی جمہوری افراتفری برپا کر دی کہ جب وہ جانے لگے تو افراتفری تو وافر تھی مگر جمہوریت اپنے ہی گھر میں شگاف ڈالنے والوں کے پاؤں تلے روندی گئی۔ دور دور تک نہ کوئی مساوات تھی نہ عوامی حاکمیت' نہ کوئی معاشی تبدیلی تھی' نہ انقلابی۔

صدر ایوب خان کی ناکامیوں سے ذوالفقار علی بھٹو کی ناکامیاں بھی مختلف نہیں تھیں ایک بار یہ پھر پوچھا جانا چاہئے کہ بھٹو صاحب کیوں ناکام ہوئے۔

فخر ایشیاء' قائد عوام' عوامی حقوق کا چیمپئن' آوے ہی آوے' بھٹو ساڈا شیر اے' لگتا تھا کہ آتے ہی شیر کی گردن مک مکا اور مصالحت کے آہنی پنجے میں اور پاؤں کوڑھ دلدل میں پھنس گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ناکامی ایوب خان کی ناکامی سے زیادہ بڑی' زیادہ پر مصائب اور زیادہ ہولناک تھی۔

ان کے دعوی جس قدر بلند بانگ تھے انہیں قیمت بھی اسی قدر چکانی پڑی۔

ضیاالحق کسی جلدی میں نہیں تھے وہ اپنے واقعاتی اور فرضی دھیمے مزاج کی دھیرج میں چمکے' انہوں نے اپنے پروفائل کو سادہ اور مختصر اور دھیان کو طویل المدت اقتدار پر لگائے رکھا وہ انتخابات' احتساب اور اسلام کا ایجنڈا لے کر وارد ہوئے لیکن اپنے پیش رووں کی طرح ناکام رہے' ضیاء الحق کی ناکامی جنرل محمد ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں سے بڑی تھی۔ انہوں نے

نظریاتی افراط پیدا کر دی اور مسلک و عقیدے میں تفریط و تفرقہ۔

ضیاء الحق کے زیر اہتمام قومی یک جہتی رخصت ہوئی اور ملی وحدت پارہ پارہ۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے قوم کی اصل بنیاد' نظریے اور عقیدے کی جڑ مار دی' وہ اسلام نافذ کرنے کے وہم میں مبتلا رہے اور اسی گمان میں رخصت ہو گئے۔

میاں محمد نواز شریف کو اللہ خوش رکھے ان کی عمر اور رسی دراز ہو وہ بھاری مینڈیٹ کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور پاکستان کے مقدمے کو پنجاب کے مقدمے تک محدود کر دیا' مزاحمتی اور دفاعی اقتدار کا جس قدر تجربہ اور حوصلہ میاں صاحب کو ہے ان کے پیش رو اس کا عشر عشیر دباؤ بھی برداشت نہ کر سکے۔ بحرانی کیفیت پیدا کرنے اور پھر اس سے نکلنے کا جو وصف میاں نواز شریف میں ہے صرف اس وصف کے سہارے بھی وہ آنے والے کئی عشروں کے لئے ہمارے حکمران رہ سکتے ہیں۔ میاں صاحب کے فیصلوں کی اساس کسی اصول اور نظریے پر نہیں بلکہ اقتدار' سودے بازی' قوت خرید' مک مکا اور خالص تجارتی بنیادوں پر استوار ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی' ایم کیو ایم' احتساب بیورو' خارجہ پالیسی' اسامہ بن لادن' مہران بنک' کالا باغ ڈیم' سپریم کورٹ' شریعت بل' ارکان اسمبلی کی زبان بندی' مسئلہ کشمیر' خود انحصاری اور کشکول توڑو اور پھر جوڑو جیسے موضوعات اس حقیقت کے ناقابل تردید حقائق ہیں کہ میاں نواز شریف کے فیصلے انصاف' اصول اور ملکی وقومی مفادات سے زیادہ طویل المدت اقتدار اور مک مکا سے وابستہ ہیں۔

میاں صاحب کے پاس جس قدر بھاری مینڈیٹ ہے وہ اسی قدر کمزور اور دباؤ میں آجانے والے حکمران ہیں جو کل تک ان کے حلیف تھے آج ہمارا نظریاتی اثاثہ اور پیغمبر مثال بابائے قوم کی حرمت انہی دشنام طرازوں کی نجس'

نحس اور لمبی زبانوں کی زد میں ہے۔

اپنے کندھوں پہ اپنی زبانوں کا بوجھ اٹھائے' غیروں کے لہجے میں گفتگو کرنے والا یہ گروہ کبھی میاں صاحب کی آنکھ کا تارا' دستار بدل بھائی اور ان کا حلیف خاص رہ چکا ہے۔ ایم کیو ایم کو وطن دشمن قرار دو یا وطن دوست یہ نہیں ہونا چاہئے کہ تحریک عدم اعتماد اور ایوان کے اندر سے تبدیلی کی بھگدڑ میں ایم کیو ایم کو ہار پہنا دیئے جائیں اور فوراً بعد ان کے ٹارچر سیل بھی مشتہر کر دیئے جائیں۔ ولی خان گروپ پاکستان دشمن نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوتا تو میاں صاحب انہیں لمبے عرصے تک اپنے ساتھ کیوں اور کیسے رکھ سکتے تھے۔

ہمیں یقین ہے کہ میاں نواز شریف محض اقتدار میں رہنے کی خاطر پاکستان دشمن عناصر کو گلے نہیں لگا سکتے لیکن افسوس یہ ہے کہ میاں صاحب ایسا کر چکے ہیں ایسے اعمال کا اجر تعاقب میں لگا رہتا ہے دراز رسی مزید دراز ہوتی جاتی ہے مگر لامحدود نہیں۔ کنوئیں سے پانی نکالنے والی مضبوط اور لمبی رسی جب پوری کھل جاتی ہے تو جھٹکے اور دھماکے کے ساتھ چرخی پہ جھولتی رہ جاتی ہے۔ سقوط مسلم ہسپانیہ کے بعد بچے کھچے مسلمانوں پہ جو ابتلا کا دور آیا تو اس میں خشک کنوؤں میں لمبی لمبی رسیوں کے سروں پر پانی کے ڈول کی بجائے گردنیں باندھنے کا رواج پڑ گیا تھا۔ دیگر الزامات کے علاوہ اس جان بہ لب گروہ پر یہ الزام بھی عائد تھا کہ یہ دوست نما دشمنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اندر خانہ ان کی حمایت سے اپنی حکومتوں کو قائم رکھنے میں لگے رہتے تھے۔

رسی کے سرے پر ڈول کی بجائے گردن بندھی ہو تو نہ صرف جھٹکا زیادہ لگتا ہے بلکہ دھماکہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے چار چھپیرے آگے پیچھے سب عبرت پکڑتے ہیں اور یہ عبرت آموز ایکسر سائزز ہوتی ہی رہتی ہیں۔

اس سارے اخلاص کے باوجود جو میاں نواز شریف پاکستان سے ظاہر کرتے رہتے ہیں اور وہ ساری کامیابیاں جنہیں وہ اپنے اقتدار اور قائدانہ صلاحیتوں سے منسوب کرتے ہیں اور وہ بھاری مینڈیٹ جس کا بہت چرچا ہے ان ساری باتوں میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسا رخنہ پڑا ہوا ہے کوئی جھول اور کچھ ایسا جھوٹ چھپا ہوا ہے کہ اگر میاں صاحب کی باتوں کو سچ مان لیا جائے تو موجورہ مالی بے ضابطگی ' معاشی ابتری اور ریاستی وسائل کی لوٹ مار کو اخلاص' قیادت کی عظیم صلاحیت اور بھاری مینڈیٹ کا ثمر ماننا پڑے گا جو کم از کم صحیح الدماغی کی کیفیت میں تو ممکن نہیں ہے۔

میاں صاحب کی معصومیت مصنوعی لگتی ہے اور اس کے پیچھے ایک نہیں بلکہ کئی فریب' دھاندلیاں گھپلے اور دھوکے معلوم ہوتے ہیں میاں نواز شریف نے ریاستی وسائل اور مملکت پاکستان کو یا تو سراسر ملک مال غنیم سمجھا ہے یا ذاتی جاگیر۔ کسی بھی جمہوریت میں وزیراعظم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کے وسائل ذاتی تصرف میں آجائیں۔

تقسیم سے قبل جس طرح ہندوستانی راجے' مہاراجے اپنی اپنی ریاستوں کے مختار کل ہوتے تھے اور کوئی پوچھ پڑتال' کوئی جوابدہی کوئی مالی نظم و ضبط و ضابطہ نہیں ہوتا تھا' جو منہ میں آگیا وہی ہوگیا' جو کہہ دیا وہی قانون بن گیا' جس کے لطیفے پر ہنسی آگئی اسی کو خلعت پہنادی' جس نے قصیدہ کہہ دیا اسی کی موجیں لگ گئیں جس نے ٹھمکا لگا دیا اسی کو چاندی میں تول دیا جس نے گلی گرہ کھول دی اسی کو دو چار گاؤں عنایت کر دیئے جس نے کہا کہ خدا کا خوف کرو اس کی چمڑی اتروادی اور جس نے یاد دلا دیا کہ مرنا بھی ہے اسی کو ریاست نکالا دے دیا اور جس نے مقوی باہ اور اکسیر کشتے پر لگا دیا وہی کوتوال لگ گیا۔

مملکت پاکستان سے میاں نواز شریف کا برتاؤ ہندوستانی راجوں مہاراجوں سے کم نہیں ہے۔

اس بات پر شدید حیرانی ہوتی ہے کہ آخر میاں صاحب کے نورتن انہیں کس کس طرح رام کرتے ہیں۔ جانے یہ نورتن آغوش وا ہیں یا میاں صاحب خود سپرد' بھید جو بھی ہو مگر میاں صاحب مائل بہ کرم ہی رہتے ہیں۔ اپنے اقتدار کی ابتدا ہی میں میاں نواز شریف نے 6 ارب روپے مالیت کے چار ہزار پلاٹ اپنے عزیزوں' حواریوں اور لگتوں میں بانٹ دیئے۔ مال غنیمت' رسہ کشی' یہ بھی لے لے' وہ بھی لے لے' کی دوسری پوشیدہ اقسام کی تو بات ہی نہ کیجئے

جنرل ضیاء الحق مرحوم بھی بہشتی باغوں سے اور اپنے بلند درجات سے یہ دیکھتے ہوں گے تو ان کی باچھیں کھل کھل جاتی ہوں گی کہ وہ اپنی جانشینی" وراثت کا بار اور اپنی عمر عزیز کا بقایا جس لے پالکے کے نام لگا آئے تھے وہ پاکستان کے حق میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہی ثابت ہوا۔ جنرل صاحب میاں نواز شریف کی جس ادا پر اس حد تک فریفتہ ہوئے کہ اپنی عمر تک انہیں لگا گئے وہ یہ تھی کہ جب بددیانت اور بدنیتوں کا ٹولہ منتخب ہو کر اسمبلیوں میں آبیٹھا تو جنرل صاحب کی غیر جماعتی کو بے ضابطگی میں بدلتے دیر نہ لگی۔ جب اس مسئلے نے سر اٹھایا کہ ان خائین نمائندوں پر قابو کیسے پایا جائے اور یہ کیونکر مغلوب و مطیع رہیں گے تو میاں صاحب نے یہ مسئلہ پلک جھپکتے میں حل کر دیا کہ حلقہ وار ترقیاتی کاموں کے نام پر سرکاری خزانوں کے منہ کھول دیئے جائیں اور رقم نمائندوں کے حوالے کر دی جائے تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنی "صوابدید" اور ضرورت کے مطابق یہ ترقیاتی فنڈز خرچ کر سکیں۔ جنرل صاحب میاں صاحب کا نہ صرف مطلب فوراً سمجھ گئے بلکہ ہمیشہ

کے لئے ان کی بد دیانت ذہنی صلاحیتوں کے معترف بھی ہو گئے۔ اس بدعت کی بسم اللہ پر سب چپ رہے کیا فکری رہنما' کیا محتسب اور کیا حزب اختلاف سب اپنے اپنے حصے اور فیصد کے حساب میں مصروف رہے۔

آج اگر جنرل ضیاء الحق حیات ہوتے تو میاں صاحب کی اس کارگزاری پر نہ جانے کہ انہیں مزید کیا پیش کرتے کہ ان کے بعد بھی بددیانتوں کو نکیل ڈالے رکھنے کا ایک اور بھی تیر بہ ہدف حیلہ میاں صاحب ایجاد کر چکے ہیں کہ سرکاری خزانے سے قرضہ دو اور خود بھی لو اور قرضہ بھی اس قدر بھاری کہ واپس نہ ہو سکے نہ واپس کرنے کو دل چاہے اور پھر اس قرضے کو معاف کر دو مگر معاف اس وقت کرو جب عدم اعتماد کا تیر ترازو ہونے لگے۔ اپنے اقتدار کے ابتدائی سالوں میں ہی میاں صاحب نے 6 ارب روپے کے پلاٹس بانٹنے کے ساتھ ساتھ 29 ارب روپے کے قرضے بھی بانٹے اور ان کے عہد اقتدار میں جس قدر قرضے معاف ہوئے اس معمولی سی کتاب کی ضخامت اس تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔

میاں نواز شریف کے زیر اہتمام جاری کردہ قرضوں کی ایک جھلک

محمد نواز شریف اور ان کا خاندان	1200 کروڑ روپے
گجرات کا چوہدری خاندان (شجاعت علی' پرویز الٰہی)	3 ارب اور 50 کروڑ
ڈاکٹر بشارت الٰہی	170 کروڑ
سیف اللہ خاندان	2 ارب
چوہدری نذیر فیصل آباد سے رکن اسمبلی	ایک ارب
غلام فاروق سینیٹر	120 کروڑ
غلام مصطفیٰ جتوئی	50 کروڑ
میر نبی بخش زہری سینیٹر	10 کروڑ

نصراللہ دریشک	45 کروڑ
مخدوم احمد محمود رکن قومی اسمبلی (جمال دین شوگر مل)	50 کروڑ
سید مردان شاہ پیر پگاڑا (کنگڑی کاٹن اور راجہ شوگر ملز)	60 کروڑ
سید عباس شاہ سینیٹر (بنوں شوگر ملز اور آئس فیکٹری)	40 کروڑ
اسلام الدین شیخ سینیٹر (کرن شوگر ملز)	70 کروڑ
اشرف تابانی سابق گورنر سندھ	70 کروڑ
مرحوم محسن صدیقی سینیٹر (پاک لینڈ سیمنٹ)	60 کروڑ
سلطان لاکھانی سینیٹر (سینچری پیپر بورڈ' میرٹ پیکجنگ نیشنل ڈیٹرجنٹ' لیکسن تمباکو' سبز لمیٹڈ)	90 کروڑ
ذوالفقار جاموٹ سید آئس فیکٹری' ٹمیاری شوگر ملز' نجیب اینڈ کمپنی	3 کروڑ
ہمایوں اختر عبدالرحمان ایم این اے (تاندلیانوالہ شوگر ملز گریس ٹیکسٹائل' پیپسی کولا)	80 کروڑ
میر افضل خان وزیر اعلی سرحد (چشمہ شوگر ملز)	50 کروڑ
جام معشوق علی وفاقی وزیر جام صادق کے صاحب زادے (تھر شوگر ملز)	50 کروڑ
منظور احمد وٹو سپیکر پنجاب اسمبلی (ستلج شوگر ملز)	65 کروڑ
محمد خان جونیجو ایم این اے سابق وزیر اعظم (سانگھڑ شوگر ملز)	12 کروڑ
اسی طرح اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت سے وابستہ یا حلیفوں کے مجموعی طور پر قرضے	29 ارب روپے

1981ء میں نواز شریف کے قرضوں کی مالیت= 4 کروڑ

1991ء میں نواز شریف کے قرضوں کی مالیت= 1200 کروڑ

(یہ رقم پنجاب کے سالانہ بجٹ سے ڈیڑھ گنا ہے)
(ملک لوٹنے والے چہرے: افضال مظہر راٹھور، صفحہ نمبر 224 تا 225)

یہ سوچ کر الجھاوا ہوتا ہے کہ آخر میاں نواز شریف اپنے فرار کی ہر راہ مسدود کیوں کرتے جاتے ہیں۔ میاں صاحب کی مہربانی سے بڑے بڑے قرضے لینے والا یہ گروہ میاں نواز شریف کو بچانے کی بجائے پھنسانے کا باعث بن جائے گا یہ طبقہ تو ہر کسی کی راہ کا پتھر ہے، ازلی اور آزمودہ کار، کل کلاں اگر کوئی ایسی حکومت آگئی، کوئی ایسا ضابطہ نافذ ہو گیا کوئی کایا پلٹ، کوئی مارچ پاسٹ ہو گیا تو میاں صاحب کس کس بات کا جواب دیں گے کس کس کا اور کون کون سا قرض چکائیں گے کس کس سے جان چھڑائیں گے اور کہاں تک بچیں گے۔؟

صدر غلام اسحاق خان نے بدعنوانی اور نااہلی کے مختلف الزامات کے تحت میاں صاحب کی حکومت کی معزولی کے جواز میں جو مخولیا اور نورا ریفرنسز دائر کئے تھے ان سے بریت میاں صاحب کی نیک نیتی اور بے گناہی کا سرٹیفکیٹ ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے میاں صاحب کو عدالتی پاکیزگی کا غسل دینے ہی کی ایک صورت تھی چونکہ یہ ریفرنسز بذات خود کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں تھے اور انہیں دائر کرتے وقت اپنے اہل خانہ کا تحفظ بھی غلام اسحق خان کے پیش نظر تھا۔ ان کے اکثر قرابت دار نادہندگی، بدعنوانی، قرضوں کی معافی، خرد برد اور آبرو ریزی کے سنگین الزامات سے دو چار تھے۔ چوروں کا چوروں کو تحفظ دینے کے نظریے اور ضرورت کے تحت غلام اسحاق خان نے میاں صاحب پر ہاتھ ہولا اور دباؤ اوپرا، اوپرا ہی رکھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بدعنوانی کی گردن کاٹنے کے لئے اگر انہوں نے کھنڈی چھری کی بجائے تیز چھری کا استعمال کیا تو جوابی وار میں ان کے اہل خانہ کے اکثر حلقوم اور بیشتر سریع

العاضم ابدان بھی اسی تیز چھری کے نیچے آسکتے ہیں۔

حکومت پاکستان کے کروڑوں اجاڑنے' مہینوں کی محنت شاقہ جوڑ توڑ' زاہد سرفراز' عرق ریزی' چھان پھٹک اور قانونی دانشوری کے زور پر جو دفتر کالے کئے گئے اور رجسٹر بھر بھر کر جو ریفرنس دائر کئے گئے ان سب کی بجائے میاں صاحب کے خلاف صرف ایک صفحے اور ایک الزام کا ریفرنس ہی کافی تھا۔ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے مال سرق کی مالیت کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔

میاں نواز شریف کے ذاتی خاندانی اثاثے 68 کروڑ روپے کے اور ادا کردہ ٹیکس ستائیس سو روپیہ صرف اور ان 68 کروڑ کے اثاثوں کی ضمانتی مالیت پر بارہ سو کروڑ کا قرض۔ اثاثوں پر ٹیکس کی شرح ایک چوتھائی فیصد سے بھی کہیں کم اور اثاثوں پر قرضے کا تناسب 17 گنا سے بھی بہت زیادہ۔ ریفرنس دائر کرنے ولے کی نیت صاف' قانون میں سکت' منصفوں کی معلومات اور بینائی درست اور انصاف کا بول بالا ہوتا تو میاں نواز شریف کے خلاف یہ ایک ریفرنس ہی سکڈ میزائل کا کام دے سکتا تھا لیکن حمام میں سب ننگوں کی بے شرمی کی وجہ صرف ان کا اپنا ننگ پنا ہی نہیں ہو تا ہے بلکہ ایک دوسرے کو ننگا دیکھتے رہنے سے بھی شرم جاتی رہتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ 68 کروڑ کے اثاثوں پر ٹیکس کی شرح اور قرضوں کے تناسب کا بال کی کھال اتار دینے والے جہاندیدہ قانون دانوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

میاں نواز شریف کے خاندانی کاروباری نمائندے اور کرتا دھرتا جناب ہارون پاشا نے اصل سے بہت کم اور حقائق کے عشر عشیر شریف خاندان کے اثاثوں کی جو تفصیل پریس کو جاری کی اس کے مطابق بھی میاں صاحب کے خاندان میں اثاثوں کی انفرادی ملکیت کی تقسیم درج ذیل ہے۔

۱۔ میاں محمد شریف ۱۹ کروڑ ۸ لاکھ ۲۲ ہزار ۶۲ روپے

۲۔ بیگم شمیم اختر (زوجہ میاں شریف)	۱۹ کروڑ ۸ لاکھ ۸۶۴ روپے
۳۔ میاں محمد نواز شریف	۱ کروڑ ۹۲ لاکھ ۲۴ ہزار ۱۰۲ روپے
۴۔ بیگم کلثوم نواز شریف	۱ کروڑ ۴۸ لاکھ ۲ ہزار ۴۲ روپے
۵۔ حسین نواز	۲ کروڑ ۳۳ لاکھ ۷ ہزار ۶۰۰ روپے
۶۔ حسن نواز	۵۸ لاکھ ۱۷ ہزار ۶۴۸ روپے
۷۔ شہباز شریف	۲ کروڑ ۴۴ لاکھ ۳۷ ہزار ۴۲۱ روپے
۸۔ بیگم نصرت شہباز	۱ کروڑ ۳۱ لاکھ ۱۲۰ ہزار ۴ روپے
۹۔ حمزہ شہباز	۲ کروڑ ۳۱ لاکھ ۳۶ ہزار ۴ روپے
۱۰۔ عباس شریف	۸ کروڑ ۸۶ لاکھ ۸۱ ہزار ۱۹۶ روپے
۱۱۔ بیگم صبیحہ عباس	۴ کروڑ ۴۸ لاکھ ۳۹ ہزار ۹۷ روپے
کل میزان	۶۷ کروڑ ۶۸ لاکھ ۱۶ ہزار ۵۶۶ روپے

جیسا کہ میاں نواز شریف کئی بار یہ حلف اٹھا چکے ہیں اور حلفاً اقرار اور وعدہ کر چکے ہیں کہ "میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی و وفادار رہوں گا۔ میں اپنے فرائض منصبی' ایمانداری' اپنی انتہائی صلاحیت' اور وفاداری کے ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین اور قانون اور اسمبلی کے قواعد کے مطابق اور ہمیشہ پاکستان کی خود مختاری' سالمیت' استحکام' بہبودی اور خوشحالی کی خاطر انجام دوں گا۔" اس حلف کی نوعیت اور تاثر ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ اسے توڑنے کے خیال سے ہی رونگٹے کھڑے اور قبر کی تاریکی آنکھوں میں اتر آتی ہے' عین ممکن ہے کہ اس قدر بھاری حلفیہ عہد نامے کے حوالے سے میاں صاحب نے کوئی چوری چکاری کوئی دھوکہ اور دھاندلی نہ ہی کی ہو اور ٹیکس کی شرح ہی اس قدر کم ہو اور قرضوں کے اجراء کے لئے بنکوں کا مطالبہ ضمانت اثاثہ جات کی سطح ایسی ہی گئی گزری ہو' لیکن اگر ایسا ہی ہے تو ٹیکس

شرح نے عوام کو کیوں ادھ موا کر رکھا ہے اور انہیں بارہ سو کروڑ کی بجائے بارہ سو روپیہ صرف بھی قرضہ نہیں ملتا ہے۔ آخر کیوں؟

میاں نواز شریف کی مال بناؤ فطری صلاحیتوں کے سامنے بند نہیں باندھا جا سکتا ہے لیکن انہیں یہ یاد ضرور دلایا جا سکتا ہے کہ اس دھرتی' ماحول اور معاشرت کی مخصوص سائیکی کو ضرور مد نظر رکھیں اور اسے سمجھنے کی بھی کوشش کریں۔ سادہ لوح ووٹر ایک حد تک ہی بیوقوف بنائے جا سکتے ہیں اور ہماری زمین میں بنائے جانے والے پلاٹ بھی محدود ہیں اب تو محض قبر پلاٹ ہی رہ گئے ہیں اور اس سے سوا خریدنے' بیچنے اور لوٹنے کو رہا ہی کیا ہے۔

اس زمین کے شرف کو جس نے بھی بیچا' اس مٹی کی حرمت جس نے بھی مٹی میں ملائی اور لوگوں کے اعتماد کو جس نے بھی توڑا اسے اس کی بہت بڑی قیمت دینی پڑی یہ عمل کسی کو راس نہ آیا میاں صاحب کو ذوالفقار علی بھٹو' شیخ مجیب الرحمن اور جنرل ضیاالحق کے انجام سے سبق سیکھنا چاہئے۔ ہماری زمین سے بد عہدی پر یہی قیمت مقرر ہے اور یہاں یہ ہی مشیت ایزدی ہے۔ اس زمین کی پر اسرار سائیکی کا تقاضا اور خراج یہی ہے۔ بے موت مارے گئے حکمرانوں کی کوتاہیوں کو اپنی کامیابی کا زینہ بنانے اور اس پر بھنگڑا ڈالنے کی بجائے اس سے عبرت لینا کہیں زیادہ مستحسن ہے۔

ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ساتھ میاں صاحب کا جھاکا اترتا جاتا ہے اور ان کے دامن پر پہلے سے زیادہ گہرے داغ پڑتے جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابل مواخذہ رکھنا اور احتساب کی حد میں سمیٹے رکھنے تک ہی یہاں جان کو امان ہے۔ جو بھی حد احتساب سے گزرا اور مواخذے سے بالاتر ہوا تو اس کے لئے فطرت کا اپنا قانون ہے' بے لاگ' کڑا' شفاف' قطعی اور حتمی۔

جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے پشاور والے مکان میں جہاں اپنی گانے والیاں

اور پرائی ناچنے والیاں مدہوش ہو' ہو کر رات گئے تک سومنگ پول میں چھالیں مارتی رہتی تھیں اور ڈھاکہ میں دھان منڈی کے جس مکان میں تقسیم پاکستان کے نکات ترتیب دینے والوں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا اور لاڑکانہ کے جس مکان میں سیاست' جوڑ توڑ' شکار' پلان' ضیافتیں' مباحثے اور خرید وفروخت لگی رہتی تھی آج یہ سارے مکان سناٹے' افسردگی اور عبرت کی زد میں ہیں منشائے ایزدی بھی یہی ہے اور ارشاد ربانی بھی۔ سورۃ احقاف میں مطلع کر دیا گیا ہے کہ "تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ" وہ ہر چیز کو (آندھی) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دے گی چنانچہ وہ ایسے ہو گئے کہ بجز ان کے مکانات کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں

ہماری دعا بھی ہے اور خواہش بھی کہ اللہ تعالی ماڈل ٹاؤن والے مکانوں اور رائے ونڈ والے محلات کو اپنی امان میں رکھے اور انہیں آندھی' اندھیرے' آفات ومصائب سے محفوظ رکھے۔

اگر ہوفلر سکیل (ایک تا دس) پر ہم اپنے ہر دلعزیز حکمرانوں کی لوٹ مار' اقربا پروری' خرد برد' بندر بانٹ' پلاٹ' پرمٹ' اراضی' عمرے' ٹھیکے اور اجازت ناموں سے سرکاری خزانے اور ریاستی وسائل کو پہنچائے جانے والے نقصان کو بنیاد بنا کر ان کی درجہ بندی کریں تو یہ ترتیب بنتی ہے اور حیرانی اس درجہ بندی سے یہ ہوتی ہے کہ جو معتوب زیادہ ہیں وہی لوٹ مار میں نسبتاً پیچھے رہ گئے ہیں۔

۱۔ میاں محمد نواز شریف

۲۔ جنرل محمد ضیاء الحق

۳۔ محترمہ بے نظیر بھٹو

۴۔ جنرل محمد ایوب خان

۵۔ ذوالفقار علی بھٹو

۶۔ جنرل آغا محمد یحییٰ خان

جنرل محمد ایوب خان

اکتوبر 1958 میں جب جنرل محمد ایوب خان اقتدار پر قابض ہوئے تو مشرقی پاکستان کی رعایا نے عموماً" اور مغربی پاکستان کے عوام نے خصوصاً" نہ صرف ان کے اس اقدام کو تسلیم کیا بلکہ اسے سراہا بھی گیا۔ 1947 سے 1958 تک وہی غیر نمائندہ افراد کسی نہ کسی طرح اقتدار سے چمٹے رہے جو قبل از تقسیم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ اصول' جمہوریت اور انصاف کا تقاضا تو یہی تھا کہ نوزائیدہ ملک میں از سرنو عام اور آزادانہ انتخابات منعقد ہوتے تاکہ عوام کے مقامی اور حقیقی نمائندے ملکی مسائل اور ان کے حل میں براہ راست شریک ہو سکتے لیکن جمہوریت کے سر اٹھانے اور پروان چڑھنے کا یہ ابتدائی دور ان سازشیوں کی بھینٹ چڑھ گیا جو جانتے تھے کہ انتخابات میں ان کے لئے کیسی کیسی ناکامیاں اور رسوائیاں پوشیدہ ہیں۔ جن لوگوں کا پاکستان میں کوئی حلقہ انتخاب تک نہیں تھا وہ اس ملک کی حکمرانی اور نمائندگی کے دعویدار بنے ہوئے تھے ان افراد کے اس غیر جمہوری رویے سے مہم جو افراد کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ریاستی طاقت انفرادی ہاتھوں میں منتقل

ہونا شروع ہو گئی۔

مکر' فریب' تاخیر' حیلے بہانے اور سازشوں نے زور باندھا یوں پارلیمانی نظام کے مردے کی تدفین کا سہرا ایوب خان کے سر بندھ گیا۔ روز روز کی سیاسی طالع آزمائی سے تنگ عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ بے یقینی اور دباؤ کے اس مخصوص پس منظر میں ایوب خان کی آمد اور ان کا تسلیم کیا جانا ان کی قبولیت کی سند نہیں تھی لیکن انہوں نے سیاستدانوں کے ہاتھوں بیزار قوم کی نیم رضامندی سے اپنے حق حکمرانی کو حلال کر لیا۔

ایوب خان کی آمد سے عوام کو تبدیلی کا احساس ہوا ان کے غیر سیاسی پس منظر' غیر سیاسی گفتگو' حب الوطنی اور اخلاص سے عوام متاثر و متوجہ ہوئے۔ شروع شروع میں ان کے دو ٹوک لہجے' مسائل کے مختصر حل اور صورت حال کے فوری اقدامات سے عوام پر خوش گوار تاثر مرتب ہوا یہ الگ بات کہ قوم اور ملک کو حقیقی درپیش مسائل کی بجائے ثانوی نوعیت کے مسائل پر توجہ مرکوز کر دی گئی' دودھ ملے پانی کی فروخت پر پابندی لگی تو تالیاں بجائی گئیں اور سبزی گوشت کی قیمتوں کو دکانوں پر آویزاں کرنے کے آرڈیننس پر مبارک باد دی جانے لگی۔ معاشرتی بگاڑ کے سطحی حل کو انقلابی اقدامات قرار دیا جانے لگا حالانکہ مارشل لاء میں پوشیدہ بے پناہ طاقت سے بڑے بڑے مثبت اقدامات کئے جا سکتے تھے لیکن ہمارے ہاں پہلا مارشل لا ہی مک مکا اور مصالحت کا شکار ہو گیا۔ حتیٰ کہ مستقبل میں مارشل لا محض ایک تمسخر' ایک تضحیک' الزام' پاکستان آرمی کے مفادات کا تحفظ اور غیر ضروری مہم جوئی کی علامت بن کر رہ گیا۔ آرمی کے کمانڈر انچیفس اپنے عہدے کا کلائمکس صدارت میں دیکھنے لگے۔ کمانڈر انچیف بننے کے بعد ریٹائرمنٹ کا سوچنے کی بجائے صدارت کا سوچا جانے لگا۔

جب جنرل ایوب خان اقتدار پر قابض ہوئے تو یوں لگتا تھا کہ ان کی نیت صاف' دامن بے داغ' لہجہ پر عزم' اقدامات راست اور اخلاص بھرے ہوں لیکن اقتدار کے ایوانوں میں جوں جوں دن گزرتے گئے وہاں پر براجمان آسیب اور چھپے ہوئے عفریت نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل ایک مختلف ایوب خان بن گئے قریب گیارہ سال بعد جب وہ ایوان صدر سے رخصت ہوئے تو وہ اس جنرل ایوب خان کی محض پرچھائیاں رہ گئے تھے جسے ایوان صدر میں داخل ہوتے وقت دیکھا گیا تھا۔ وہ جس کی نیت صاف لگتی تھی اب بدنیتی کا ملزم تھا' بے داغ دامن پر نرے داغ ہی داغ بلکہ سارا دامن ہی داغدار اور تار تار' لہجہ غیر فیصلہ کن' اقدامات منفی' مفاداتی' سطحی اور اخلاص ناپید۔ گیارہ سال پہلے والے شائستہ شبہ فرد کا چہرہ اب بات بے بات غصے سے تمتماتا رہتا تھا یا بے بسی اور افسردگی سے لٹکا رہتا تھا۔

جن سیاستدانوں سے وہ قوم کو نجات دلانے کے لئے آئے تھے اقتدار کے چند ہی ماہ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ خود بھی ان کے بغیر نہیں چل سکیں گے بالآخر انہوں نے انہی بد دیانت' بد عنوان اور نااہلوں کو اپنا مصاحب مقرر کر لیا ان کے ابتدائی اقدامات سے جن جاگیر دارانہ مفادات پر زد پڑی تھی اب وہ انہی کے تحفظ میں سرگرم تھے اپنے ہی شروع کئے ہوئے پراسس کو ریورس کرنے میں انہیں بہت محنت کرنا پڑی۔

مارشل لاء کی دہشت دیکھتے ہی دیکھتے روایتی واقفیت' اثر ورسوخ اور سفارش کے سامنے ماند پڑ گئی' گھاگ سیاستدانوں' سیاسی جاگیرداروں اور مفاد پرستوں نے ایوب خان کے گرد حلقہ باندھ لیا اور وہ بتدریج محصور ہوتے گئے۔

صدر ایوب خان ان گماشتوں کی توقعات سے کہیں زیادہ سادہ دل نکلے۔

زمین مناسب دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے ایوب خان کے ارد گرد ایک ایسا حصار تعمیر کر دیا کہ مراعات اور فائدے اس حصار سے باہر نہ جا سکیں نتیجتاً" جو صنعتی و معاشی ترقی ہوئی بھی تو اس کا ثمر عام آدمی تک نہ پہنچ سکا بلکہ بہت ہی محدود دائرے میں اور بہت ہی کم ہاتھوں تک محدود رہا۔

صدر ایوب خان کا معاشی فلسفہ ان کے سیاسی نظریات سے وابستہ تھا صنعتی بنیاد کو وسعت دینے کے لئے وہ اس بات کے قائل تھے کہ صنعتی ومعاشی پھیلاؤ میں صرف وہی افراد حصہ لے سکیں جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں' جنہیں اس کا تجربہ ہے' جن کے پاس وسائل ہیں' جو نسل در نسل مضبوط سیاسی خانوادوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں اور صوبوں میں سیاسی عمل پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس فلسفے کے پیش نظر صنعتی لائسنس اور پرمٹ انہی لوگوں میں بانٹے گئے جو پہلے ہی لائسنس اور پرمٹس پر پروان چڑھے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب خان کے آنے تک جو اٹھارہ خاندان ملک کی اقتصادی شہ رگ پر انگوٹھا رکھے ہوئے تھے ان کی تعداد میں مختصر مگر وسائل اور دولت میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ یہ لوگ اس قدر باوسائل ہو گئے کہ بعد میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے سرمایہ داروں کی چمڑی اتارنے کے قصد کا اظہار کیا تو انہیں اپنی چمڑی بچانا مشکل ہو گئی۔ صدر ایوب خان نے سیاسی جاگیرداروں کو انڈسٹریل ویمپائرز اور بزنس میگنٹ میں بدل دیا۔

زرعی اصلاحات کا نفاذ صدر ایوب خان کی صلاحیتوں' اخلاص اور قوت کا پہلا ٹیسٹ کیس ثابت ہوا اور وہ اسی میں ناکام ہو گئے۔ شماریاتی اور کاغذی اعتبار سے زرعی اصلاحات بھاری بھر کم' متاثر کن اور زرعی ڈھانچے میں تبدیلی کا باعث لگتی تھیں لیکن زرعی اصلاحات کے نتائج مایوس کن نکلے۔ اس

مرحلے پر یہ فیصلہ کرنا مشکل لگتا تھا کہ ایوب خان رجائیت پسند اور سادہ دل زیادہ ہیں یا کج فہم اور ریاکار' چونکہ اراضی کی حد ملکیت کے نئے قانون کے تحت جاگیرداروں اور وڈیروں کی جو اراضی مزارعوں اور ہاریوں کو دی جانے والی تھی' جاگیرداروں اور وڈیروں کے لئے ان مزارعوں اور ہاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا زیادہ آسان تھا نسبتاً اپنی زمین انہیں دینے سے' سو زرعی اصلاحات کے نفاذ پر پورے ملک کے طول وعرض میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا مزارع یا ہاری نہیں ملتا تھا جو یہ کہہ سکتا کہ زرعی اصلاحات کے نتیجے میں اسے قبر جتنی ہی زمین دی گئی ہے۔

اپنے طور پر اس قدر کامیاب اور عظیم الشان اصلاحات کا یہ حشر دیکھ کر وہ خود بھی ششدر' شرمندہ اور دل برداشتہ ہوئے اور اس بات کے قائل ہوتے گئے کہ اصلاحات کے نفاذ اور بہترین نتائج کے لئے جس طرح کے افراد اور ٹیم درکار ہے وہ انہیں میّسر نہیں ہے بلکہ ان کے مقرّبین' جوڑی دار اور جانثار ہی اصلاحات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ انہوں نے اپنی سادگی اور پرکاری کو بیک وقت استعمال کرتے ہوئے انہی جاگیرداروں کو اصلاحات کے نفاذ کو یقینی بنانے پر مامور کر دیا کہ جن کے حلقوم زرعی اصلاحات کی آری سے کٹ سکتے تھے۔ بلی کو دودھ کی رکھوالی پر مامور کر کے وہ نیم وا آنکھوں اور احساس تفاخر سے نتائج دیکھنے اور واہ واہ سمیٹنے کے انتظار میں مصروف ہو گئے۔ واہ واہ اور مبارک سلامت کا رولا پڑنے سے پہلے ہی انہیں یہ اطلاعات ملنی شروع ہو گئی تھیں کہ مقرر کی جانے والی حد ملکیت سے زیادہ اراضی زمینداروں اور وڈیروں نے اپنے ہی افراد خانہ میں بانٹنی شروع کر دی ہے۔ ایسی اطلاعات نے ان کی حالت انتظار کو بے زاری اور بددلی سے دوچار کر دیا۔

زرعی اصلاحات کی ناکامی کی کسر نکالنے کے لئے وہ فوری طور پر دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ صدر ایوب خان چاہتے یہ تھے کہ کسی نہ کسی شعبے میں کوئی نہ کوئی ایسا کام فوراً ہونا چاہیئے کہ جس سے ان کی قیادت کی سربلندی ظاہر ہو' عوام کو تبدیلی کا احساس ہو اور ان کی کامیابیاں ان کے حق حکمرانی کا جواز بن سکیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ قدامت پسندی کی خچر پر بیٹھے انقلابی اقدامات کا پیچھا ڈالنے پر مصر تھے۔ سواری ایسی محفوظ اور خراماں ہو تو کلّے میں نیزہ تو گھونپا جاسکتا ہے لیکن بازی جیتنے کے لئے کلّہ اکھاڑنے کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری بھی درکار ہوتی ہے۔ صدر ایوب خان کی رفتار فطرتاً اصلاحاتی ہی ہوسکتی تھی سو وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

حکومت کی تبدیلی اور اصلاحات (وہ بھی نام نہاد اور نا مکمل) کو وہ انقلاب کہنے پر بضد رہے اور اصلاحات کے لئے جس شعبہ جاتی مہارت' تحقیق' سوجھ بوجھ اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے' وہ ان میں مفقود تھی۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی کام بھی نہ ہو سکا۔

انقلابی وہ سرے سے تھے ہی نہیں اور اصلاحات کا بار وہ اٹھا نہ سکے وہ جس طرح کے فیلڈ مارشل تھے' ایسے ہی بانی انقلاب بھی ثابت ہوئے۔

صدر ایوب خان کے برعکس ذوالفقار علی بھٹو کے پاس رفتار ہی رفتار تھی گو کہ ان کی رفتار تیز اور خاصی انقلابی تھی لیکن ان کا نیزہ کبھی زمین میں دھنس جاتا' کبھی فریق مخالف کے پاؤں میں اور کبھی عوام کی گردن میں' زد میں لانے کو جب اور کچھ نہ ہوتا تو وہ اسے اپنے ہی پاؤں میں گاڑ لیتے۔

پسماندگی' افلاس' جہالت' جبر اور استحصال کا کلّہ اکھاڑنے میں بہر حال دونوں ناکام رہے۔

زرعی اصلاحات کا زائچہ زیادہ تر صدر ایوب خان کا اپنا ہی کھینچا ہوا تھا

اس کے تخلیق کار وہ خود ہی تھے اس ناکامی پر وہ چونکے' چوکنے ہوئے اور مزید محتاط ہو گئے۔ زرعی میدان میں ناکامی کے بعد اپنے عقل کل ہونے پر ان کا اعتماد لڑ کھڑا گیا۔ دوسرے شعبوں میں اصلاحات کا بے ثمر بیج بونے کے لئے انہوں نے اپنے بارے میں نسبتاً دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ مختلف شعبوں میں اصلاحات کے لئے آخری فیصلے کا حق محفوظ رکھتے ہوئے انہوں نے کمیشن اور کمیٹیاں قائم کرنی شروع کر دیں۔ اگر کہیں کوئی کامیابی ہو گئی تو بلّے بلّے ان کی' نہ ہوئی تو بہ جا بہ جا کمیشن والوں کی لیکن ایک غلطی وہ یہاں بھی کر گئے کہ ان کمیشنز اور کمیٹیز میں کثرت سے ان خلیفوں کو شامل کر دیا گیا کہ جن کی وجہ شہرت ہی ناکامی' مہارت بد دیانتی' رجحان روک تھام' میدان مستعار اور معاوضہ خطیر تھا۔

وزارت' مشاورت اور سفارت کے بعد اگلا پڑاؤ کمیشن کی بدتدبیری ہی تھا۔ جہاں پانچوں گھی میں' اور سر کمیشن کی کڑاہی میں باآسانی سما جاتا تھا۔ برطرف' ریٹائرڈ' معطل' نااہلے' نانگے' زیر تفتیش' منہ کو خون اور حرام لگے' سب کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر کسی نہ کسی کمیشن کی کڑاہی میں چھوڑ دیا گیا۔

تحقیق' تجزیے' اعداد وشمار اور سفارشات مرتب کرنے کے نام پر جو لوٹ مچی اور آمدو رفت شروع ہوئی تو کراچی ڈھاکہ اور ڈھاکہ راولپنڈی کا ہوائی روٹ چھوٹا پڑ گیا' ہوٹلوں میں کمرہ' پھر کمرے' پھر پورے پورے فلور ریز رو کرائے جانے لگے۔ حکومت پاکستان کا کروڑوں روپیہ یہ نام نہاد ماہرین مشاورت کے معاوضے' اخراجات سفر اور روزانہ الاؤنس کے نام پر کھا گئے۔

صدر ایوب خان نے کمیشن تو بہت سارے تشکیل دیئے مگر نتائج کہیں سے بھی برآمد نہ ہو سکے۔ کم وبیش ہر شعبے کی اصلاح کے لیے کمیشن بنایا گیا مگر ڈھاکہ میں چوتھا پات نہ لگ کے دیا۔

کمیشن برائے محل وقوع دارالخلافہ

افرادی طاقت کا کمیشن

شادی وعائلی قوانین کا کمیشن

کمیشن برائے تعلیم

سائنس کمیشن

کمیشن برائے اصلاح قرضہ جات

غذائی وزرعی کمیشن

اصلاح قانون کمیشن

جہاز رانی کمیشن

قرضہ جاتی کمیشن

مالیاتی کمیشن

پولیس کمیشن

طبی اصلاحات کمیشن

آئین کمیشن

ملازمت / تنخواہ کمیشن

قومی آمدنی کمیشن

قومی مالیاتی کمیشن

اقلیتوں کا کمیشن

نشرواشاعت کا کمیشن

حق رائے دہی کی کمیٹی

کھیل اور ثقافت کی کمیٹی

سماجی برائیوں کا کمیشن

برقی طاقت کا کمیشن
قیمتوں کی تعین کا کمیشن
کمپنی قانون کمیشن
فلمی معلوماتی کمیشن
انتظامیہ / تنظیم نو کمیٹی

ہمارے ہاں کمیشن تو بڑے اہتمام' تشہیر اور بلند بانگ دعوؤں سے قائم کیئے جاتے ہیں مگر کسی کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور اس کی تین بڑی واضح وجوہات ہیں

ا۔ کمیشن کے ماہرین اپنی سفارشات کو حتی الامکان لفظی گورکھ دھندے' اعداد وشمار کے الٹ پھیر' علمی حوالوں اور عالمانہ قیافہ شناسی سے گنجلک اور ناقابل عمل بنا دیتے ہیں۔ جن سفارشات کے پڑھنے سے ہی حکومت وقت کے پسینے چھوٹنے اور رونگٹے کھڑے ہونے لگیں وہ اس پر عمل درآمد کرے بھی تو کیسے کرے۔؟

۲۔ سفارشات کو مرتب کرنے والے ہی عموما ان کے نفاذ کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں جب اصل میں دونوں ایک ہوں تو عمل درآمد ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

۳۔ سفارشات پر عمل درآمد سے جن افراد' طبقوں اور محکموں کے مفادات پر زد پڑ سکتی ہے۔ کمیشن کے کرتا دھرتا انہی کے حق میں سفارشات مرتب کر دیتے ہیں اور پھر انہی کے تحفظ میں اور روک تھام اطلاق سفارشات خود مرتبہ میں سرگرم ہو جاتے ہیں سو جب اصل میں سارے ایک ہوں تو کمیشن' حمود الرحمٰن کمیشن اور قومی تعلیمی کمیشن کی طرح المیے اور عبرت کا حوالہ تو بن سکتا ہے مگر کسی اصلاح اور افادیت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

سفارشات مرتب کرنے والوں اور قانون بنانے والوں کو اپنے مفادات کے تابع رکھتا، انہیں خرید لینا اور ایسے ضابطوں کا اجراء نہ ہونے دینا کہ جن سے مفادات پر ضرب پڑتی ہو، آج کل کے مہذب انداز میں لابنگ، کہلاتا ہے۔ لابنگ کا یہ لوبھ امریکہ سے اسرائیل اور سڈنی سے سانگھڑ تک پھیلا ہوا ہے لیکن ہمارے ہاں جس قدر عریاں' بدصورت' نمایاں' برسرعام اور قابل قبول ہے' اس قدر اور کہیں بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر آنے والی حکومت اپنی اپنی ترجیحات اور لوٹ مار کے سوچے سمجھے طریق کار کے مطابق نئے نئے کمیشن قائم کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ ورنہ کسی شعبے میں قائم کردہ کسی ایک ہی کمیشن کی سفارشات پر سو فیصد عمل درآمد ہو جاتا تو کم ازکم اس شعبے کو تو مستقبل کے کسی کمیشن کی چترائی سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا مثلاً" 1947ء میں ہی وزیر تعلیم فضل الرحمان صاحب کی تعلیمی سفارشات پر اگر عمل درآمد کر لیا جاتا تو بعد میں وقتاً" فوقتاً" جو آٹھ تعلیمی کمیشن بنائے گئے ان کی ضرورت ہی نہ پڑتی چونکہ جو سفارشات تعلیم کے بارے میں 1948ء میں کی گئی تھیں وہی آج تک شرمندۂ تکمیل ہیں اور بعد میں آنے والے ہر کمیشن نے اسی بات کو دوہرایا ہے، جو 1948ء میں ہی کہدی گئی تھی۔ فضل الرحمن سفارشات میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس سال میں یعنی 1967ء تک ناخواندگی کے مکمل خاتمے کے لئے پرائمری سطح کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

بیسواں سال تیسری دفعہ لگنے کو آیا مگر ہماری ناخواندگی' لازمی پرائمری تعلیم اور تعلیمی کمیشنز کی سفارشات کی کھوتی اسی پرنالے کے نیچے بندھی ہوئی ہے' جہاں 1947ء میں بندھی تھی۔

جس ناخواندگی پر بیس سال میں غلبہ پانا قرار دیا گیا تھا۔ اب ہم بحیثیت

مجموعی قوم اسی سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ حکومتوں کی خوش فہمیوں' تعلیمی روک تھام کے ماہرین کے قیافوں اور پالیسی سازوں کے دعووں سے قطع نظر سچ اور حقیقت یہ ہے کہ گزرے سالوں میں ہماری شرح خواندگی بھی کم ہوئی ہے اور معیار خواندگی بھی۔ آج جس 26 فیصد خواندگی کا دعوی کیا جا رہا ہے اس میں انتہائی محتاط اندازے اور خواندگی ناپنے کے حسابی فارمولے کے مطابق سات سے نو فیصد تک وہ خواندہ افراد بھی شامل کر لئے گئے ہیں' جو رومن طرز تحریر میں ٹکواں ٹکواں ہجوں سے اپنا نام لکھ سکتے ہیں یا لکھا ہوا پہچان سکتے ہیں۔ معاشرے کے لئے ان کی افادیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ افراد ووٹ کی پرچی پر کسی جانور' جوتی' موم بتی' تیر' تبّر' تلوار اور سودے تولنے والی ترازو کے سامنے نشان لگا سکیں۔

چھبیس فیصد شرح خواندگی سے اگر سات' آٹھ فیصد خواندگی کے ان ملزموں کو منہا کر دیا جائے تو ہماری شرح خواندگی بشمول سارے تعلیمی کمیشن وسفارشات کم وبیش اسی قدر ہے کہ جس قدر 14 اگست 1947ء کی صبح کو تھی۔

زرعی اصلاحات کی بد دلی اور بے زاری سے یکایک ان کی نظر خارجہ تعلقات اور خارجہ پالیسی کی رنگینی' گہما گہمی' عشائیوں اور استقبالیوں پر جا ٹھہری اور وہ سیاہ اور بھورے رنگ کے خوبصورت سوٹ پہن کر خارجہ تعلقات کی تسخیر میں مگن ہو گئے۔

صدر ایوب خان اپنی متانت' فطری سادگی اور وجاہت کی وجہ سے اس میدان میں خاصے کامیاب رہے۔ غیر ملکی سربراہ ان سے ملتے اور متاثر ہوتے صدر ایوب خان پیچیدہ' متنازعہ اور سیاسی گفتگو کو ڈرامائی' پہلودار اور ذو معنی انداز میں کرنے کی بجائے سیدھے رخ' سادہ الفاظ اور اخلاص بھرے لہجے میں

پیش کر دیتے۔ وہ اپنے نقطہ نظر میں سادگی' اخلاص اور کم مائیگی کی ایسی آمیزش کر دیتے کہ مخاطب اپنی جارح یا دفاعی پوزیشن سے درد مندی کی سطح پر اتر آتا۔ غیر ملکی میڈیا کے لئے صدر ایوب خان کا یہ انداز اچھوتا اور دل لبھاؤ تھا۔ انہوں نے اپنے اس غیر رسمی اور غیر سفارتی برتاؤ سے اپنے لئے احترام اور پاکستان کے لئے بیرونی ملکوں میں نرم گوشہ پیدا کر لیا تھا۔

مذاکرات کی میز پر ان کا سب سے بڑا ہتھیار صورت حال کا منطقی' حقیقت پسندانہ اور نسبتاً غیر سفارتی تجزیہ ہوتا جسے وہ انتہائی سنجیدگی اور دردمندی سے ٹھہر' ٹھہر کر بیان کر دیتے پھر صورت حال کی بہتری کی ذمہ داری میں مخاطب کو پوری طرح ملوث کر لیتے اور کسی بھی یقینی Outcome کی گھنٹی کو اسی کے گلے میں ڈال دیتے۔ وہ براہ راست پاکستان کے لئے کچھ بھی طلب نہ کرتے بلکہ اس ضرورت کو علاقائی استحکام' دیرپا امن' فوجی طاقت کا توازن' معاشی ترقی اور خطے کے عوام کی فلاح و بہبود جیسے آزمودہ الفاظ اور زیادہ قابل قبول اصطلاحوں میں چھپا دیتے۔ بالآخر مذاکرات کے دوران ایک ایسا مرحلہ بھی آجاتا کہ مخاطبین کو مزید انکار سے گلٹ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نظر آنے لگتا۔ یہی لمحہ اور مرحلہ صدر ایوب خان کی خارجہ پالیسی کے میدان میں ان کی کامیابی کی ضمانت بن جاتا۔

جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہ ہمارے بہت کامیاب وزیر خارجہ تھے یہ بات قرین قیاس بھی نہیں ہے کہ وہ واقعی ایک کامیاب وزیر خارجہ تھے۔ اول تو یہ کہ وہ اپنے طور پر خارجہ پالیسی بنانے میں خود مختار ہی نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ بھٹو صاحب کی خارجہ پالیسی کی آؤٹ لائن ایوب خان صاحب کی ترجیحات کے عین مطابق تیار کی جاتی۔ خارجہ پالیسی کے میدان میں اگر بھٹو صاحب کی کوئی کامیابی ہے بھی تو وہ

ایوب خان کی مرہون منت ہے۔ صدر ایوب خان بیک وقت ایک جرنیل' سربراہ مملکت وحکومت اور سیاستدان تھے لیکن ان کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار اور کامیابی کا سراغ ان کی خارجہ پالیسی میں ہی ملتا ہے۔

کاش وہ صرف ملک کے وزیر خارجہ ہی رہے ہوتے تو عین ممکن ہے کہ آج ہماری بھی کوئی خارجہ پالیسی ہوتی اور پاکستان کا بھی کوئی سفارتی وزن ہوتا۔

عین اس وقت کہ جب باہر کے ملکوں میں صدر ایوب خان کی قوت برداشت اور ثابت قدمی کا اعتراف اور احترام شروع ہوا تو اندرون ملک ان کے لئے صورت حال بدل چکی تھی۔ استقبالیہ کے سرخ اور سافٹ قالینوں سے ان کا پیر جب بھی ملک کی سنگلاخ زمین پر پڑتا تو الجھن' تذبذب اور دباؤ کا شکار ہوجاتے۔ غیر ملکی دوروں سے کامیاب لوٹنے والا اپنے ملک میں آتے ہی ناکام ہو جاتا وہ ملکی سیاستدانوں اور ہم نفسوں سے مذاکرات کرتے ہوئے بالکل مختلف رویہ اپنا لیتے۔

صدر ایوب خان کی خارجہ پالیسی کی کامیابیوں پر بنیادی جمہوریت کے جبر' 1965 کی جنگ میں شکست فاش' 1962 کے آئین کی بے آئینی' مشرقی پاکستان میں شورش اور محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں سرخ روئی نے کالک مل دی۔

ایک طرف صدر ایوب خان کی نافذ کردہ اصلاحات دھڑا دھڑ ناکام ہو رہی تھیں اور دوسری طرف ان کے قرابت دار' خوشامدی اور کاسہ لیس انہیں نجات دہندہ کے طور پر لانچ کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا تھے۔ شروع شروع میں اپنے آپ کو نجات دہندہ سننے اور ماننے سے وہ جھینپ جاتے ان کا سرخ سفید رنگ مزید گہرا ہو جاتا مگر اسی سماعتی تسلسل اور تکرار نے انہیں بالآخر یہ

سوچنے اور تسلیم کر لینے پر آمادہ کر ہی لیا کہ تحسین کا یہ شور سراسر جائز اور ان کی خدمات کے اعتراف میں برپا ہو رہا ہے مگر خدمات تھیں کہ وہ نہ انہیں خود کو نظر آتی تھیں نہ عوام کو بجز ان کے لے پالکوں کے۔ بہرحال نام نہاد اور کاغذی کامیابیوں نے خودساختہ اور بے بنیاد نجات دہندگی کے غبارے میں ایسی ہوا بھر دی کہ وہ اوپر کو ہی اٹھتے چلے گئے۔ وہ جوں جوں اوپر کو اٹھتے گئے عوامی' حقیقی اور زمینی مسائل دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے گئے حتیٰ کہ وہ پوری طرح اپنے بازی گر مصاحبین کے نرغے میں گھر گئے۔

ایک پیشہ ور فوجی ہونے کے باوجود بھی انہیں نرغے میں گھر جانے کا احساس تک نہ ہو سکا یا اس نرغے کو انہوں نے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا' نرغے میں گھرے رہنے سے جو تحفظ' آسودگی اور خود سپردگی وابستہ ہے صدر ایوب خان اس کے عادی ہوتے چلے گئے نہ وہ حقائق جاننا چاہتے تھے نہ ان کے پاس ان کا کوئی حل تھا وہ آنکھیں موندے صورت حال کے بگاڑ کی بیشتر ذمہ داری عوام کی ناخواندگی' سیاستدانوں کی غیر ذمہ داری اور وقت سے پہلے نافذ کر دینے والی اپنی اصلاحات پر ڈال دیتے۔ بازی گروں نے نام نہاد ترقی اور عوام کی خوش حالی کی ایک ایسی خوش رنگ شبیہ صدر صاحب کے سامنے ایستادہ کر دی تھی کہ ایوب خان اسی شبیہ اور شبے کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنے طور پر اس گمان میں مبتلا ہو گئے کہ ان کی اصلاحات جس قدر ترقی پسندانہ تھیں عوام اسی قدر ناخواندہ اور نا اہل تھے اور انہوں نے ضرورت اور وقت سے بہت پہلے پاکستان کو ترقی کی ایک ایسی اوج سے ہمکنار کر دیا ہے جس کے لئے عوام ابھی ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے۔ ادھر عوام یاں آپڑی ہے شرم کہ تکرار کیا کریں والی صورت حال سے دو چار تھے۔

صدر ایوب خان نے کسی وقت بھی اس نرغے کو توڑنے کی کوشش ہی

نہیں کی کہ جس میں وہ محصور تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو اس بارے میں ایوب خان سے کہیں زیادہ دلیر اور جرات مند ثابت ہوئے کہ وہ بار بار نرغہ توڑنے اور محاصرہ اکھاڑنے کی سعی کرتے رہتے تھے یہ الگ بات کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جنرل ضیاء الحق اس بات میں سرفہرت رہے کہ انہوں نے گھیرے میں گھرنے کی بجائے پوری قوم پر ہی گھیرا ڈال دیا وہ اس گھیرے کو عوام کی گردنوں پر تنگ کرتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے سانس لینا دو بھر اور زمین کو انہی لوگوں پر تنگ کر دیا جو اس زمین پر پہلے سے ہی تنگ تھے جنرل ضیاء الحق نے بڑے بڑے نامی گرامی' پیشہ ور نرغے باز اور گھیرا ساز افراد کی کرکری کر دی ان کو اپنی ہی ڈال دی ان کا منکہ توڑ دیا اور صورت بگاڑ دی۔ وہ خود اس کام کے پرو (PRO) تھے اس میدان مین انہوں نے کسی کی نہ چلنے دی۔

جنرل ضیاء الحق اپنے دور کے بہت بڑے نرغہ باز تھے وہ جس پر نرغہ باندھتے اور گھیرا ڈالتے اس کم نصیب اور بخت ہارے کو کم ازکم اس دنیا میں تو پھر کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ جنرل صاحب کے گھیرے کا پھیلاؤ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی' جلال آباد(افغانستان)اورکینز (فرانس) تک مار کرتا تھا۔

طمع' اقربا پروری اور بددیانتی کا عفریت اور مک مکا و مصالحت کا جو آسیب ہمارے یہاں کے اقتداری ایوانوں میں براجمان ہے اس نے صدر ایوب خان پر ایسے پنجے گاڑے کہ ان کی طبیعت کا کھراپن' اختصار اور قوت فیصلہ رخصت ہوگئے۔ ایوانِ صدر میں مقیم رہنے کی شدید خواہش اور مجبوری انہیں کھینچ کھانچ کے انہیں مردار خوروں، قصیدہ خوانوں اور مرثیہ نویسوں کے درمیان لے آئی جو پلاٹ' پرمٹ' پروموشن' راشن ڈپو' لائسنس' ٹھیکے' ایجنسیز' اجازت نامے' ٹکسالیں' کارخانے' عہدے' اجارہ داریاں اور جانے کیسے کیسے ملک

الموت کے مال منال اور حال احوال کی دستاویزات لئے ان کے منتظر کھڑے تھے۔

ریاستی املاک کے تحفظ کے حلف نامے پر رکھے جانے والے ہاتھ سے وہ ریاستی وسائل کو خرد برد کرنے والے حکم ناموں پر دستخط کرنے لگے۔ صدر ایوب خان ہمارے پہلے ایسے حکمران ہیں جنہوں نے ریاستی وسائل کو مال مفت سمجھا اور بے رحمی سے لٹانے کی بنیاد ڈالی۔

صدر ایوب خان سے پہلے کے حکمرانوں میں ایک وصف ہزار خرابیوں کے باوجود نمایاں تھا کہ انہوں نے سرکاری وسائل وخزانے کی کڑی پاسداری کی' اس میں نقب لگائی' شگاف ڈالا نہ ڈنڈی ماری۔ ایوب خان کے پیش رو اکثر حکمرانوں کو اقتدار کے رتجھے ہوئے' سازشی اور جاہ پسند تو کہا جا سکتا ہے مگر ان کی دیانت پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ سب سے زیادہ معتوب زدہ ملک غلام محمد مرحوم بھی اس بات پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ ان کے ذاتی خطوط کو حکومت پاکستان کے ٹکٹ پر نہ بھیج دیا جائے' وہ جس کاغذ پر اپنی نہ پڑھی جانے والی تحریر ثبت کر رہے ہیں اس کی خرید ان کے ذاتی مصارف کی مد میں ہوئی ہو۔ لیکن صدر ایوب خان کی آمد کے ساتھ ہی اس روایتی معیار اور مالیاتی احتیاط میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔

کہاں یہ معیار اور پاس داری کہ سرکاری خزانے کی ایک پائی بھی کسی طرح ذاتی حیثیت میں خرچ نہ ہو جائے اور کہاں یہ کوشش اور خرابی کہ سرکاری خزانے میں کچھ باقی نہ بچ جائے۔

صدر ایوب خان سے پہلے صوابدیدی حق کی حرافہ نہ اس قدر متعارف تھی نہ بد چلن' نہ یوں میسر تھی نہ برسرعام مگر ان کی نظر کرم پڑتے ہی اس حرافہ کے نخل ہرے ہو گئے اور سوکھے دھانوں پر صرف پانی پھرا ہی نہیں بلکہ

گردن گردن آگیا' انھوں نے اپنے عہد اقتدار کے ابتدائی دنوں میں ہی مملکت خداداد کی دو لاکھ ایکڑ سے زیادہ زرعی اراضی اور پلاٹ ان گدھ خصلت اور حرام فطرت حواریوں میں تقسیم کر دی جو ان کے ارد گرد حلقہ زن تھے' پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور نجات دہندگی کے غبارے میں ہوا بھرنے کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

صدر ایوب خان نے سیاسی رشوت' مراعات اور فائدے بانٹتے وقت بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ مال غنیمت کی تقسیم میں وہ طبقے' گروہ اور افراد سب کو ایک نظر سے دیکھتے' نہ کوئی امتیاز روا رکھا نہ کسی کی دل آزاری کی' بیوروکریسی کا پرزہ ہو یا سیاسی حرام خور' گدھ نما جرنیل ہو یا قوم کا خون چوسنے اور بہانے والی دفاعی جونک، دستار بند ہو یا ہتھیار بند، خانقاہوں کا پیرا سائٹس ہو یا عدلیہ کا خون آشام، حرف فروش صحافی ہو یا امیج ساز میڈیا بابو، نظریہ ساز لکھاری ہو یا نظرباز عمامہ پوش' بد نظر دانشور ہو یا قلم کا جاگیردار' انھوں نے سب کا رانجھا راضی اور مرادیں پوری کر دیں۔

کسی کو پتہ چلا نہ بات نکلی نہ کوٹھے چڑھی مگر راتوں رات صدر ایوب خان کو نہ جانے کون سے قاعدے' قانون' اصول اور ضابطے کے تحت ایسے اختیارات حاصل ہو گئے کہ مملکت کی ملکیت اراضی' ملکی وسائل' زر مبادلہ کے ذخائر' بنکوں میں محفوظ سرمایہ اور حکومت کے اجازت ناموں پر ان کی صوابدید غالب آگئی۔ لاکھوں کے پلاٹ' کروڑوں کی زرعی اراضی اور اربوں روپے مالیت کے صنعتی اجازت نامے ان کی جنبش ابرو سے عطا ہونے لگے۔ راتوں رات اربوں کی سرکاری ملکیت ان کے ناجائز حق حکمرانی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

امریکہ کے صدارتی عہدے کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ بااختیار اور

مضبوط عہدے کا اعزاز حاصل ہے مگر صدر امریکہ اپنے تمام تر اختیارات اور حقوق کا استعمال کرتے ہوئے بھی ایک مربع انچ زمین کسی کو دے سکتے ہیں نہ دلوا سکتے ہیں۔ یہی حال ہندوستان سمیت دنیا کے پیشتر ممالک میں مروج ہے کہ حکمرانوں کو لوٹ مار کا' صوابدید کا' خرد برد کا اور قتل عام کا کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہے۔ ہمیں اس فرد' مشیر' ماہر' نمائندے اور نمائندوں کو مسلسل مصلوب کرتے رہنے کی شدید ضرورت ہے کہ جس نے صوابدید کے کوڑھ کی آبیاری کی' لوٹ مار کے ضابطے بنائے' قانون منظور کئے' بددیانتی کو بنیاد اور چوری چکاری' سیاسی رشوت' خرد برد' اور مک مکا کو قانونی تحفظ فراہم کیا۔

ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا' پتہ ہی نہیں چلنے دیا جاتا مگر پتہ چلانا چاہیئے کہ وہ پہلا فرد واحد' وہ اعلیٰ دماغ' وہ دوزخ بشارت' وہ ناقص بیج' وہ ناتحقیق وناملعوم کون تھا کہ جس کی تحریک پر ہمارے حکمرانوں' اعلی اہلکاروں اور نمائندوں کو ایسے ایسے قانونی اختیارات و تحفظات حاصل ہو گئے کہ جس کی دنیا میں نظیر ملنا مشکل ہے۔ کسٹم ڈیوٹی کی ادائیگی کے بغیر کار امپورٹ' غیر ملکوں میں علاج معالجے کی سہولت' بڑے بڑے قرضوں کی معافی' سرکاری زمینوں کی بخشش' اور لمبی مدت کے لئے لیز' ضرورت سے بڑی رہائش گاہیں' فری ٹیلی فون' عمروں کے دورے' صحافتی وفود' ثقافتی مجرے' مطالعاتی دورے' ترقیاتی منصوبوں کے لئے سرکاری فنڈز کی انفرادی تقسیم' سرکاری ریسٹ ہاؤسز اور املاک پر قبضہ اور واجبات کی عدم ادائیگی جیسی مراعات جنہیں قانونی تحفظ حاصل ہو دنیا بھر میں شائد ہی کسی دوسرے بدنصیب معاشرے میں مروج ہوں۔

صدر ایوب خان جو خاصی طویل المدت منصوبہ بندی کے بعد اقتدار پر قابض ہوئے بہت پہلے یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ بالآخر وہ اقتدار اعلی کو تسخیر کر کے رہیں گے اور اس کی بہت ساری وجوہات ان کے سامنے تھیں پاکستان

آرمی کا سربراہ بننے کے بعد جب ان کا قریبی رابطہ گورنر جنرل اور وزرائے اعظم سے استوار ہوا تو انہیں محسوس ہوا کہ ملک کا سربراہ بننے اور حکومت کرنے کے وہ نسبتاً ان سب سے زیادہ اہل ہیں اگر ملک غلام محمد جیسا غیر متوازن آدمی گورنر جنرل بن سکتا ہے اور سکندر مرزا جیسا سازشی اور غیر محب الوطن آدمی صدر پاکستان بن سکتا ہے تو وہ ان دونوں سے کہیں بہتر ہیں۔ صدر ایوب خان نے نہایت خاموشی سے شخصیات اور سسٹم کی خرابیوں کا مشاہدہ کیا کمزور اور نازک مقامات پر سرخ دائرے لگائے اور نقب لگانے پر کمر بستہ ہو گئے۔ انہوں نے غلام محمد کو مجلس آئین ساز توڑنے سے روکا نہ سکندر مرزا کو آئین توڑنے سے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اقدامات صریحاً غیر آئینی' غیراصولی اور بدنیتی پر مبنی ہیں اور وہ ایسی پوزیشن میں تھے کہ ان غیر جمہوری اقدامات کے خلاف اپنے عہدے کا دباؤ استعمال کر سکتے تھے' لیکن رہی سہی جمہوریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے سو وہ خاموش رہے اور غلطیوں پہ غلطیاں ہوتے دیکھتے رہے کہ ان کا اقتدار ان کی صلاحیتوں سے زیادہ دوسروں کی غلطیوں سے وابستہ تھا۔

1950 کے عشرے میں مشرق وسطی میں کامیاب فوجی انقلابات نے ایوب خان کو اپنی مہم جوئی کا مزید جواز فراہم کر دیا' جھجک دور کر دی اور ان کا جھاکا اتار دیا' وہ نڈر اور شیر ہوتے گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ایوب خان کو کبھی گھاس ڈالی نہ منہ لگایا لیکن بعد میں صورت حال ایوب خان کی موافقت میں بدلتی گئی۔ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اپنی کمی اور کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ایوب خان کے سامنے سرنگوں رویہ اپنا لیا۔ وہ لیاقت علی خان کی آنکھ کا تارا' غلام محمد کی ناک کا بال اور سکندر مرزا کے لاڈو بنے رہے نہ وہ کسی کو مشورہ دیتے نہ کسی پہ

تنقید کرتے بلکہ تنقیدی نظر سے یہ دیکھتے رہتے کہ ان مخصوص حالات میں انہیں خود کیا کرنا ہو گا۔

اس طویل دورانیئے کی ریہرسل سے انہیں بہت فائدہ پہنچا وہ جب اقتدار پر قابض ہوئے تو ان کے اقدامات' چہرے مہرے اور لہجے سے جو اعتماد جھلکتا تھا وہ اسی سوچی سمجھی پیش بندی اور طویل منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔

ایوب خان جب اقتدار پر قابض ہوئے تو مسائل کا واحد حل خالص اور مزید جمہوریت تھا لیکن اس کی بجائے وہ بنیادی جمہوریت کے جس کتابی نظریے سے لیس ہو کر میدان میں اترے اس کی تشریح' توضیح اور بسم اللہ ہی غلط تھی' ان کا بنیادی جمہوریت کا نظریہ بیسک ڈیماکریسی کی بجائے کنٹرولڈ ڈیما کریسی سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا' حقائق کی غیر حقیقی تشریح اور مرض کی منصوعی تخصیص سے چھ نکات کے عفریت کو ہی تخلیق کیا جا سکتا تھا جو بالآخر ہو کر رہا۔

پختہ عمر کی رنڈیوں کے رجھائے ہوئے جنرل آغا محمد یحییٰ خان اور اسی قماش کے ان کے مصاحب جرنیلوں کو نہ تو حکومت چلانے اور ملک بنانے کا اعزاز دیا جا سکتا ہے نہ ملک توڑنے کا الزام کہ ایسے لوگوں کا عروج اور آئیڈیل' نامحرم تجربے کار عورتوں کی صحبت اور محفل ناؤ نوش' ہاؤ ہو' چکن تکہ اور مصالحہ کباب سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی سزا کا جوتیوں والا ہار محض یحییٰ خان کی گردن میں ڈال دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا وہ اکیلے ہی اس کے واحد حقدار نہیں ہیں مشرقی پاکستان کے سانحے کا اصل بیج صدر ایوب خان بہ مقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخابات کے میدان میں بویا گیا تھا۔

یہ کیسی اور کونسی بنیادی جمہوریت تھی کہ پاکستان کے اکثریتی حصے کے

عوام نے صدر ایوب خان کے خلاف دل کھول کر ووٹ ڈالے مگر اس کے باوجود بھی ان کی صدر ایوب خان سے جان نہ چھوٹی وہی ان پر مسلط رہے صدر ایوب خان سے جان چھڑانے کے قصے نے اتنا طول کھینچا کہ اس کھینچا تانی میں ملک دو نیم' نظریہ دولخت اور نیم برہنہ بنیادی جمہوریت الف برہنہ ہو گئی۔

صدر ایوب خان کے بنیادی جمہوریت کے نظریے اور اطلاق سے ملک اور معاشرے پر جو گزری سو گزری ان کی دوسری کارگزاریاں بھی اس سے کچھ کم ناکام اور ناکارہ نہیں تھیں انہوں نے اپنے عہد اقتدار میں جو کارنامے انجام دیئے اور معرکے سر کئے ان میں بنیادی جمہوریت کے تجربے کے علاوہ بھی کئی کارہائے نمایاں شامل ہیں جن میں مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے دفاع کی باطل' بچکانہ اور ناقابل عمل تھیوری' 1962ء کا آئین' 1965ء کی جنگ میں شکست فاش' بی ڈی ممبروں کا تعارفی ننگ اور صنعتی و معاشی ترقی کم اور اس کی تشہیر زیادہ شامل ہیں۔ نوزائیدہ پاکستان کے دفاعی معاملات پر ایوب خان پہلے دن سے ہی پوری طرح حاوی رہے فوج کی از سر نو تنظیم' تربیت' پھیلاؤ اور دفاعی منصوبہ بندی ان کے ہی زیر اثر رہی۔

مشرقی پاکستان کے دفاع کے مشکل مسئلے کو انہوں نے ایک بہت آسان اور کم خرچ نظریے سے حل کر دیا کہ ضرورت پڑنے پر مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا لیکن اس کاغذی اور باطل نظریے پر بھی کوئی کام کیا گیا نہ کوئی منصوبہ بندی ہوئی' نہ بجٹ' نہ پیسہ' نہ پلان' نہ تیاری مگر نظریہ حاضر' کارروائی پوری اور چیپٹر کلوز۔

صدر ایوب خان اپنے مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران اچھی طرح جان چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع اپنے مخصوص جغرافیائی' ثقافتی اور علاقائی

حالات و رحجان کی وجہ سے مغربی پاکستان کے دفاع سے بھی کہیں مشکل ہے۔ وہ دفاعی وسائل کے مناسب اور مساویانہ تقسیم کے کسی بھی فارمولے کو بنیاد نہ بنا سکے اور اس انتہائی اہمیت کے مسئلے سے آنکھیں چراتے رہے نہ ان سے کسی نے پوچھا' نہ انہوں نے بتانے کی زحمت کی کہ آخر مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہو گا ہی کیسے' یہ کون کرے گا اور کیسے ہو گا؟ اس بارے میں جنرل ایوب خان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا گیا۔ وقت آنے پر ایوب خان اعتماد پر پورے اترے نہ ان کا دفاعی نظریہ۔

مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کا دفاع تو کیا ہوتا یہاں تو مغربی پاکستان بچانا ہی مشکل ہو گیا' جان کے لالے پڑ گئے' بھگدڑ مچ گئی' فوج کی ہوا اور فوجی قیادت کے پاؤں اکھڑ گئے' سانس پھول گیا' رنگ پیلا پڑ گیا' بلے بلے کے ترانے گانے والیاں بہہ جا بہہ جا کے طربیے الاپنے لگیں حتی کہ ایوب خان کا پروان چڑھا اور بج لگا باطل نظریہ پلٹن میدان کی تقریب ہتھیار رکھواؤ میں دفن ہو گیا۔

جس طرح سال بہ سال اور موقع بہ موقع گھر سے بھاگتے رہنے والی ارجمند بانو کے والدین اس کے گھر سے بھاگ جانے کو اس کی نا سمجھی' نا تجربہ کاری' اس کا باتوں میں آجانا سے منسوب کر کے واردات کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اسی طرح فوجیوں کی سیاسی مہم جوئی اور ریاست کے آئین اور ضابطوں سے فوجی چیرہ دستیوں کو نظریہ ضرورت' واحد حل' بہت زیادہ ضرورت' وقتی طور پر' امن عامہ کی بحالی تک اور معینہ مدت جیسے دو رخے اور محتاط الفاظ اور نسبتاً قابل قبول اصطلاحوں کہ جن سے قانون شکنی کی شدت کم اور واردات کی سنگینی اور بھی کم نظر آئے' سے منسوب کر کے عوام اور عدلیہ فوج کے بارے میں ارجمند بانو کے والدین کا سا رویہ اپنائے

ہوئے ہیں حالانکہ فوج کے ابطال اور فوجیوں کے ہاتھوں ریاستی آئین کی حرمت کی پامالی پر ارجمند بانو کے والدین بننے کی نہ تو ضرورت ہی ہے اور نہ گنجائش۔

سول حکومت' آئین کی تقدیس اور بالادستی اور جیسا بھی ہو جمہوری عمل کے قتل عام پر فوجیوں کے سیاسی مہم جوئی کی پر زور مذمت اور راستہ روکا جانا چاہئے۔

افواج پاکستان پر بھی پاکستان ہی کے آئین' قانون اور انہی ضابطوں کا یکساں اطلاق ہونا چاہیئے' جو مملکت کے دوسرے افراد اور اداروں پر نافذ ہیں۔ جنرلوں کی سیاسی مہم جوئی کے کوڑھ کو راستہ دینا' فروغ دینا' اسے تسلیم اور تحسین کہنا' جی آیاں نوں اور مدح بھری کن انکھیوں سے دیکھنا بھی ناجائز اور بڑی والی ح سے سو فیصد حرام ہے۔ ضرورت اور تقاضا یہ ہے کہ حقائق اور سچ کو جانا جائے' تسلیم کیا جائے اور باآواز بلند کہا جائے۔

فیلڈ مارشل ایوب خان سے یہ پوچھا جانا چاہئے تھا کہ اگر مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہی ہو ناقرار پایا تھا تو پھر وقت آنے پر ایسا کیوں نہ ہو سکا؟

ایوب خان صاحب سے پوچھنے کو تو اور بھی بہت کچھ تھا ان سے بہت کچھ پوچھا جا سکتا تھا' پوچھا جانا چاہئے تھا' مگر وہ بہت سستے چھوٹ گئے ان کا یوں سستا چھوٹ جانا ملک اور قوم کو بہت مہنگا پڑا اور ہماری قومی تاریخ کے کئی سوال ہمیشہ کے لئے تشنہ رہ گئے۔

صدر ایوب خان نے جب پسپا ہونا شروع کیا تو سمجھدار اور تجربے کار فوجی کی طرح اپنا عقب محفوظ کر لیا کہ کوئی پیچھے سے حملہ آور نہ ہو سکے وہ خود کو تو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے لیکن قوم اور ملک کو دونیمگی کے

بھنور میں چھوڑ گئے حالانکہ حلف انہوں نے مملکت کی محفوظیت اور آئین کے تحفظ کا ہی اٹھا رکھا تھا۔

جس طرح حمود الرحمٰن کمیشن نے اپنی سفارشات میں جنرل یحییٰ خان پر اقتدار پر زبردستی قبضہ کرنے کے جرم میں مقدمہ چلانے کی سفارش کی تھی، کمیشن کی اسی سفارش میں ایوب خان کو بھی پرویا جا سکتا تھا کہ انہوں نے صریحاً اور ناجائز طور پر اسمبلی کے سپیکر کو اقتدار منتقل کرنے کی بجائے اسے آرمی کے حوالے کر دیا تھا۔

صدر ایوب خان اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا عقب صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ اگر وہ اقتدار نااہلوں، سازشیوں اور اس تماش بین گروہ کے حوالے کر دیں' جس کی قیادت یرقان رنگ آنکھوں والے جنرل آغا محمد یحییٰ خان فرما رہے تھے۔

یوں جانے اور آنے والا دونوں محفوظ ہو گئے

صدر ایوب خان اپنے اقتدار کے شروع سالوں میں تو خاصے محفوظ رہے لیکن محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخاب جیت جانے سے وہ عوام میں اپنا اعتبار ہار گئے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی بجائے اگر وہ کسی اور سے جیت گئے ہوتے تو شاید اس قدر بے آبرو نہ ہوئے ہوتے۔ صدارتی انتخاب جیت جانے سے صدر ایوب خان کو دو بڑے نقصان ہوئے' جن کی وہ کبھی تلافی نہ کر سکے۔

اول یہ کہ 1965ء کے انتخابات تک وہ طبقہ بڑا نمایاں اور متحرک تھا جس نے تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے اس طبقے کی دلبستگی نمایاں تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں انہی لوگوں کا فیصلہ کن ووٹ بنک موجود تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح سے جذباتی

لگاؤ رکھنے والے ان شہری ووٹروں نے اپنی دانست میں ان افراد کو ووٹ دے کر کامیاب کیا تھا کہ جن کا جھکاؤ واضح طور پر حزب مخالف کی طرف تھا لیکن جب بی ڈی ممبروں کا نیلام لگا اور وفاداریاں تبدیل ہونے لگیں تو یہی طبقہ اپنی رائے کی پامالی اور حکومت کی طرف سے اس قدر صریح بد دیانتی پر صدر ایوب خان سے ہمیشہ کے لئے برگشتہ ہو گیا۔ اسی طبقہ نے آگے چل کر سلہٹ سے کراچی تک صدر ایوب خان کا جلوس نکال کر رکھ دیا۔

دوسرا نقصان صدر ایوب خان کو یہ ہوا کہ ان پر سرعام تنقید کا دروازہ کھل گیا۔ ان کے احترام' دبدبے اور دہشت کو گلی گلی چیلنج کیا جانے لگا' وہ اس کے عادی نہیں تھے اور فطرتاً" بھی وہ تنقید سے بہت گھبراتے تھے۔ وہ سب اچھا کے رسیا ہوئے تھے لیکن اب سب اچھا تھا ہی کہاں؟ سو ہوتا یہ کہ اخبار نویسوں کے سیدھے سادے سوال بھی انہیں بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتے۔ انہیں ہر طرف اپنے خلاف سازشیں ہی سازشیں نظر آنے لگیں' دن بدن وہ بے اعتبارے اور غیر فیصلہ کن ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ غیر مشروط اور مکمل طور پر پسپا ہو گئے۔

اپنے عہد کے آخر آخر صدر ایوب خان سورۂ منافقون کی اس آیت کی ہو بہو تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ جس میں ارشاد ہوا وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۝ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ اور جب آپ ان کو دیکھیں تو (شان و شوکت ظاہری کی وجہ سے) ان کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی باتیں سن لیں گو یہ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے لگائی ہوئی کھڑی ہیں ہر غل و پکار کو (خواہ وہ کسی وجہ سے ہو اپنے اوپر پڑنے والی خیال کرنے لگتے ہیں)

کچھ کام صدر ایوب خان نے ایسے بھی ضرور کیئے کہ جن سے ان کے تدبر اور دور اندیشی کا اظہار ہوتا تھا مثلاً وہ شروع میں ہی سمجھ گئے تھے کہ پاکستان میں آبادی کی بے ہنگم شرح افزائش معاشرتی ترقی کے ہر ابھار کو زمین دوز کر دے گی اور اسے مناسب سطح پر رکھنے کے لئے عوام کی آگاہی اور شمولیت ضروری ہے۔ وہ اپنے فوجی جغرافیئے کے حوالے سے فی مربع میل پر آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا تجزیہ کرتے رہتے۔

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو مغربی پاکستان کے ایک مربع میل میں اوسطاً" پچاسی افراد آباد تھے' اسی مربع میل پر 1958ء تک آباد کاری کا دباؤ 121 افراد ہو گیا' جو کہ 1988 میں 360 اور 1998 میں 498 اور اس موجودہ لمحے میں 505 افراد فی مربع میل ہو چکا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے اس بے مہار عفریت کی روک تھام اور منصوبہ بندی کے اقدامات صدر ایوب خان کے ترقیاتی ایجنڈے میں سر فہرست تھے۔ ادھر منصوبہ بندی کے مراکز کے فیتے کاٹے جانے لگے ادھر صدر ایوب خان کے اس اقدام کے خلاف تنقید شروع ہوگئی۔ جو تنقید سے محاذ آرائی تک جا پہنچی۔ سیدھے سادھے مسلمان اور سنی مسلک کے صدر ایوب خان پر جب مذہبی احکام' مسئلے اور مسائل کی پرتیں کھولی گئیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جس کام کو وہ سیدھا سادھا اور بے ضرر سمجھے اسی میں سیاسی ضرر رسانی کے ہزار پہلو پوشیدہ تھے۔

آپس میں ہمیشہ کے جو تم پیزار مذہبی حلقوں کے یک جان اور یک قالب ہو کر صدر ایوب خان پر سنگ زن اور آتش بار ہو جانے سے صدر صاحب نے ہمیشہ کے لئے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ ایسی اصلاحات جو مذہبی معاملات کا روپ دھار لیں' کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ ایسے پھڈے میں کبھی ٹانگ

نہیں اڑانی چاہئے اسی میں بڑی بے عزتی ہوتی ہے' مٹی پلید کر دی جاتی ہے۔ برسوں کی ساکھ اور نیک نامی ایک نعرے میں بہہ جاتی ہے۔ اس تلخ تجربے کے بعد انہوں نے کسی نزاعی' اختلافی اور مذہبی مسئلے میں ہاتھ نہ ڈالا۔

ہر طرح کے مولوی ملوانے، ہر مسلک کے صوفی سیانے اور طرح طرح کے امام، خطیب مؤذّن، صف سنبھال اور چندہ بٹور صدر ایوب خان کے خلاف صف بستہ اور خنجر بکف ہو گئے' حوالوں' فتوؤں' حدیثوں' اقوال' تشریح اور دشنام کا ڈھیر لگ گیا اور صدر ایوب خان کو سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ نماز جمعہ سے پہلے پہلے جن اماموں عالی مقاموں کو تنخواہ اس امید اور یقین پر بانٹ دی جاتی تھی کہ وہ مال یرغمال نمازیوں کے سامنے خاندانی منصوبہ بندی کے پرخچے اور صدر صاحب کے پرزے نہیں اڑائیں گے اور سرکاری تنخواہ کی تازہ بتازہ وصولی کا کچھ تو خیال کریں گے لیکن اس کے باوجود بھی حق کے پرستار نہ جیب میں نئے نئے نوٹوں کو خاطر میں لاتے' نہ اگلے گریڈ میں ترقی کے وعدے کو۔

تمام تر تنقید اور دباؤ کے باوجود بھی صدر ایوب خان اپنے اس پروگرام سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی اس ثابت قدمی سے پاکستان کو بہت فائدہ پہنچا' ورنہ آج جس 48 سیٹر بس میں 80 سواریاں تاڑی جاتی ہیں' وہاں 80 کی بجائے 95 سواریوں کو کھپانا پڑتا۔ یوں تو خیر ہمیں اللہ تعالیٰ نے گنجائش نکالنے' کسر نکالنے' جگہ بنانے اور پاؤں رکھ کر پکا جم جانے کے جس وصف و وسعت سے نوازا ہے' اس کی بدولت سواریاں تو انشاء اللہ 95 بھی کھپالی جائیں گی لیکن تکلیف اور تردّد تو بہرحال ہوتا ہی ہے۔

ہمیں صدر ایوب خان کا ممنون ہونا چاہئے تھا کہ آبادی کی شرح افزائش جسے آج بصورت دیگر چار اعشاریہ سات فیصد سالانہ سے پانچ اعشاریہ دو فیصد

سالانہ کے درمیان ہونا تھا' آج محض تین فیصد سالانہ پر اٹکی ہوئی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے اس سارے قضیئے میں ایک بات جو انتہائی حیران کن اور سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ یہ ہے کہ 1960 کے عشرے میں کوئی مولوی' صوفی' خطیب' واعظ' امام اور فتوی باز ایسا نہیں تھا' جو منصوبہ بندی اور ایوب خان پر بیک وقت حملہ آور نہ ہوا ہو اور 1990 کے عشرے میں ان میں سے کوئی ایسا نہیں ملتا' جو منصوبہ بندی کے اشتہاروں کو شوق اور رغبت سے نہ دیکھتا ہو' اس کے طور طریقوں کو جاننے کی لگن میں مبتلا نہ ہو۔

1960 کے عشرے سے اب تک آبادی میں آٹھ کروڑ افراد کی تبدیلی کے علاوہ اگر مذہب اور احکام الہی میں بھی کوئی تبدیلی آئی ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بات 1960 میں مذہب کے خلاف تھی' آج اس کے خلاف کوئی بھی نعرہ زن نہیں ہے۔ کیا درس قرآن کے نصف دائرے یا اگلی آدھی صف پر محیط اپنے ہی پیدا کردہ بچوں کو دیکھ کر مولوی حضرات کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں یا خفیہ خفیہ کوئی ایسی مذہبی ترمیم آگئی ہے کہ کل تک جو بات قابل گردن زدنی تھی' آج مدح کن ہے۔

کیا کل تک یہ جہالت اور فرصت کے کارن تھا یا آج علم اور مصروفیت کی وجہ سے ہے کہ اب مولوی مسافروں کے سلوکوں کے اندرونی کھیسوں سے ایسی اشیاء برآمد ہوتی ہیں' جو کل تک ممنوع' دوزخ نشان' دائرہ اسلام سے باہر باہر اور عبرت مقام شمار ہوتی تھیں۔

غالباً اب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ امت کی ایسی افراط پر رسول ﷺ بھلا کیا خوش ہوں گے کہ جس افراط پر امت بذات خود ہی شرمسار اور خجل ہو۔

اسی طرح کی ایک اور بے جا تنقید جو صدر ایوب خان کے پورے عرصہ اقتدار میں ان پر جاری رہی ان کے فرزند ارجمند جناب گوہر ایوب خان کے

حوالے سے تھی۔ صدر پاکستان پر الزام لگایا گیا کہ ان کے صاحبزادے صدر کی حیثیت کو مالی فوائد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہا گیا کہ وہ مال بناؤ اور فائدہ کشید ہیں' کبھی انہیں حملہ آور قرار دیا گیا' کبھی شہیدان لیاقت آباد کراچی کا قاتل' کوئی انہیں غنڈہ گرد عناصر کا پشت پناہ کہتا اور کوئی ان پر مستقبل کا صدر زیر تربیت ہونے کا الزام لگاتا' کبھی کبھار خواتین کے اغوا اور آبرو ریزی کے کسی نہ کسی کیس میں بھی انہیں ملوث کر دیا جاتا' سمگلنگ' قانون شکنی' کمیشن' پلاٹ' سرکاری اراضی' خاک اڑانے اور دھول جھونکنے میں بھی وہ نمایاں نظر آتے لیکن ہمارے خیال میں یہ سب کچھ بلاوجہ اور صدر ایوب خان پر محض تنقید روا رکھنے کی غرض سے تھا اور ان الزامات میں کچھ بھی وزن نہیں تھا۔

ثابت کئے جانے والی دستاویزات سے صرف اس قدر ہی ثابت کیا جا سکا ہے کہ 1968 میں گوہر ایوب خان مندرجہ ذیل اداروں کے چیئرمین و ڈائریکٹر تھے اور ان کے اثاثوں کی مالیت کم وبیش چار ملین امریکی ڈالر کے لگ بھگ تھی۔

گندھارا جیپ لمیٹیڈ
ہاشمی کین کمپنی لمیٹیڈ
گوہر حبیب لمیٹیڈ
جانانہ ڈی مالوچو ٹیکسٹائل ملز
اروسہ انوسٹمنٹ لمیٹیڈ

ہم سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان نے بال برابر بھی کوئی کام بددیانتی کا یا غیر قانونی ہرگز نہیں کیا ہو گا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص پر اس قدر بڑے بڑے الزام آئے ہوں اور اس کا خانوادہ عوامی غیض وغضب کی زد میں آچکا ہو' بال بال گنا جا چکا ہو اور پھر بھی اتنے سارے جرائم کرنے والا محفوظ'

مامون، معتبر اور مواخذے کے آرے تلے آنے سے بچا ہوا ہو، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

کیا ماضی کے گوہر ایوب خان آج کے وہی گوہر ایوب خان نہیں ہیں جو کئی بار نمائندگی کے لئے منتخب ہو چکے ہیں، قومی اسمبلی کے سپیکر، وفاقی وزیر، ترجمان پاکستان حتیٰ کہ ایک دفعہ تو مملکت پاکستان ان کے صدر پاکستان بن جانے سے بال بال بچی اور اگر ایسا ہی ہے جو کہ حقیقتاً" ایسے ہی ہے کہ جیسا بیان کیا جاتا ہے تو ایک ایسا فرد جس پر ماضی میں اتنے سنگین الزام لگ چکے ہوں۔ اس قدر اعلیٰ عہدوں پر کیسے فائز ہو سکتا ہے۔ اگر الزامات جھوٹے نہ ہوتے تو کچھ نہ کچھ تو پوچھ پڑتال ہوتی، کوئی نہ کوئی تو شیر دل مائی کا لال، خود بہ خود نوٹس لے لینے والا منصف ہی گویا ہوا ہوتا، کوئی انتخابی عذر داری ہی واگزار کی جاتی، کوئی ایف آئی آر، کوئی پرچہ، کوئی شہادتی، کوئی امر واقع، کوئی وقوعہ کوئی نقشہ، کوئی نہ کوئی تو عدل کی زنجیر کھینچتا ہی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ سو ثابت ہوتا ہے کہ گوہر ایوب خان پر لگائے گئے الزامات بے بنیاد اور محض صدر ایوب خان کو پریشان کرنے کی غرض سے ہی لگائے جاتے تھے۔ پاجامے کا ذکر نہ کیجئے، سمجھو کہ چار ملین ڈالر صدر کے دلبند ہونے کا خراج تھا جو قوم نے خوشی خوشی انہیں دیا۔ الزامات کے بارے میں غالباً" گوہر ایوب خان مقدر کے ایسے سکندر نہیں ہیں جیسا کہ وہ سیاسی و مالی فوائد کے ضمن میں ہیں۔ 1990ء کے عشرے میں بھی کچھ نہ کچھ الزامات ان پر عائد ہوتے رہے ہیں مثلاً وہ کئی طرح کے نادہندہ ہیں۔ جن میں فون اور بجلی کے بلوں کی نادہندگی کے علاوہ غازی ٹیکسٹائل مل کے لئے 16 کروڑ نوے لاکھ کا جو قرضہ لیا گیا وہ کبھی ادا نہیں کیا گیا بلکہ خان صاحب اس قرضے کے نادہندہ ہیں۔ جب کہ پانچ ملین روپیہ کے قرضہ جات انہیں معاف کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی

زرعی اراضی' اسلام آباد میں پلاٹ' کراچی میں کمرشل پلازے' کوٹھیاں' جائیداد' اثاثے ان سب سے گوہر ایوب خان پر ارب پتی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

لال خان عرف شکرا موچی جو 1968 میں ہری پور بس اڈے کے سامنے جوتیاں گانٹھنے کا تھڑا تھامے ہوئے تھا' آج مین بازار ہری پور میں ہزارہ بوٹ ہاؤس کا مالک ہے' کاروباری ہے' کامیاب ہے' ہزاروں ٹیکس کی مد میں حکومت پاکستان کو ادا کرتا ہے' مقامی یتیم خانے کا نائب منتظم ہے اور آسودہ حال ہے۔ کئی ملازم ہیں۔ کچھ الف بستہ ہیں' کچھ بستہ ب کے بھی ہیں۔

گوہر ایوب خان پر جانے کیا افتاد پڑی کہ وہ شکرے موچی سے بھی کم ٹیکس ادا کرتے ہیں' حالانکہ 1968 میں گوہر ایوب خان کے اثاثے چار ملین ڈالر کے تھے جبکہ شکرا موچی کا کل اثاثہ اس کا ہونا ہی تھا' اگر ایک بے آسرا بے سروسامان آدمی ہزارہ جیسے پسماندہ علاقے میں شکرا موچی سے لال خان پروپرائیٹر ہزارہ بوٹ ہاؤس بن سکتا ہے اور ہزاروں ٹیکس کی مد میں حکومت پاکستان کو ادا کرتا ہے تو گوہر ایوب خان کو بھی اپنی ٹیکس ادائیگی پر نظرثانی کرنی چاہئے۔ گوہر ایوب خان نے پچھلے سالوں میں صرف مبلغ تین سو چھ روپیہ ٹیکس ادا کیا ہے' جو کہ پرائمری سکول کے معلم اور کسی کمیٹی کے جونیئر کلرک کے ادا کردہ ٹیکس سے بھی کم ہے۔

گوہر ایوب خان حکمرانوں کے خانوادے سے ہیں۔ صاحب حیثیت' وجیہ' منال مناصب والے اور اثاثے رکھتے ہیں۔ ایٹمی دھماکے پر وزیر خارجہ کی حیثیت سے ان کے تبصرے کو ساری دنیا میں سنا گیا۔ انہیں امریکی ٹی وی پر دیکھ کر ہمارے کئی عمر رسیدہ پروفیسرز کو مرحوم ایوب خان یاد آگئے۔ انہیں دنیا بھر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان کا ایک حوالہ' ایک مقام اور مرتبہ ہے۔ گوہر ایوب خان اسمبلی کے سپیکر جیسے معزز عہدے پر فائز رہ چکے ہیں' وزیر خارجہ

نادہندہ، منتخب نمائندہ سبھی مناصب انہیں حاصل ہو چکے ہیں، مہنگائی کا زمانہ ہے تین سو روپلی میں ہوتا ہی کیا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ ٹیکس کی ادائیگی کو کم ازکم شکرے موچی کی سطح تک تو ضرور بڑھا دیں۔

عین ممکن ہے کہ کبھی کوئی ایسی حکومت بھی آجائے کہ جو احتساب کا سیدھا سادا طریقہ اپنا لے کہ اثاثے اربوں میں اور ٹیکس تین سو روپیہ صرف یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسی حکومت بھی آسکتی ہے کہ جو نہ تو خود ٹیکس چور ہو، نہ کسی کو ٹیکس چرانے دے ایسے قانون اور ضابطے بھی عمل میں لائے جا سکتے ہیں کہ جو ٹیکس چوروں کی چمڑی اتار کے رکھ دیں۔ ان کے اثاثے ضبط کئے جا سکیں اور ان کا بھی مواخذہ کیا جا سکے۔

1930 کے عشرے میں مشہور زمانہ امریکی مجرم، ڈرگ مافیا کا سربراہ، کئی افراد کا قاتل، سمگلر، منشیات فروش، زرعی اراضی کا مالک، پلاٹوں پہ قابض، قرضوں کا نادہندہ، اطالیہ نژاد الکپون جب اور کسی طرح قابو میں نہ آسکا تو اس پر ٹیکس چوری کا بظاہر معمولی مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

الکپون کے لئے ٹیکس کے قاعدے، قانون، مقدمہ قتل کے بحث مباحثوں سے زیادہ سنگین ثابت ہوئے۔ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا اور ٹیکس چوری کے جرم میں گیارہ سال قید بامشقّت وبلا ضمانت آئندہ کی سزا پائی اور اسی قید کے دوران جان بحق ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اگر ہمارے ہاں بھی ٹیکس چوری کوئی جرم ہوتا اور اس پر سزائیں مقرر ہوتیں تو ہماری جیلوں کا پچانوے فیصد الکپونوں سے آباد ہو جاتا، کیسے کیسے الکپون یہاں تاڑے ہوئے ہوتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک، ایک سے ایک برحق، سجیلا، ولی عہد، مال خصال، بزرگوں کی ناموس پر دھبہ، عزت پر بٹہ لگاؤ اور نام ڈبوؤ

ذوالفقار علی بھٹو

ذوالفقار علی بھٹو ہمارے ایسے حکمران رہے ہیں کہ جنہوں نے ہمارے معاشرے' قوم' ریاست اور سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ وسیاست میں ان کے کردار کو شدت سے محسوس کیا جاتا رہے گا خصوصا 1960 اور 1970 کے عشروں میں جو سیاہ بخت عبارت ہمارے منہ اور ماتھے پر لکھی گئی اس عبارت کے تحریر کاروں میں ایک ذوالفقار علی بھٹو بھی تھے۔ تحقیر اور تذلیل کی جس کالک سے ہماری پیشانیوں کو داغ دار کیا گیا' ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ اس کالک سے غیر آلودہ نہیں ہیں۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے براہ راست سیاسی حل میں وہ جو کردار ادا کر سکتے تھے وہ ان کے اقتدار سے منسلک تھا۔ ریاست کی تقسیم کی قیمت پر اقتدار یا غیر منقسم پاکستان میں حزب اختلاف' اس فیصلہ کن گھڑی میں ان کے فیصلے پر دانشمندی اور حب الوطنی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

لالچ اور بدیانتی ان کے مزاج کا حصہ نہ ہونے کے باوجود بھی معاملات شفاف اور بناء لاگ لپیٹ نہیں ہیں۔

انہیں بری الذمہ قرار دے دینے سے معاشرتی جبر' جمہوری دیوالیہ پن اور عوامی حاکمیت کی شکست وریخت کے اسباب بے سبب' عوامل پوشیدہ' ہاتھ خفیہ اور چہرے بے چہرہ رہ جاتے ہیں۔ کام نہیں چلتا' بات نہیں بنتی' جیسے بے گناہ مقتول کی لاش سطح آب پر تیرتی رہتی ہے ایسے ہی ہماری تیرہ بختی کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کا نام ابھرابھر کر سامنے آتا رہتا ہے۔

ان کی شخصیت' نظریاتی رجحان' سیاست اور حکومت ایک ایسی بے عملی کا عمل اور اضداد کا مجموعہ ہے کہ بات کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو ہمارے ملک میں مروج ڈرائنگ روم برانڈ سیاست اور ڈائننگ روم ساختہ سازشی گٹھ جوڑ کے برعکس ایک طوفان بلا خیز کے مصداق قومی منظر پر نمودار ہوئے اور ہمارے سیاسی سیٹ اپ میں ہے جمالو اور دما دم کا پلچ لگا دیا انہوں نے مخالفین کی تضحیک اور حریفوں کی تحقیر کی ایک نئی جہت، ایک نئی انڈسٹری کی بنیاد رکھی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے سیاسی و مذہبی نقطہ نظر سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر ان کی شرافت، بزرگی اور علمیت پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ ابھی ذوالفقار علی بھٹو کی آمد آمد تھی کہ ایک ناچتی ہوئی رنڈی کے جسم پر مولانا صاحب کے باریش چہرے والی تصویر چھپی۔

ہے جمالو۔ مودودی ٹھاہ

یہ بھٹو صاحب کی آمد اور اٹھان تھی

اپنے عہد کے ایسے عظیم الشان عالم بے بدل سے اس بازاری برتاؤ نے آنے والے دنوں کی روا داری اور رکھ رکھاؤ کو عیاں کر دیا۔ سچ پوچھئے تو اسی دن سے ہماری قوم کی تقدیر میں ہے جمالو اور بھٹو صاحب کی ریکھاؤں میں ٹھاہ

لکھ دیا گیا تھا۔ قیاس اغلب ہے کہ مفسر قرآن اور صاحب علم مودودی صاحب کا یوں تمسخر اڑایا جانا نہ صرف اللہ کی بارگاہ میں ناگوار گزرا بلکہ ملک بھر میں سنجیدہ طبقے نے اس کا نوٹس لیا اسے معیوب جانا اور دل برداشتہ ہوئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی کامرانیوں کے جلو میں ایک بے نام' دبے پاؤں' ساتھ ساتھ چلنے والی تیرہ بختی اور موت فگن انجام بھی پہلو بہ پہلو چلتا رہا۔

مولانا میاں طفیل محمد کے ساتھ جس طرح کا سلوک روا رکھا گیا اس کے ذکر سے ہی میاں طفیل آب دیدہ اور بے چین ہو جاتے ہیں اس واقعے سے جو شرمندگی اور بربریت وابستہ ہے اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا صاحب اس واقعے کا تذکرہ کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں یہ بھٹو صاحب کا عروج تھا۔

جو سانحہ مولانا میاں طفیل کے ساتھ پیش آیا یہ یقیناً" بارگاہ الہٰی میں قابل تعزیر ٹھہرا ہو گا کہ اس دن کے بعد سے ذوالفقار علی بھٹو کے پاؤں تلے زمین سرکنی اور سکڑنی شروع ہو گئی تھی وہ پھر کہیں ٹھہر نہیں سکے' ان کی حالت ان معتوب زدوں کی سی ہو گئی تھی کہ جنہوں نے محنت اور امید سے کھیت' کھلیان' فصلیں اور باغ اگائے اور جب وہ ان کی یافت سمیٹنے نکلے تو نہ وہاں باغ تھے نہ فصلیں نہ کھیت نہ کھلیان نہ نام نہ نشان

معتوب و مقہور ہونے میں بھلا دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

جب ہماری شان دار مسلح افواج کئی بار پنجاب یونیورسٹی کیمپس' مال روڈ لاہور' کمیٹی چوک روالپنڈی' جامع کراچی کے ہوسٹلز' سندھ یونیورسٹی اور چانڈکا میڈیکل کالج فتح کر چکیں تو افواج پاکستان نے ان پہلے سے ہی مفتوحہ علاقوں کو ایک بار پھر فتح کر لینے سے انکار کر دیا۔ فوجیوں کو دفعتاً" خیال گزرا کہ مسلح افواج کے لئے بیرونی علاقے اور پرائے لوگوں پر غلبہ پانا زیادہ مناسب ہوتا

ہے۔ فوجی حسب سابق ماتھے پر گولی مارنے کی بجائے پاؤں میں یا ہوا میں گولیاں چلاتے تھے لیکن اس کے باوجود نوجوانوں کے لاشے تھے کہ ہر لحظ گرتے تھے اور شمار بڑھتا جاتا تھا۔

جہاں پناہ کے لئے کوئی جائے پناہ تھی نہ جائے امان۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو کا آخر آخر تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے مخصوص نفسیاتی عوامل کا ان کے کردار اور اعمال پر گہرا اثر تھا وہ اپنے آزردہ' افسردہ تنہا اور غیر یقینی بچپن اور لڑکپن کے حصار سے کبھی باہر نہ آسکے۔ ذہنی تحفظات' غیر محفوظیت اور دوسروں پہ بے اعتمادی ان کے پس منظر سے پیش منظر تک نمایاں رہی اپنے بھائیوں کی جواں مرگی سے انہیں یہ شدید احساس رہتا کہ وہ بھی زیادہ عمر نہیں پائیں گے اور ان کے پاس وقت بہت کم ہے ان کی غیر قانع فطرت نے انہیں کبھی چین نہ لینے دیا جو کچھ وہ حاصل کر لیتے اس پر صبر شکر اور اس سے بہترین نتائج حاصل کرنے کی بجائے وہ مزید آگے کو دیکھنے لگتے اس مزید آگے دیکھنے کی عادت نے انہیں ایسی جگہ لاکھڑا کیا کہ جہاں آگے دیکھنے کو نشیب' اندھیرے اور ڈوبتی ڈولتی پرچھائیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو انقلابیوں کی مخصوص رومان پسندی اور آئیڈیل ازم کا اظہار کرتے اور دوسری طرف اسی رومان پسندی کے حامل افراد کے خلاف مورچہ لگا لیتے۔ my way or no way کے غیر جمہوری فارمولے کے مسلسل استعمال سے وہ حلقہ جانثاراں سے نکل کر گدھ گروہ میں گھر گئے۔ وہ انقلابی اور بنیادی تبدیلیوں کی بات کرتے لیکن انہی تبدیلیوں کی راہ میں مزاحم ہو جاتے وہ جس طبقے کے مفادات کے خلاف بظاہر برسرپیکار تھے حقیقتاً" وہی طبقہ ان کا ہمرکاب اور ہمجول تھا۔

ان کی طبیعت کا تضاد لمحہ بہ لمحہ جھلکتا رہتا تھا وہ بنیادی طور پر جرات مند' تندخو' منہ پھٹ اور زبان بے قابو آدمی تھے۔ جب ان کی جرات مندی جوبن پر ہوتی تو وہ جمی کارٹر' ہنری کسنجر' اندرا گاندھی اور رضا شاہ پہلوی کے سامنے خم ٹھونک کے کھڑے ہو جاتے اور جب ان پر ان کی غیر محفوظیت اور لاچارگی یلغار کرتی تو مصطفیٰ کھر، احمد رضا خان قصوری اور میاں افتخار تاری جیسے سیاسی بوزنے انہیں آگے لگا لیتے انہیں زِچ کر دیتے۔

کابینہ کے اجلاسوں اور پارٹی میٹنگز سے وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف واک آؤٹ کر جاتے' کبھی روھانسے ہو جاتے' کبھی لاجواب' کبھی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دیتے کبھی مستقلاً لاڑکانہ میں مقیم ہو جانے کا شوشہ چھوڑتے۔

المیہ یہ تھا کہ ان کے ہاتھوں کوئی محفوظ نہیں تھا نہ ان کے سیاسی نائبین' نہ مقربین' نہ عوام اور نہ خواص اپنے غیر محفوظ ہونے کا انتقام انہوں نے ہر اس فرد سے لیا جس سے لے سکتے تھے۔ نجی محفلوں میں ان کے مصاحبین کی بیگمات تک ان کے الفاظ کے نشتر اور لہجے کی کاٹ سے محفوظ نہیں تھیں وہ حاضرین مجلس میں سے جس کا بھی چاہتے ملمع اتار دیتے' دھجیاں بکھیر دیتے اس سے محظوظ ہوتے اور ایک خاص طرح کے احساس تفاخر سے مزین مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہو جاتی۔ وہ اپنے مقربین کے ذاتی معاملات میں خاصی دلچسپی لیتے کہ کس کی شادی کس سے مناسب رہے گی' کس کو طلاق ہوئی چاہیے' کس کی بیوی ناموزوں ہے' کس نیک پروین پر کون فریفتہ ہے فلانے کی شریک حیات اس شراکت داری سے پہلے بلا شرکت غیرے کس کی داشتہ اور کس کی دلنواز رہ چکی ہے۔ وہ پہلے اس بارے میں اپنی طنز آلود رائے کا اظہار کرتے' اس میں سنجیدہ ہو جاتے اور پھر اس کی

تکمیل کو اپنی انا کا مسئلہ اور متعلقہ فرد کی خود سے وفاداری کا پیمانہ بنا لیتے' ان کے اس معیار پر پورا نہ اترنے والا معتوب ٹھہرا دیا جاتا۔

یہ تاثر بے بنیاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہو جانے والے اراکین کسی نظریاتی کھچ کے باعث علیحدہ ہوئے جہاں سرے سے کوئی نظریہ ہی نہ ہو وہاں اس سے اختلاف ہی کسے اور کیسے ہو سکتا ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر' غلام مصطفیٰ جتوئی اور عبدالحفیظ پیرزادہ کسی نظریاتی یا اصولی اختلاف کی بناء پر نہیں بلکہ ذاتی اور مفاداتی تنازعے کے باعث علیحدہ ہوئے۔ اس طرح کے خلیفوں کے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ یہ لوگ کسی نظریے سے مخلص' کسی اصول پہ متفق اور سنجیدہ ہو سکتے ہیں' نسبتاً جن لوگوں کے مفادات' سودے بازی اور لوٹ مار کے معاملات وجہ تنازعہ نہیں بنے وہ بھٹو صاحب کے الفاظ کی کاٹ سے کٹ گئے ان افراد میں ڈاکٹر مبشر حسن' خورشید حسن میر' ملک معراج خالد اور محمود علی قصوری جیسے افراد شامل تھے۔

ہندوستان سے ایک ہزار سال تک لڑنے کا عہد' جوہری ہتھیاروں کے حصول میں ثابت قدمی اور اصولی موقف' ایوب خان کی آمریت کے خلاف سینہ سپر ہو جانا' روایتی سیاسی جغادریوں کے خلاف عوام کو موبائیل کر دینا اور جنرل ضیاء الحق کے سامنے سرنگوں نہ ہونے کے واقعات بلاشبہ ذوالفقار علی بھٹو کی جرأت مندی کے مظہر ہیں' ان واقعات کے پس منظر میں حقیقتاً" ایک جرات مند اور دلیر آدمی کا ذہن کارفرما ہے لیکن اس وقت ان کی جرأتمندی اور دلیری جواب دے جاتی کہ جب انہیں اپنے الفاظ اور زبان پر قابو رکھنے کا مرحلہ درپیش ہوتا۔ لاکھوں کے مجمع میں وہ مخالفین کو سرعام ایسی ایسی گالیوں سے نوازتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے خصوصاً" ان خواتین کے منہ شرم

سے زیادہ سرخ ہو جاتے جن کے پاس منہ ڈھانپنے کا معقول انتظام نہ ہوتا۔

اپنی ہی پارٹی کے ورکرز اور عہدیداروں سے ملتے ہوئے ان پر تند خوئی کا دورہ پڑ جاتا' وہ کرسی کو ٹھڈے مارتے کبھی میز پر مکے مارنے لگتے' پانی کے آدھ بھرے گلاس کو وہ مخاطب کے منہ کے سامنے لہراتے رہتے جس سے وہ اس دباؤ میں مبتلا رہتا کہ کسی بھی وقت وہ گلاس کو اس کے سر پر دے ماریں گے۔ ملاقاتی کی زیادہ توجہ ان کے الفاظ کی بجائے ان کے ہاتھ کی حرکت پر مرکوز رہتی۔ ایسی ملاقاتوں کے دوران پارٹی کے عہدے داروں اور ورکرز کی سٹی گم ہو جاتی اور اس کی جھاڑ پھونک' تنزلی یا معطلی کے بعد اسے محتاط رہنے کی تلقین کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا۔ پیپلز پارٹی کے ہمیشہ کے سینئر وائس چیئرمین شیخ رشید سے لے کر پارٹی کے لیے یومیہ اجرت پر نعرے مارنے والے تک' ایسی ملاقاتوں کے شرف سے سبھی باریاب ہوئے کچھ کو ایسی ملاقاتوں کا شرف دوسروں سے زیادہ ملا اور جو اس باریابی کی تاب نہ لاسکے وہ معراج محمد خان بن گئے۔

یہ بھٹو صاحب کا عوام سے قربت اور ہمدردی کا معیار تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے بلاشبہ بہت محنت' جانفشانی اور تن دہی سے پاکستان کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں ان کے لفظوں اور لہجے سے اخلاص کی بو آتی تھی' لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کایا پلٹ گئی۔ ان کے افعال پر آئی چلائی' چھینا جھپٹی' غیر جمہوری رویئے' مک مکا اور مصالحت کا رنگ غالب آگیا۔

بڑی بڑی اصلاحات، حساس اقدامات اور تبدیلیاں کسی ریسرچ، ہوم ورک، منصوبہ بندی اور چھان بین کے بغیر محض آئی چلائی کے زور پر نافذ کر دی گئیں جن کے ہماری معیشت پر بڑے دور رس منفی اثرات مرتب ہوئے۔

صنعتوں کو قومیائے جانے کا عمل، جس بے عملی اور تدبیری سے انجام

دیا گیا اور جو خرابی اس قومیائے جانے سے وابستہ کر دی گئی تھی آج ربع صدی بعد بھی وہ خرابی دور نہیں کی جا سکی ہے نہ کی جا سکے گی ان خرابیوں کے دور کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں' تیسری کوئی نہیں اول یہ کہ چرنوبل کے ایٹمی پلانٹ کی طرح سیمنٹ سریے کی بہت موٹی تہ سے ان صنعتوں' کارخانوں اور فیکٹریوں کی اساس میں حلول بد دیانتی اور لوٹ مار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈھانپ دیا جائے یا دوئم یہ کہ ان صنعتوں کو نجی ہاتھوں میں' پرائیویٹ سیکٹر میں واپس کر دیا جائے جب تک مجوزہ دو میں سے ایک حل کا اطلاق نہیں کر لیا جاتا عوام کی گردنیں آئی چلائی کی اسی رسی سے بدستور بندھی رہیں گی جس سے کہ بندھی ہوئی ہیں۔

صنعتوں کو قومیائے جانے کا عمل بذات خود اس قدر منفی اثرات کا حامل نہیں تھا جتنا کہ بے عملی اور بدنیتی سے اسے بنا دیا گیا' ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتوں کو قومیائے جانے کے کئی معیشت اور ملکوں میں مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں لیکن ہمارے ہاں قومیائے جانے کی پالیسی نے ہماری معیشت کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ منافع میں چلنے والی بڑی بڑی صنعتیں دیکھتے ہی دیکھتے سفید ہاتھیوں میں بدل گئیں اور حکومت کا اربوں روپیہ سالانہ بھی اس بگاڑ کو سہارا نہ دے سکا۔ اس خرابی کی بنیادی وجہ بھٹو حکومت کی وہ جلد بازی' بے عملی اور بدتدبیری ہے کہ جس کی وجہ سے اس حکومت کے بیشتر اقدامات عوام اور ریاست کے خلاف ثابت ہوئے۔

قومیائے جانے والے صنعتی اداروں پر بیوروکریسی کے NON PRODUCTIVE' جدید مالیاتی ومعاشی رحجانات سے بے بہرہ' پیپر ورک کے مارے ہوئے' ضابطوں کے پروردہ' دستخط کرنے میں یکتا اور خسارے کے بجٹ میں سانس لینے کے عادی ماہرین کو مسلط کر دیا گیا اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ قومیائے جانیوالے صنعتی اداروں کے یہ نئے سربراہ صنعتی پیدواری یونٹس کو حکومت کے غیر پیداواری محکموں اور خسارے میں چلنے والے اداروں کی طرح ہانکنے لگے۔ TASK ORIENTED مینیجرز کی جگہ PROCEDURE ORIENTED ایم ڈیز مسلط کرنے سے یہی نتائج نکل سکتے تھے' اداروں کے ان نئے سربراہوں کی نظر ادارے کی شرح منافع کی بجائے ضابطوں کے اطلاق پر مرکوز رہی۔ پیداواری لیڈر شپ کی سرگرمی اور گہما گہمی سے عاری ان کاغذی ماہرین نے ان صنعتی اداروں کو اپنی ذاتی جاگیروں اور چھوٹی چھوٹی ایمپائرز میں بدل دیا۔

لاٹری اور لوٹ مار کے اس تازہ بتازہ کثیر مال کو دیکھ کر یہ لوگ بوکھلا گئے' بیگمات ادارے کے ریسٹ ہاؤسز پر قابض ہو گئیں اور بیٹے سرکاری گاڑیاں لے اڑے' گھریلو تقریبات اور روزانہ کی ہونے والی ایمرجینسیز کے لئے ادارے کا ہیلی کوپٹر محو پرواز رہنے لگا۔ عزیز اقرباء مشینری اور پرزے بیچنے پر لگ گئے اور احباب نے ادارے کے پیداواری مال کو بلیک مارکیٹ میں بیچنے کا محاذ سنبھال لیا' صاحب نے ادارے کی متعلقہ اراضی' کمیشن' ڈیلرز اور لیبر یونین جیسے معاملات سنبھال لئے۔ صاحب کو ملنے والی ہر بڑی کمیشن پر محفل میلاد منعقد کی جانے لگی اور مبارکبادیوں کا زور بندھ گیا۔ صاحبزادیوں نے غیر ملکی دوروں میں اپنے ہینڈ بیگز میں سوئمنگ کاسٹیوم رکھنے شروع کر دیئے اور صاحبزادوں نے ماڈلنگ کلب جوائن کر لئے' اہل وعیال گرمی کی چھٹیاں یورپ میں گزارنے لگے اور رمضان المبارک حرمین شریفین میں' سرکاری فون' ٹیلکس اور فیکس پر شاپنگ کی فہرستیں بھیجی جانے لگیں اور سودے طے ہونے لگے۔ نھّو' کاشف' بجیلے اور عمرانہ کا عقیقہ اسلام آباد کلب میں' آمین لندن میں' تقریب روزہ کشائی حرم مکہ اور گریجویشن سٹینفورڈ امریکہ سے ہونے

لگی۔

مال غنیمت کی اتنی زیادہ مقدار دیکھ کر جن لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اب وہی حضرات اپنی لوٹ مار کی صلاحیتوں اور سرعت پر حیران تھے کہ عشروں میں جس ادارے کو منافع بخش' معیاری اور دیرپا بنایا گیا تھا' مہینوں میں ہی اس ادارے کے واجبات کروڑوں میں ہو گئے۔

قوم کو صدر ایوب خان صاحب سے ورثے میں ملنے والے بدنام زمانہ بائیس خاندانوں میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کم ازکم مزید تین سو ایسے خاندانوں کا اضافہ ہوا کہ جن کی قوت خرید اس قدر زیادہ کہ ملک ہی خرید لیں، معیشت پر گرفت ایسی مضبوط کہ جب چاہیں اسے تہہ و بالا کردیں، پہیہ جام کر دیں اور کساد میں مبتلا کر دیں۔ قوت ایسی کہ بھٹو جیسے عوامی رہنما کو نکیل ڈال دیں' لاچار کردیں اور گھٹنوں کے بل بٹھا دیں۔

صدر ایوب خان کے دور کے بائیس خاندانوں کی مناپلی ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں OLIGOPOLY میں بدل گئی۔ علم اقتصاد کے بیشتر ماہرین اس صورت حال کو معاشرے اور معیشت کے لئے مناپلی سے زیادہ خطرناک قرار دیتے ہیں چونکہ وسائل اور دولت کا ارتکاز ایسی صورت حال میں حریف کی گردن کاٹنے کی بجائے حریف کو تحفظ دینے پر آمادہ کرتا ہے' اکساتا ہے جس کا منطقی نتیجہ ایسے بدنیت ارتکازی سرمایہ داروں کے اکٹھ' گٹھ جوڑ' تعاون اور افراط کی صورت میں نکلتا ہے کہ جہاں ٹیکس چوری کے نت نئے طریقے' پرائس فکسنگ' رشوت کے نئے معیار' ملاوٹ کی نت نئی ٹیکنالوجی' دھاندلی کے نئے طریقوں، ذخیرہ اندوزی، طلب اور رسد کے توازن میں بگاڑ اور اشیاء کی غیر معیاری کوالٹی میں سب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور ایک دوسرے کو رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

ہماری معیشت اور معاشرہ انہی بددیانتوں کے اصول بقائے باہمی کی زد میں ہے۔

بدعنوان اور بددیانت اپنے دوسرے بھائی بندوں کو اس امید پر تحفظ فراہم کرتا رہتا ہے کہ برے وقت میں اسے بھی کوئی تحفظ دے سکے۔ اس طرح سے معاشرے میں ایک ایسی مضبوط کرپشن مافیا وجود میں آگئی ہے کہ جسے احتساب بیورو' آرڈی نینس' شریعت بل' تحقیقاتی ایجنسیز اور ضابطوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا چونکہ بدعنوانی کو ختم کرنے پر جو مامور ہیں حقیقتاً وہی تو اس کے محافظ اور فروغ کار ہیں۔

امریکہ کے گزشتہ صدارتی انتخابات میں آزاد صدارتی امیدوار راس پیرو نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایک بات بڑی دل لگتی کہی تھی انہوں نے اپنے حریفوں صدر بل کلنٹن اور سینیٹر باب ڈول کے بارے میں کہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے مسائل ختم نہیں کر سکتے۔ ہمارے مسائل کا حل ان کے پاس نہیں ہے اور وہ اس لئے کہ یہی لوگ تو ہمارے مسائل کی جڑ ہیں' لہٰذا جو لوگ بذات خود مسئلہ ہوں وہ کسی مسئلے کو کیونکر ختم کر سکتے ہیں۔ صدر کلنٹن اور باب ڈول امریکی مسائل کی جڑ ہوں یا نہ ہوں لیکن راس پیرو کی یہ بات ہمارے اوپر بہت صادق آتی ہے' کلک کر کے فٹ بیٹھتی ہے کہ ہمارا مقتدر طبقہ خواہ کوئی سا بھی ہو حالیہ یا گذشتہ' ہمارے مسائل کی جڑ اور معاشرے کا اصل مسئلہ ہی یہ کوڑھ زدہ اور کوڑھ فروغ قیادت ہے۔

بدعنوانی کے فروغ کار بدعنوانی کو ہی کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ ذوالفقار علی بھٹو کی پیدا کردہ اس OLIGOPOLY نے ہر پیداواری اور منفعت بخش انڈسٹری پر ایک خون آشام عفریت مسلط کر دیا۔ جس معیشت پر پہلے صرف بائیس خون چوس مسلط تھے وہاں مزید تین سو کے اضافے نے عوام کے نزار

بدن سے لہو کا آخری قطرہ بھی کشید کر لینے کی صنعت کو خوب پروان چڑھایا۔

معاشی میدان میں ذوالفقار علی بھٹو کو کام کرنے کے لئے ایوب خان صاحب کا تخلیق کردہ مناپلی کا پراسرار' راز دارانہ مگر نسبتاً مستحکم معاشی ورثہ ملا جیسا کہ ان سے امید کی جارہی تھی کہ وہ صنعتی بنیاد کو مزید استوار کریں گے وسعت دیں گے اور معاشی مساوات کو عام کریں گے یہی ان کا نعرہ بھی تھا اور یہی نظریہ بھی لیکن جب کچھ کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے قومیائے جانے کے ایک ایسے فرسودہ اور متنازعہ پروگرام پر عمل شروع کر دیا کہ جس میں ہمارے لئے ہر طرح سے خسارہ ہی خسارہ تھا۔

نیشنلائزیشن کی افادیت ایک سیاسی نعرے سے سوا کچھ بھی نہیں تھی' موجودہ صدی کے آغاز میں قومیائے جانے کا نظریہ نصف صدی بعد نہ صرف اپنی افادیت کھو چکا تھا بلکہ اسے رد کیا جا چکا تھا' جہاں جہاں یہ نظریہ نافذ تھا وہیں وہیں معاشی بدحالی نمایاں تھی' واقفان حال کا تخمینہ یہ تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نیشنلائزیشن کی غلطی نہیں کریں گے اور وہ اسے محض ایک پولیٹکل بلف کے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن حیرت ہوئی کہ ذوالفقار علی بھٹو جنہیں جدید علوم سے بہرہ مند کہا جاتا تھا وہ اس ناکارہ اور ناکام نظریے پر کیسے فریفتہ ہو گئے۔ جو معیشتیں نیشنلائزیشن کی رسی سے بندھی ہوئی بڑی مشکل سے تنفس بحال رکھے ہوئے تھیں وہ اس سے اپنی رسی تڑوانے کی تدبیریں کر رہی تھیں اور ہمارا سیاسی دانشور ہماری گردن کو اسی رسی سے باندھنے پر کمر باندھ چکا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی معاشی پالیسیز کا کوئی ثمر تو عوام کو کیا ملتا مگر ان کے عہد حکومت کی معاشی بد تدبیریوں سے ملک میں پلوٹو کریسی (PLUTOCRACY) ضرور قائم ہو گئی۔

جب وہ معزول ہوئے تو کچھ لوگ موازنے میں لگ گئے کہ ان کے آنے پر کیا تھا اور جاتے وقت کیا بچا ہے ان موازنہ کاروں کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ میلوں میل نہ کسی معاشی مساوات کا نشان ملتا تھا نہ کسی اور مساوات کا۔ نہ مساوت محمدی کا کہیں شائبہ گزرتا تھا نہ کسی بھی تعمیری تبدیلی کا۔ بھٹو صاحب کے عہد سے البتہ یہ عقدہ ضرور وا ہوا کہ عوام طاقت کا سرچشمہ تو ضرور ہیں مگر صرف انتخاباتی طاقت کا' محض منتخب کر دینے کی حد تک۔

کسی کا انتخاب کر لیتے ہی عوام کی طاقت کا چشمہ خشک اور سوتا سو جاتا ہے۔

بھٹو حکومت کے بیشتر اقدامات اور اصلاحات کا کسی بھی منصوبہ بندی اور سوچ بچار کے بغیر اچانک اعلان کر دیا جاتا' مستفید ہونے والے خاموشی سے استفادے میں مصروف ہو جاتے اور عوام تالیاں بجاتے رہتے' کئی بار تو یوں ہوتا کہ ان اصلاحات اور پالیسیز کی ناقص منصوبہ بندی اور مضحکہ خیز تضاد کو عریاں ہونے میں کوئی دیر نہ لگتی مثلاً" بھٹو صاحب کے وفاقی وزیر تعلیم اور دست راست جناب عبدالحفیظ پیر زادہ نے جب عوامی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا تو انہوں نے کہا کہ ہر کارخانہ دار' فیکٹری اور مل مالکان کے لئے یہ لازم قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر کارکن کے ایک بچے کو میٹرک تک تعلیم دلانے کا ذمہ دار ہو گا اور اس ضمن میں تمام اخراجات برداشت کرے گا ان کے اس اعلان پر ابھی تالیاں ہی بجائی جا رہی تھیں کہ انہوں نے اگلے ہی لمحے یہ کہتے ہوئے صورت حال کو خاصا مضحکہ خیز کر دیا کہ میٹرک تک تعلیم ہی مفت کر دی گئی ہے اور ہر بچہ کم ازکم میٹرک تک مفت تعلیم حاصل کر سکے گا (حالانکہ ہمارے ہاں میٹرک تک تعلیم ہمیشہ سے ہی مفت رہی ہے)۔

اب جبکہ آپ نے میٹرک تک تعلیم کو ہی مفت قرار دے دیا تو مل مالکان کارکنوں کے بچوں کو کیا دلاتے۔ جو سہولت ریاست کی طرف سے ہی میسر آرہی ہے اس میں مل مالکان کی مہربانی اور ذمہ داری کا بج لگانا پیرزادہ کی آئی چلائی' لفاظی اور عوام کو بیوقوف بنانے کی ایسی بدنما مثال تھی جو بھٹو صاحب کے پورے دور حکومت کی علامتی کارگزاری کی نمائندہ تھی۔

قومیائے جانے کے ناکارہ نظریے پر بھٹو صاحب کی فریفتگی نے ان کے وزراء کو بھی اسی طرح سوچنے پر اکسایا کہ وہ بھی اپنی اپنی وزارتوں میں اتھل پتھل کر دیں' تھرتھلی مچا دیں اور نئے نئے چاند چڑھائیں اس کی بہت واضح مثال شیخ رشید وفاقی وزیر صحت برائے عوامی حکومت کی دوائیوں کی جنرک پالیسی تھی۔

صحت کے ماتھے مگر نظریے' مزاحمت اور اقدامات کے شیر شیخ رشید جب کابینہ اجلاسوں میں اپنے ساتھی وزراء کی ریشہ دوانیوں اور بھٹو صاحب کی جھاڑیں کھا کھا کر تنگ آگئے تو انہوں نے یکایک اپنے انقلابی ہونے کے ثبوت میں جنرک دوائیوں کے تیر کو عوام کے سینے میں ترازو کر دیا۔ ثابت شدہ ناکام نظریے کو پھر سے آزمائش کی سان پر لگا دیا۔ پہلے مہینے ہی میں کروڑوں ضائع ہو گئے' وزارت صحت کا سال بھر کا بجٹ مہینوں میں ختم ہوگیا مگر جنرک دوائیوں کی گڈی نہ چڑھ کے دی' کچھ دوائیاں بنانے والی مافیا سوٹیکل نے نہ چڑھنے دی۔

جب لعن طعن' دوائیوں کی قیمتیں اور قلت ایک ساتھ بڑھی تو وزیر مذکورہ نے خاموشی سے اپنی جنرک پالیسی پر خود ہی خط تنسیخ پھیرا' اپنی ہی کاوشوں پر لعنت بھیجی' تائب ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ عمر بھر کی کار گزاریوں اور پھرتیوں پر تھکن کا ایسا غلبہ چھا گیا کہ شیخ صاحب کے تخل پھر

کبھی ہرے نہ ہو سکے۔

قومی خزانے سے کروڑوں گئے سو گئے مگر کچھ کر گزرنے کا شوق اور انقلابی ہونے کا دعوی تو پورا ہو گیا۔

بیٹا پھانسی چڑھا سو چڑھا قانون کا تو پتہ چل گیا' جہالت کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی تعصب' تنگ نظری' ذہنی تنگدستی اور نہ جاننے کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے اور غلط فیصلے کرنے کے امکان زیادہ ہو جاتے ہیں اور جہالت کا زیادہ نقصان اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ پوشیدہ ہو بظاہر نظر نہ آتی ہو اور فیصلے کرنے کی کلید لاعلموں کے ہاتھ ہو' جہالت کو چھپائے رکھنے میں وقتی کامیابی ہی اصل میں ہمیشہ کی بڑی ناکامی ہوتی ہے۔

صاف نظر آنے والی جہالت اور پوشیدہ جہالت کے ماحول اور معاشروں کا المیہ ہی یہ ہے کہ جو بھی اور جہاں سے بھی فرسودہ نظریہ ملا اسے تسلیم کر لیا' ناکارہ اقدامات اور تنسیخ شدہ پراسس کو حرز جاں بنا لیا اور ناکام ضابطے گلے لگا لئے بلکہ گلے ڈال لئے' کہیں سے پرانے کمپیوٹر خرید لئے' کہیں سے دوائیاں' کوئی ری پراسیسنگ پلانٹ پر فریفتہ ہو گیا کوئی توپ کے ری کنڈیشنڈ گولوں پر ریجھ گیا اور کوئی رشین ٹریکٹرز پر مچھر گیا۔

آج کل کی تعلیم یافتگی کو صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت سے منسلک کر دیا گیا ہے اور لیڈر شپ کی کامیابی ناپنے کی اکائی مقرر کر دی گئی ہے' دونوں طرح کی یافت کو مرئی پیمانے سے ناپنے کا اصول رائج ہو گیا ہے۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ جس کامیابی کا دعوی کیا جا رہا ہے اسے نظر بھی آنا چاہئے' وہ ناپنے کے قابل اور وزن کئے جانے کے وصف سے آراستہ ہو' ٹھوس ہو اور اس پر انگلی رکھی جا سکے۔

حکومت پاکستان کو ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO)' جاپان سو.. ن اور

کینیڈا کی حکومتوں اور انفرادی طور پر کئی ماہرین نے متنبہ کر دیا تھا کہ جنرک دوائیوں کی بیل منڈھے نہیں چڑھے گی' یہ نسخہ کئی جگہ اور کئی بار آزمایا بھی جا چکا ہے اور دفنایا بھی جا چکا ہے مگر عوامی حکومت کے ایوانوں میں انقلابیت کا ایسا ہنگامہ برپا تھا کہ معقولیت کی ہر آواز دب دب جاتی تھی ہر عمل عوامی' اقدامات انقلابی' سوچ ڈسکو اور شب و روز پر ہے جمالو حاوی ہو گیا ہو' تو ایسے میں کچھ بھی سننے کا امکان ہی کس قدر ہوتا ہے۔

ساؤ تھمپٹن یونیورسٹی انگلینڈ اور سندھ مسلم لاء کالج میں بین الاقوامی قانون کا نوجوان ذہین و فطین پروفیسر' عوام کا نباض اور خواص کا دلدار جب مک مکا اور مصالحت کے منحوس دائرے میں گردش کرنے لگا تو بھٹو صاحب کے سیدھے سادھے اعمال بھی اخلاص اور قبولیت سے عاری ہوتے گئے۔ ان کے افعال کی قبولیت کا وقت' الفاظ کا بھرم اور نیت پر اعتماد ایک ساتھ رخصت ہوئے۔

شخصی آمریت کا بالعموم اور منطقی انجام یہی ہوتا ہے۔

شروع میں عوام ایک سادہ' بے ضرر اور مختصر مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ چلے جایئے اب آپ کی ضرورت نہیں رہی' آپ ہمارا اعتماد ہار چکے ہیں' ہم آپ کی جگہ کسی اور کو لانا چاہتے ہیں' آپ آزمائے جا چکے ہیں آپ بھی اپنے پیش رو سے مختلف نہیں ہیں۔ اس مطالبے کو ریاستی طاقت اور شخصی جبر سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے ادھر عوام ضد میں آجاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جناب اب آپ کو جانا ہی پڑے گا' آپ کا جانا ٹھہرایا جا چکا ہے' یوں پھڈا پڑ جاتا ہے' سر پھٹول ہوتی ہے' ایک طرف سے جس قدر گولیاں چلائی جاتی ہیں دوسرے طرف سے اسی قدر سینے ان گولیوں کو کھانے کے لئے وا ہو جاتے ہیں۔

ناحق خون کا بہنا مقتدر کے جانے پر مہر ثبت کر دیتا ہے جب ذوالفقار علی بھٹو نے یہ تسلیم کیا کہ از سر نو انتخابات مانتا ہوں اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اس طرح کی تاخیر اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے رضا شاہ پہلوی بھی ایک سہ پہر یہ مان گئے کہ میں تاج و تخت سے دستبردار ہوتا ہوں ایوب خان نے بہتیرا یقین دلایا کہ میں آئندہ صدارتی انتخابات میں امیدوار نہیں ہوں گا' فرنینڈ و مارکوس یہی کہتے رہے کہ بس مجھے یہ مدت پوری کر لینے دو میرا مال متاع بھی مملکت کے حوالے میں چلا جاؤں گا میں خود جاتا ہوں مگر کسی کی ایک نہ سنی گئی۔

قبولیت کا شرف اور دراز رسی کی طوالت ختم ہو جائے تو ہر جتن بے سود' ہر حیلہ حرام اور کوشش اکارت چلی جاتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو جیسا باخبر عوامی سیاستدان' محنتی' جزئیات پہ نظر رکھنے اور ملاقاتیوں کے نام تک یاد رکھنے والا بیدار مغز شخص یقین نہیں آتا کہ ایسا غبی اور بے دھیانا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پاکستان آرمی کے نااہل ترین جرنیلوں کے ٹولے سے مات کھا گیا جو بات کسی بھی صاحب فہم کو نظر آرہی تھی ذوالفقار علی بھٹو کو کیوں نظر نہ آسکی۔ پی این اے سے مذاکرات جوں جوں طویل ہوتے جا رہے تھے مارشل لا کا خطرہ بڑھتا جاتا تھا انہیں مارشل لا لگواؤ ایئر مارشل کی سرگرمیاں نظر آئیں نہ اپنے ہی ساتھیوں کی پراسرار خاموشی' وہ ان جان لیوا اور فیصلہ کن مذاکرات کو چو این لائی مذاکراتی فارمولے کے اصول پر بڑھاتے رہے کہ صرف اس قدر دو اور اتنا ہی مانو کہ مخالف مذاکرات کی میز پر بیٹھا رہے اور مذاکرات کا پراسس جاری رہے۔

ان جاگتے رہو راتوں میں وہ نسبتاً زیادہ سوتے' لاپروائی کا مظاہرہ کرتے اور بے فکرا نظر آنے کی کوشش کرتے' ادھر شب خون مارنے والا گروہ اپنے ہی

ملک کی حکومت تسخیر کر لینے کی آخری تفصیلات طے کر رہا تھا ادھر شیخ زید بن سلطان النہیان کے مہمان خانہ خاص میں بحرینی ساحل کے فرائی کئے ہوئے شرمپس اور نارنجی چونچ والے کمیاب تیتر کے گوشت کی ڈشنز سے بھٹو صاحب کی خاطرمدارات کی جا رہی تھیں۔

جب بھی کسی تاریخ ساز فیصلے کی گھڑی آئی ذوالفقار علی بھٹو اپنے منصب کے شایان شان کبھی فیصلہ نہ کر سکے عوام کو ان سے جو امیدیں اور اعتماد تھا وہ اس پر کبھی پورا نہ اترے' ایسے موقعوں پر انہیں زکام لگ جاتا' کبھی وہ اسہال میں مبتلا ہو جاتے' مشرقی پاکستان کی آخری ہچکی سے ذرا پہلے پولینڈ کی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق سیاسی تصفیئے کی دستاویز کے ساتھ انہوں نے جس قدر غیر مہذب اور غیر سفارتی رویہ اختیار کیا اس نے ایک عالم کو حیرت زدہ کر دیا' اس کے فوراً بعد وہ زکام میں مبتلا ہو گئے۔

جب تک ہماری حمیت کا جنازہ اور عزت نفس کا جلوس نہیں نکال دیا گیا وہ شفایاب نہ ہو سکے۔

17 دسمبر کو سقوط مشرقی پاکستان پر جنرل نیازی کا ہتھیار ڈالنا محض ایک منطقی اور رسمی کاروائی کے بجز کچھ بھی نہیں تھا حقیقتاً" مشرقی حصے کی جنگ ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں ہاری ورنہ عالمی اور سفارتی حلقوں میں ان جیسا بااثر آدمی پولینڈ کی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی قرار داد کو تنکے سے تختے میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی طرح جب وہ شیخ مجیب الرحمن سے مذاکرات بلکہ مک مکا کے لئے ڈھاکہ تشریف لے گئے تو وہ اسہال میں مبتلا ہو گئے' پاکستان آرمی کے ہاتھوں جب تک پاکستانیوں کا قتل عام شروع نہیں ہو گیا شیخ صاحب سے وہ کسی سنجیدہ مذاکرات کی بجائے اسی عارضے میں مبتلا رہے۔

شیخ مجیب الرحمن پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا الزام' الزام کی حد تک تو شائد ٹھیک ہو مگر اس سے زیادہ ناانصافی' اپنے سر سے بلا ٹالنے والی اور خود فریبی میں مبتلا رکھنے والی بات ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے پولیس مقابلے میں مارے جانے والے ڈاکو پر ہر اس ڈاکے کی ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے جس میں پولیس کسی اور ڈاکو کو نامزد نہ کر سکی ہو' کسی اور کو الزام نہ دے سکی ہو۔ مشرقی پاکستان کو اس وقت بنگلہ دیش بننے سے صرف ایک شخص روک سکتا تھا اور وہ ذوالفقار علی بھٹو تھے' مشرقی پاکستان سے سیاسی تصفیئے کے لئے جس اخلاص اور قربانی کی ضرورت تھی وہ ذوالفقار علی بھٹو میں مفقود تھی۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو اس فیصلہ کن گھڑی میں بے غرضی' اخلاص اور پاکستان اساس پر فیصلہ کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن کو غیر مشروط اقتدار منتقل ہونے کی راہ میں مزاحم نہ ہوتے تو وہ ہماری تاریخ کا دھارا موڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

یہ تو عین ممکن ہے کہ پاکستان کو توڑنے میں ذوالفقار علی بھٹو براہ راست اس قدر ملوث نہ ہوں کہ جس قدر ان پر الزام ہے لیکن یہ حقیقتاً" ہے کہ پاکستان کو متحد رکھنے میں وہ جتنا بڑا کردار ادا کر سکتے تھے وہ اس سے گریزاں رہے۔ خود کو سرِاقتدار دیکھنے کی خاطر انہوں نے ہر وہ جتن کیا اور جوکھم جھیلا کہ بالآخر جس کا انجام بنگلہ دیش کی صورت میں ظاہر ہوا' شیخ مجیب الرحمن اور بھٹو صاحب اقتدار میں آ گئے' اندرا گاندھی کو دوام حاصل ہوا۔ اکثر کے پو بارہ اور بیشتر کی موجیں لگ گئیں۔

پاکستان کی شکست وریخت سے کسی کی جے جے اور کسی کی بلّے بلّے وابستہ تھی لیکن اس جے جے اور بلّے بلّے کے بین السطور مستفید ہونے والوں کے لئے جو المیہ' اندوہناک انجام اور عبرت پوشیدہ تھی وہ اس سے بے

خبر تھے۔ بھٹو صاحب نے جتنی سعی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کرانے میں کی اگر وہ اس سے صرف آدھی سعی بنگلہ دیش نہ بننے کے ضمن میں کر لیتے تو وہ اس میں سرخرو ہو سکتے تھے۔

وہ جس کا موضوع خاص پولیٹیکل ہسٹری' جدید علوم اور ریاستی قوانین تھے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس شخص کی تاریخ پر نظر گہری' مشاہدہ کامل اور سیاست پر عبور حاصل ہے جب ان عوامی خوش فہمیوں پر پورا اترنے کا وقت آیا تو بھٹو صاحب ہر مرحلے پر ہتھیار بند اور دفاعی ہوتے گئے حتیٰ کہ پسپائی اختیار کر لی۔

خالص قتل کے مقدمے کو سیاسی مقدمے کے رنگ میں ڈھالنے سے ان پر قتل کے الزام کا دفاع نہ کیا جا سکا اور سیاسی الزامات کے دفاع کے لئے عدالت عالیہ وعدالت عظمیٰ مناسب پلیٹ فارم نہیں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کو نہ قتل کے الزام سے بچایا جا سکا نہ سیاسی الزامات سے۔ کئی طرح کے قوانین پر دسترس رکھنے والا ایک سیدھی سادھی قانونی بات بھی نہ سمجھ سکا۔ بھٹو صاحب یہ جاننے میں ناکام رہے کہ انہیں گھیر گھار کر عدالتی اور قانونی قتل کی طرف لے جایا جا رہا ہے جب کہ وہ خالص انصاف کے کوشاں رہے۔ نہ وہ سیاسی طور پر جالندھری کنکشن کے مربوط نیٹ ورک کو سمجھ سکے جو ان کے خلاف سرگرم عمل تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو عدالت میں تمام وقت اپنی جبری سبکدوشی' بے گناہی اور عوام کی طاقت کے زعم میں مبتلا رہتے۔ غصے میں بھرے ہوئے بھٹو کو جسٹس مولوی مشتاق جب بھی چاہتے مزید مشتعل کر دیتے یوں مولوی مشتاق حسین کی عدالت میں مقدمہ قتل کی کارروائی فریقین کی جملہ بازی' کھینچا تانی' بے اعتمادی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں پوری ہو گئی۔ مقدمہ

قتل کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا یہ الگ بات کہ انصاف بھی ہوا کہ نہیں جیسا کہ بعد میں جسٹس مولوی مشتاق نے خود بھی یہ تسلیم کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے میں فیصلہ تو قانون کے مطابق ہوا لیکن انصاف نہیں ہو سکا۔ حالانکہ مہذب دنیا میں عدالتی فیصلوں کی روح انصاف سے مزین ہوتی ہے قانون سے نہیں۔ قانون تو محض حصول انصاف کی کاوش میں ان ضابطوں کے مجموعہ کا نام ہے جن کے اطلاق سے انصاف کو ممکن، میسّر حتمی اور یقینی بنایا جا سکے۔

نام کے مولوی اور منصب کے چیف جسٹس یہ اقرار کرتے ہوئے یہ بھی بھول گئے کہ وہ جس دین کے نام لیوا ہیں اس کے نظام عدل میں اولیت و آخریت صرف اور صرف انصاف کو حاصل ہے اور اگر انصاف ہی نہ ہو سکا تو ایسے قانون کی حیثیت اس بھاری پتھر سے زیادہ نہیں ہے کہ جسے مقتول کی لاش کے ساتھ باندھ کر پانی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو قانون انصاف ہی نہ دلا سکے، انصاف کا ضامن ہی نہ ہو اس قانون کے مطابق فیصلہ اور اس قانون کے اطلاق کا سہرا مولوی مشتاق حسین جیسے منصف کے منہ پر نہ صرف خوب سجتا ہے بلکہ سر چڑھ کے بولتا بھی ہے۔

سپریم کورٹ میں بھی مقدمے کے ابتدائی دنوں میں بھٹو صاحب نے اپنی لاہور ہائی کورٹ والی روش برقرار رکھی، وہ بدستور قتل کے الزام کا دفاع اپنی سیاسی خدمات کے حوالے سے کرتے رہے، جب انہیں حالات کی سنگینی کا ادراک ہوا اور انہوں نے سنجیدگی سے قتل کے الزام کا دفاع کرنا چاہا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔

لاکھوں کے مجمع کو مسحور کر دینے والا پانچ سات لوگوں پر اپنی بے گناہی بھی ثابت نہ کر سکا، میلوں میل عوام کے جلوسوں پر قادر ذوالفقار علی بھٹو کے

حق میں ایک بھی ایسا جلوس نہ نکل سکا جو انصاف کے قتل پر احتجاج کر سکتا' مزاحم ہو سکتا اور دباؤ ڈال سکتا۔

تاریخ پر گہری نظر رکھنے والا ہی تاریخ کے دہرائے جانے کی زد میں آگیا' مکافات عمل کا تقاضا تھا یا مشیت ایزدی یہی تھی کہ وہ کوتاہ قامت جرنیلوں' بکاؤ سیاستدانوں' جہنم کا ایندھن جیسے سرمایہ کاروں اور اپنی ہی آستین میں پالے ہوئے سیاسی بچونگڑوں کی گھاتیں نہ سمجھ سکا حالانکہ وہ خود بھی کبھی انہی پینتروں اور چالوں کا چیمپئن اور تخلیق کار رہ چکا تھا۔

صدر ایوب خان کے غیر جمہوری تابوت میں بنیادی حقوق' شہری آزادیوں' انتخابات اور بحالی جمہوریت کی پہلی اور آخری کیل ٹھونکنے والے ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے وہ جب ایوب خان کے خلاف سربکف ہوئے تو وہ اپنے ایک ہاتھ میں اسلامی سوشلزم کا تریاق اور دوسرے ہاتھ میں جمہوریت کا امرت دھارا اٹھائے ہوئے تھے اس ناطے سے ان پر جمہوری رویے اور جمہوریت کی بلّے بلّے کی نسبتاً زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی' 1970ء کے انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو ہی وہ واحد سیاستدان تھے جو احیائے جمہوریت اور بحالی جمہوریت کی بات دوسرے ریاکاروں سے زیادہ کرتے تھے' بھٹو صاحب نے اپنا امیج ایک جمہوری اور عوامی رہنما کاسا بنا لیا تھا۔ عوام ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ جمہوری رویے اور روایات کو فروغ دیں گے وہ کہتے بھی یہی تھے حتیٰ کہ وہ جمہوریت کو اپنے سیاسی سلوگن کی اساس بنا چکے تھے۔

یورپ اور امریکہ میں ان کی تعلیم وتربیت سے یہ گمان گزرتا تھا کہ بھٹو صاحب وہاں کے جمہوری ماحول کے جرثوموں کی کاشت کے لئے مناسب زمین اور وقت کے انتظار میں ہیں اور انتخابات میں واضح کامیابی سے انہیں زمین اور وقت میسر آچکا تھا۔ لیکن ہماری روایتی بدقسمتی ایک بار پھر آڑے آگئی' انتخاباتی

نتائج کی اگلی صبح ہی ذوالفقار علی بھٹو ایک بالکل مختلف انسان تھے ان کے جمہوری نظریے' رجحان' اٹھان اور ساری توقعات ایک ہی رات میں بدل گئیں' ذوالفقار علی بھٹو نے 1970 کے عشرے میں جس قدر بڑے بڑے غیر جمہوری کام کئے اور کروائے اس سے لگتا تھا کہ 70 کے عشرے میں ان سے بڑا جمہوریت مخالف اور جمہوریت کش اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہو گا۔

اکثریت کی کسی بھی جمہوری تعریف اور معیار سے شیخ مجیب الرحمن کو منتقلی اقتدار کی راہ میں بھٹو صاحب کا مزاحم ہو جانا ریاست کے لئے اور ریاست میں جمہوریت کے فروغ کے لئے خطرے کی گھنٹی نہیں بلکہ سور اسرافیل تھا' ذوالفقار علی بھٹو' شیخ مجیب الرحمن کی راہ میں نہیں بلکہ جمہوریت کی راہ میں مزاحم ہوئے اور پوری شدت سے ہوئے۔ جمہوریت کے خلاف اپنے پہلے مزاحمتی رویے سے اپنے آخری مزاحمتی رویے تک وہ جمہوریت کو بار بار قتل کرنے کے مرتکب ہوتے رہے۔

انہوں نے پیپلزپارٹی کو حکومتی پارٹی بنا کر اس قدر فائدہ نہیں پہنچایا جتنا کہ پیپلز پارٹی کو غیر جمہوری بنا کر نقصان پہنچا دیا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے اندر انتخابات کی بجائے نامزدگی' سازش اور پریشر گروپس کی راہ ہموار کر کے پارٹی کی روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر جمہوری بنا دیا۔ انہوں نے پیپلزپارٹی کو جمہوری گھوڑی سے غیر جمہوری خچر میں بدل دیا۔

پیپلزپارٹی کا اصل المیہ ہی یہ ہے کہ وہاں انتخابات منعقد نہ ہونے کی وجہ سے قیادت آپس میں دست وگریباں اور کارکن ایک دوسرے پہ سنگ زن رہتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے خوفزدہ اور بدگمانی میں مبتلا رہتا ہے کہ جانے کب' کون' کس کا نامزد' کس کا فرنٹ مین اور کس کی بیک لیڈی نکل آئے۔

پیپلز پارٹی کو سٹیٹس کو' کی کھونٹی پہ ٹانگنے کے بعد بھٹو صاحب نے سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں پر جس انداز سے شب خون مارا' اس سے ان سب خوش فہموں کی غلط فہمی تک دور ہو گئی جو بھٹو صاحب کے جمہوری رحجان اور رویے کے بارے میں خوش لسان رہتے تھے۔ سرحد اور بلوچستان کی آئینی اور منتخب حکومتوں کی برطرفی کے خلاف متوقع اور شدید رد عمل کے فقدان نے بھٹو صاحب کو شیر کر دیا وہ اپنے غیر جمہوری رویے میں دلیر اور شخصی رویے میں دیدہ دلیر ہوتے گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ذہنی وفطری صلاحیتوں کا بہترین اظہار ان کی سیاست کی بجائے ان کے قلم سے ہوا' شدید ذہنی دباؤ' وقت کی کمی اور ہر ساعت شمار ساعتوں میں بھی ان کے اندر کا نڈر' بے فکرا' حرف ساز اور دلیر آدمی صفحہ بہ صفحہ نظر آتا ہے' محسوس ہوتا ہے اور سر چڑھ کے بولتا ہے انہوں نے جواب دعویٰ لکھا اور خوب لکھا۔ مارشل لاء کے جواز اور مارشل لا حکومت کے انہوں نے پرخچے اڑا دیئے' اپنے اوپر انتخابی دھاندلی کے الزام کو کم از کم انہوں نے کاغذی حد تک تو بالکل دھو دیا۔ "اگر میں قتل کر دیا گیا" میں طنز زکاوت' لفظوں کی کاٹ' مثالیں' اسلوب اور ان سب کو شاعرانہ تخیل میں سمو دینے سے انیسویں صدی کے آخر کے وہ برطانوی مصنف یاد آجاتے ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کے ترقی پسندانہ اسلوب نگاری کی نئی راہیں متعین کی تھیں۔

کتابوں پر تنقید اور تبصرے کے ماہرین کہتے ہیں کہ "اگر میں قتل کر دیا گیا" کی ادبی حیثیت اس کی سیاسی حیثیت سے زیادہ مستند اور دیرپا ثابت ہو سکتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا سیاست کے میدان میں جو سب سے بڑا کارنامہ اور

عظیم الشان کامیابی ہے اس کا ادراک اور اقرار اسی قدر کم کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں مروج' سازش آلودہ سیاست کو ڈرائنگ رومز سے نکال کر گلی' محلوں' چوباروں اور چوپالوں کے بیچوں بیچ لاکر انتخابی سیاست سے وابستہ کر دینا انہی کا کام تھا۔ عوام کو یہ تجربہ پہلی بار ہوا کہ ان کے ووٹ کی حیثیت' مطالبے کی قوت' جلوس کا دباؤ اور انتخابات میں ان کی رائے کی کیا حیثیت ہے۔ جبر' استحصال اور مسلسل نظرانداز طبقے کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ ان کے نہ چاہنے کے باوجود ہر دفعہ کا اسمبلیوں میں براجمان ہو جانے والا خائن اور انسانی لہو کا ذائقہ شناس اگر وہ نہ چاہیں تو اب مزید منتخب نہیں ہو سکتا' 1970 کے انتخابات میں ایسے ایسے سورما منہ کے بل گرے کہ جن کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ جغادر کبھی اپنے حلقے سے بھی ہار سکتا ہے۔

عوامی سطح پر سیاسی بیداری کی جو تحریک بھٹو صاحب نے چلائی اس نے مستقبل کے کئی طالع آزماؤں کے پر کاٹ دیئے' عدالتوں سے مارشل لا کے مردے کو جائز قرار دیئے جانے کے باوجود اس مردار پر عوامی سنگ باری کے جاری رہنے کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو فراخدلی سے دیا جانا چاہئے یہ ان کی عوامی سیاست کا سب سے مثبت اور دیر پا پہلو ہے۔

ہتھ ہولا رکھنے کے عمومی معاشرتی رجحان سے ذوالفقار علی بھٹو کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ ان پر یہ الزام تو لگایا گیا کہ وہ مملکت پاکستان کو دونیم کرنے میں شریک ہیں جس کی انہوں نے کبھی صفائی پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی چونکہ وہ جانتے تھے کہ ان پر یہ الزام کبھی ثابت نہیں کیا جا سکے گا البتہ جو ان پر ثابت کیا جا سکتا تھا اس کا الزام بھی ان پر نہ لگایا جا سکا۔ بھٹو صاحب پر ملک توڑنے کے الزام کی نوعیت درست نہیں تھی۔ جو جرم حقیقتاً ان سے سرزد ہوا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوق اقتدار میں ملک کے بٹوارے کی راہ

میں مزاحم نہیں ہوئے حالانکہ ہو سکتے تھے۔

ہمارے ہاں عائد کردہ الزامات کی نوعیت اکثر و بیشتر ایسے ہی غیر حقیقی ہوتی ہے اور اس سے متعلقین کو بہت فائدہ پہنچتا ہے وہ صاف بچ نکلتے ہیں اس کی مثال سانگلہ ہل کے بنک میں ڈاکہ ڈالنے والے ڈاکو پر اس الزام کی طرح ہے کہ اس پر ماچھی گوٹھ میں مسافر بس لوٹنے کی فرد جرم عائد کر دی جائے حالانکہ اس ڈاکو سے ماچھی گوٹھ میں بس لوٹنے کا جرم سرزد ہی نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو الزام عائد کیا گیا وہ جرم اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا اور جو جرم اس نے کیا تھا وہ سامنے ہی نہیں لایا جا سکا لہٰذا وہ دونوں سے صاف بچ گیا۔ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ الزامات کی نوعیت کو قصداً" یا کسی بھی مصلحت سے شروع سے ہی غیر حقیقی اور افسانوی بنا دیا جاتا ہے۔ جب ایف آئی آر ہی ماچھی گوٹھ مارکہ اور قصوری ساختہ ہو تو اس سے اسی نوعیت کے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جیسا کہ ہوتے رہے ہیں۔

ہمارے ہاں عموماً یہی ہوتا ہے خصوصاً سیاسی الزامات ان سیاسی جرائم سے یکسر مختلف ہوتے ہیں جو متعلقین سے سرزد ہوئے ہوتے ہیں سو کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوتا اور سب بچ نکلتے ہیں مثلاً محترمہ بے نظیر بھٹو پر بحالی جمہوریت کے الزام کی نسبت خاندانی اقتدار کی بحالی کا جرم زیادہ موزوں لگتا ہے۔ وہ جس غیر جمہوری اور بھدے طریقے سے پیپلز پارٹی پر مسلط ہوئیں اور ذوالفقار علی بھٹو کی طرح جمہوریت کو بے آبرو کرنے کی مرتکب ہوئیں اس کے پیش نظر بھی بحالی جمہوریت کا سنجیدہ الزام ان پر نہیں آنا چاہئے تھا۔

جنرل ضیاء الحق بھی اسی طرح کے غیر حقیقی الزام تلے آگئے کہ وہ اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ اسلامی نظام کے نفاذ کی ایسی روک تھام کر گئے ہیں کہ موجودہ فرقہ واریت اور مسلک سازی کے پیش نظر اگر اسلام کا

نفاذ ہمارے ہاں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور لگتا ہے۔ سورۃ الانعام میں ارشاد ربانی ہے اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بعض یعنی (اللہ ہی اس پر قدرت رکھتا ہے) کہ تمہیں گروہ در گروہ بانٹ کر گروہوں کو ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شاید یہی واحد ایسی دعا ہو گی کہ جو شرف قبولیت سے محروم رہی جو انہوں نے مسلمانوں کے گروہی چپقلش سے محفوظ رہنے کے لئے فرمائی تھی۔ لہٰذا یہ اندیشہ اور خسارہ تو ہمیشہ سے مروج اور موجود رہا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ آپس میں ہی باہمی نفاق وانتشار میں مبتلا رہیں گے مگر ہمارے ہاں جنرل ضیاالحق کے دور سے پہلے مذہب کے نام پر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے کی روایت بھولے بسرے' اتفاقاً' کبھی کبھی اور کہیں کہیں ہی تھی جو کہ جنرل صاحب کی نفاذ اسلام کی روک تھام کوششوں سے اب اعلانیہ' بر سرعام اور جگہ جگہ ہے جنرل ضیاء الحق ہمارے حق میں قرآن میں دی گئی نفاق کی بشارت کا جواز' ثبوت اور باعث تکمیل ثابت ہوئے لیکن سہرا ان کے سر پر نفاذ اسلام اور اسلام سے اخلاص کا ہی بندھا ہوا ہے۔

میاں نواز شریف بھی اسی طرح کے غیر حقیقی الزام کی زد میں ہیں ان سے امید باندھی گئی کہ وہ چونکہ ذاتی حیثیت میں انتہائی کامیاب بزنس مین ہیں معاشیات اور اقتصادیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ پیداوار' سرمایہ کاری' یافت اور ترقیاتی منصوبوں کے باہمی ناطے کو سمجھتے ہیں وہ اقتصادی چمتکار جانتے ہیں کہ مٹی کو بھی ہاتھ لگا دیں تو وہ سونا بن جاتی ہے' فرض کر لیا گیا کہ ان کی اس معجزاتی صلاحیت سے قوم کو بھی کچھ فائدہ ہو گا لیکن انہوں نے بھی اس غلط فہم الزام کو دور کرنے میں دیر نہ لگائی خسارے کی مسلسل سرمایہ کاری اور بھاری شرح سود کے بڑے بڑے قرضوں کے حصول سے انہوں نے ثابت

کر دیا کہ ان کی صلاحیت قرضے لے لینے اور انہیں دبا لینے سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ میاں صاحب نے سونا اگلتی زمین کو بھوک اگلتی اور بھوکے ننگلتی زمین میں بدل کے اپنے اوپر لگے اس الزام کی تردید کر دی کہ معاشیات سے ان کا دور پرے کا بھی کوئی واسطہ ہے۔

فرض کر لیجئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک سوال کا جواب دینے کی مہلت ہو اور ان سے کہا جائے کہ اپنے عہد اقتدار کی کسی ایک کامیابی، حصول اور یافت پر انگلی رکھ دیجئے تو وہ کس سمت اشارہ کر سکیں گے، کیا کہیں گے اور اپنی انگلی کہاں رکھیں گے؟

گروہ شب بیدار و طائفہ عمرہ گزار

ضیاء الحق مرحوم کی شخصیت کے اوصاف الجھے ہوئے' پیچیدہ' بظاہر ناقابل فہم اور گنجلک ہونے کے باوجود اپنے مقصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ ان کی شخصیت کے گنجل پن کو ان کی مطلب براری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مضبوط اور پرسکون اعصاب رکھنے والے حملہ آور کی طرح ضیاء الحق نے بڑی احتیاط سے اپنی طویل المدت اقتدار کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو ہوشمندی اور ہنرمندی سے رفع کیا' چھوٹی موٹی رکاوٹوں سے نہ وہ دل برداشتہ ہوئے نہ حوصلہ ہارا' اپنی کسی تضحیک پر شرمندہ ہوئے نہ معاشرے پر اپنے نحس اثرات سے دل گرفتہ، وہ اپنے پینترے مناسب وقت پر عین وقت پر بدلتے رہے۔ ان کے مصالحانہ طرز عمل کا ایک زمانہ گواہ اور منافقانہ رویے کا ایک عالم زخم خوردہ ہے۔

وہ جس سے گردن خم کر کے گھٹنے جوڑ کے اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے ملتے اسی کو سولی پہ لٹکا دینے کی شہرت رکھتے ہیں۔

دور دراز کے علاقوں سے جو دل زدہ ضعیف خواتین اپنے بیٹوں' بھائیوں

اور عزیزوں کی کوڑوں کی سزا میں تخفیف اور پھانسی سے بریت کی درخواستیں لے کر ایوان صدر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتیں ان کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر مدارت کی جاتی انہیں مرغ بریانی اور قیمے کے سموسے پیش کیے جاتے' دودھ ملا روح افزاء پلایا جاتا مگر ان کی رحم کی درخواستوں پر سزا پر فوری عمل درآمد کے احکام جاری کر دیئے جاتے۔ ابھی یہ غمزدہ مائیں اور بہنیں گھر واپس بھی نہ پہنچ پاتیں کہ سزا پر عمل درآمد ہو چکا ہوتا۔ اکثر اوقات کوڑوں سے کوڑایا ہوا بدن' مقتول کا لاشہ اور رحم کے طلب گار سائل ساتھ ساتھ ہی گھر پہنچتے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے پھانسی نامے پر دستخط ثبت کرنے کی پاداش میں جنرل ضیاء الحق کو سینکڑوں قتل ناموں پر دستخط کرنے پڑے وہ بالآخر اپنے ہی بنائے ہوئے اصول کی سنگینی اور نظریے کی شقاوت کا شکار ہو گئے۔

اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں سے وہ مزید مسکراتے ہوئے ملتے اور خاموشی سے ان کا پتہ صاف کر دیا جاتا۔ داتا دربار' سماع' مراقبہ اور میلاد کی محفلوں میں وہ جن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بے تکلفی سے کھسر پھسر کرتے انہی کو معطل کر دیا جاتا' ان کی ملنساری و غمگساری نے کئی گھرانوں کے شب و روز گریہ وزاری میں بدل دیئے۔ ایک صف ماتم تھی جسے وہ بچھاتے ہی چلے گئے۔

وہ اپنی ذات سے وابستہ فیوض کے زیر اثر لوگوں کو سوگوار کرنے اور ناشاد رکھنے میں خصوصی مہارت کے حامل تھے۔ ان کی اس مہارت سے فیض یاب ہونے والوں میں محض پیپلز پارٹی ہی نہیں ہے بلکہ بلاواسطہ یا بلواسطہ انہوں نے قوم کے ہر فرد کو متاثر و مایوس کیا۔

ضیاء الحق جس انتخابات کے انعقاد کے وعدے پر عوام کی گردنوں پر مسلط

ہوئے وہی ان کے جیتے جی منعقد نہ ہو سکے، انتخابات کو سازگار حالات سے مشروط کر دیا اور حالات مزید بگاڑ دیئے بیچ بیچ میں احتساب کا پلچ بھی لگاتے رہے اور احتساب کا ایک ایسا یکطرفہ نظام متعارف کرانے میں سرخ رو ہوئے کہ جسے ان کے بعد بھی ان کے تربیت یافتہ سیاسی نونہالوں نے خوب استعمال کیا۔ فیض یاب ہوئے اور فروغ پایا۔

انتخابات' سازگار حالات' اور احتساب سے دستبردار ہو کر وہ یکایک اسلامی نظام کے نفاذ پر کمربستہ ہو گئے یہ الگ بات کہ ان کے اسلامی نظام کے نفاذ کا بھی وہی حال ہوا جو ان کے ہاتھوں انتخابات' سازگار حالات اور احتساب کا ہو چکا تھا۔ وہ جس روز ہلاک ہوئے نتیجتاً" ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ مزید مشکل اور دور تھا نسبتاً اس دن کے کہ جس دن انہوں نے اقتدار سنبھالا تھا۔

وہ جب اقتدار میں آئے تو ملک کی سیاسی اور نظریاتی صورت حال ایسی تھی کہ اسلامی سوشلزم کا فریب اور ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی شخصیت کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ عوامی حاکمیت کے غبارے میں سے ہوا نکل چکی تھی۔ عوام ایک نئے تجربے کے لیے تیار اور ذہنی طور پر اسلامی انقلاب کے بہت قریب تھے وہ کسی حقیقی معاشرتی و معاشی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حالات اس وقت جتنے سازگار تھے اتنے کبھی بھی نہیں تھے۔ اوپر سے سونے پہ سہاگہ یہ کہ ضیاء الحق کی ظاہری شخصیت و شہرت بھی اسلامی ذہنیت اور رجحان رکھنے والے فرد کی تھی۔ ضیاء الحق سے زیادہ بہتر موقع اسلامی نظام نافذ کرنے کا کسی اور حکمران کو نہیں ملا وہ بلاشبہ اس کام کو کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور کر سکتے تھے لیکن عملاً ان کی وہ تمام کوششیں اور خواہشیں (اگر واقعی انہوں نے کبھی کوئی خواہش اور کوشش اسلامی نظام نافذ کرنے کی' کی تھی) جو اسلامی نظام کے نفاذ سے وابستہ تھیں' اکارت گئیں بات

صرف یہیں تک نہیں ہے کہ وہ اپنے دعوی کے مطابق اسلامی نظام کا نفاذ نہ کر سکے بلکہ اسلامی نظام کے نفاذ کے ہر ممکن موقع کو مستقبل قریب میں بھی موہوم و مسموم کر دیا۔

ان کے طویل دور اقتدار سے معاشرے پر عموماً اور اس نسل پر خصوصاً جو بلوغت سے شعور تک پہنچی دو اثرات بڑی شدت اور سنجیدگی سے مرتب ہوئے اول یہ کہ یہ نوجوان طبقہ محسوس کر رہا تھا بلکہ صاف دیکھ رہا تھا کہ اسلامی نظام کو نافذ کرنے کی بجائے اسے ایک تاخیری حربہ' سیاسی ہتھیار' انتقامی آلے اور من مانی تاویلوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نسل کے سامنے اسلامی نظام کی افادیت اس سے زیادہ آشکارا نہیں ہو سکی کہ اسلامی نظام نافذ کیا جا سکے یا نہیں لیکن اس کے نفاذ کے وعدے سے کم ازکم قوم کو یرغمال اور معاشرے کو محصور ضرور رکھا جا سکتا ہے۔ ان نوجوانوں نے اسلام کے دعوی داروں اور وعدہ گزاروں کو دوغلا اور زبانی کلامی ہی پایا ہے لہٰذا اس نسل کو اسلام سے دوری اور مذہب سے بے زاری کا دوش نہیں دیا جا سکتا۔ نوجوانوں کی اس دوری اور بیزاری نے موجودہ عشرے میں ان بھیانک جرائم کے پروان چڑھنے میں بنیادی کردار ادا کیا جو ہمارے معاشرے کے لیے شدید' سنگین اور اجنبی ہیں۔

اغواء برائے تاوان' گینگ ریپ' ٹارچر سیل' مذہبی دہشت گردی' بم دھماکوں اور ڈاکوں جیسے قبیح جرائم کی بنیادی وجوہات مک مکا کے اس رویے اور عہد سے وابستہ ہیں کہ جس عہد میں اسلامی نظام کے وعدے پر اسلامی نظام کی جڑیں کاٹی گئیں۔ اسلام کے بارے میں جنرل ضیاء الحق کی اس دوغلی حکمت عملی نے نفاذ اسلام کو ٹھٹھہ مخول' عوام کی بددلی اور بے حسی میں بدل دیا۔

دوسرا دریا' گہرا اور منفی تاثر معاشرے پر یہ ثبت ہوا کہ اہل ریا اور اہل ایمان' اسلامی ضابطہ حیات کے دعوی دار اور ذاتی مفادات کے دلدادہ اور مالی منعفت کے اسیر آپس میں یوں شیر و شکر، خلط ملط اور یک جان ہوئے کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا، اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان میں کون کیا ہے؟ غاصب اور ڈاکو نماز باجماعت کے بعد مال بٹورنے میں بھی متحد اور باجماعت رہتے' وزیر و مشیر سمگلر' مجلس شوری خوشامدی اور ناکارہ' ریاکار فریبی اور تہجد گزار ایک گھاٹ' ٹاؤٹ اور عمرہ گزار ساتھ ساتھ اور ان سب کا پنج ٭ بنجگانہ سجدہ گزار۔

سقوط مسلم ہسپانیہ کے اسباب وعلامات سے ضیاء الحق یا تو لاعلم تھے یا ان کا فلسفئہ مک مکا و مصالحت کا کمال تھا کہ کسی خائن' بددیانت اور ڈاکو کو انہوں نے خود سے کبھی ناراض' ناامید اور مایوس نہ کیا۔ محب وطن ہوں کہ وطن دشمن قوم پرست ہوں یا مال پرست' اسلام پسند ہوں کہ واقعی اسلام سے اخلاص رکھنے والے' ضیاء الحق کی سرپرستی میں سب کے سب ہم رکاب اور ان کے جلو میں شانہ بہ شانہ۔ کوئی عجوبہ ایسا نہیں تھا جو ان کی جناب میں ممکن و میسر نہ ہو۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی مسلسل رٹ اور مسلسل تاخیری حربوں نے اسلام پسندوں کی بدنیتی کے سارے پرت کھول دیئے نتیجتاً" عوام اور خاص کر نوجوان طبقہ ہر اس فرد' ادارے اور گروہ سے بھی بدظن ہوگیا جو اسلام سے اخلاص رکھتے تھے اور اس کے نفاذ میں سنجیدہ تھے۔

ضیاء الحق اچھی طرح جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی سے مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے وہ کسی اور مخالفت کا دباؤ برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اپنی اس مجبوری کے ہاتھوں وہ ہر کس وناکس سے مصالحت پہ آمادہ رہتے اور حمایتی پیدا کرنے کی غرض سے وہ آخری حد تک چلے جاتے۔

وہ ایک طرف سمگلروں کی شہرت رکھنے والے افراد کی گھریلو تقریبات میں

شرکت کرتے' انہیں ایوان صدر میں صدر کے ذاتی مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا جاتا۔ ان کے ساتھ خوش خوراکیوں اور مراقبے کی محفلیں منعقد کی جاتیں اور دوسری طرف وہ پاکستان کے پرچم کو سرعام نذر آتش کرنے والوں کو تبریک وتہنیت کے گلدستے ارسال کرتے۔ جیسے سندھ کے جی ایم سید مرحوم کو جنرل ضیاء الحق سے جو اہمیت وعزت افزائی ملی وہ خود ان کے لیے بھی غیر متوقع تھی۔ پاکستان کے صدر سے' خصوصاً ایک فوجی صدر سے یہ توقع عبث تھی۔ ضیاء الحق نے قدم قدم پہ ثابت کیا کہ پیپلز پارٹی کی مخالفت میں وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں اور کوئی بھی قیمت دے سکتے ہیں۔

حمایتوں کی اس شدید ضرورت نے جنرل ضیاء الحق کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کے پیچھے پیچھے اَللّٰھُمَّ لَبَّیک کہنے والے ان کی توقع سے زیادہ شاطر اور موقع شناس نکلے۔ موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے ان لوگوں نے اپنی قیمت بڑھادی۔ وزارت' مشاورت اور سفارت سے زیادہ ان لوگوں کی دلچسپی طویل المدت مفادات سے وابستہ تھی۔ یہ لوگ ایک ایسے تحفظ کے طلب گار تھے کہ جو ان کی سیاہ کاریوں پر پردہ تانے رکھے ان پر انگلی نہ اٹھائی جاسکے اور اوپر اوپر سے یہ محترم ومعتبر ہی بنے رہیں اور اندر اندر اپنا کام بھی جاری رکھیں۔ اس روش سے جنرل ضیاء الحق ایک طرف راشیوں' غلط کاروں اور سیاہ کاروں کے دباؤ میں آتے چلے گئے اور دوسری طرف وہ بددیانتوں' وطن دشمن عناصر اور مال بنانے والوں کو تحفظ فراہم کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کارگزاری نے انہیں مک مکا کے نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

ان کے عمل بداعمالی میں اور اعمال بدشگونی میں بدل گئے' انہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اور جو بھی کرنے کا قصد کیا اسی کو ادھورا' نامکمل' ناقص اور ناکردہ چھوڑنا پڑا۔ ان کے بیشتر کام بدنمائی میں نمایاں اور اکثر کارنامے اپنی

تاثیر میں زہریلے ثابت ہوئے۔ نہ وہ انتخابات، کرا سکے' نہ احتساب ہو سکا' نہ حالات ساز گار ہوئے نہ وہ پیپلز پارٹی کو دفنا سکے' نہ اسلامی نظام نافذ کر سکے نہ یک جماعتی نظام، نہ شوریٰ کا کاروبار چلنے دیا، نہ شریف النفس محمد خان جونیجو کا، ریفرنڈم کرایا تو اسے تضحیک و تفریح بنا دیا، انتخابات کرائے تو غیر جماعتی و بے اصولے' جو مومنین کونسلر کا انتخاب بھی جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے انہیں پارلیمنٹ کے متوازی شوریٰ میں لا بٹھایا۔ مسلم لیگ کے مردے میں پہلے جان ڈالی پھر سلب کرلی' قومی سطح پر کوئی اصلاحات' ترقیاتی کام یا انقلابی اقدامات نہ اٹھائے جا سکے۔

انہوں نے گیارہ سال تک قوم کو جبر' اذیت' انتظار اور اضطراب میں مبتلا رکھا' گھیر گھار کر وہ عوام کو جس بند گلی میں محبوس کیے ہوئے تھے بالآخر خود ہی اس میں گھر کر رہ گئے۔ محمد خان جونیجو کی رخصتی کے بعد وہ تمام راستے مسدود ہو گئے جن سے ضیاء الحق کی واپسی اور فرار ممکن تھا۔ انہوں نے خود ہی وہ شاخ کاٹ دی جس نے ان کا وزن اٹھایا ہوا تھا۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم اپنی میراث میں جو قبیح باقیات چھوڑ گئے ہیں ان میں محض مک مکا کا زہر' مصلحت کوشی کا کینسر اور معاشرتی ناسور ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک مذہبی فریضے کی ادائیگی کو خیانت سے آلودہ کرنا بھی شامل ہے۔ عمرے جیسے مستحسن اور مبارک مذہبی فریضے کی ادائیگی کو تواتر سے سرکاری اخراجات سے آلودہ کرنے کے مکروہ فعل کو جنرل ضیاء الحق نے ایک باقاعدہ صنعت' حکومت کی ایک اضافی بلکہ اختراعی مراعت اور اعلیٰ سرکاری اہل کاروں کے صوابدیدی اختیار کے طور پر پروان چڑھایا۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے عہد اقتدار میں سرکاری خزانے سے جتنے عمرے ادا کیے ان سے پہلے کے حکمرانوں نے مجموعی طور پر بھی اتنے عمرے نہیں کیے

ہوں گے۔ اصل میں جنرل ضیاء الحق کے عمروں کے یہ دورے شش جہت اور ہشت پہلو ہوتے۔ انہوں نے عمرے کو حمایت کا حیلہ' دست درازوں کا منہ بند رکھنے اور اپنے مذہبی رجحان کی دھاک بٹھانے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ عمروں کے مسلسل دوروں کی ایک یہ فوری افادیت بھی ہوتی کہ ان طالع آزما اور مہم جوؤں کی سرگرمیوں پر وقتی طور پر ہی سہی' ایک اوس سی پڑ جاتی جو پہلے دن سے ہی آپریشن فیئر پلے کے ان فیئر مہرے تھے اور کن انکھیوں سے ایوان صدر اور چیف آرمی ہاؤس کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ جب ان لوگوں کو تقریب حلف برداری کے زیادہ خواب نظر آنے لگتے تو جنرل ضیاء الحق انہیں عمرے کے دورے پہ لے کے چل پڑتے۔

خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں ان زائرین سے غیر محسوس طریق اور مبہم گفتگو کے ذریعے وفادار رہنے کی بیعت لی جاتی۔ متعلقہ زائرین کافی عرصے تک اس تذبذب کا شکار رہتے کہ وہ ان مقامات مقدسہ پر وفاداری کا پیمان باندھ چکے ہیں یا یہ محض ان کا ابہام ہے۔ ان لوگوں کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے بساط لپیٹ دی جاتی' کسی کو سبکدوش کر دیا جاتا' کسی کو سنگسار' کسی کو پروموٹ کیا جاتا کسی کو ٹرانسفر' روشنی کے ہالے کے عین بیچوں بیچ ایسی اندھیر نگری مچی ہوئی تھی کہ سب دم بخود تھے۔

زائرین کے چناؤ میں جنرل ضیاء الحق بڑے محتاط تھے وہ خاصی سوچ بچار' باریک بینی اور دور اندیشی سے مال مفت لینے والے مستحقین کا انتخاب کرتے۔ عمرے کے ان مذکورہ دوروں میں خواتین کی بھی معقول تعداد شامل ہوتی۔ ان خواتین میں دو طرح کی بیگمات کو شامل کیا جاتا اول وہ کہ جن کے شوہر نامدار کا نام زائرین میں تو شامل نہ ہوتا مگر مشکوک اور ممکنہ مہم جوؤں میں ضرور شامل ہوتا۔ بیگم صاحبہ کے چناؤ میں یہ ملحوظ رکھا جاتا کہ کسی بھی غیر متوقع طالع

آزمائی میں بطور یرغمالی وہ کس قدر مفید و موثر ثابت ہوں گی۔

دوسری قسم کی بیگمات میں ان خواتین کو شامل کیا جاتا کہ جن کی یرغمالی حیثیت تو صفر ہوتی مگر شاپنگ اور باہر کے مال کی اشتہا بے حد وحساب' ان خواتین کو زائرین کی فہرست میں شامل کر لینے سے پہلے یہ تخمینہ لگا لیا جاتا کہ جن خاندانوں اور خانوادوں کی یہ خواتین نمائندگی کر رہی ہیں ان کی قیمت فروخت کیا ہے' بکاؤ مال کی کوالٹی' مارکیٹ ویلیو' طلب' تقاضا اور ضرورت واہمیت کو خوب پرکھ لیا جاتا۔

عموماً ان زائرین کی اکثریت ان کم حوصلہ دست درازوں اور کم سخن بلکہ بے زبانوں پہ مشتمل ہوتی کہ جو منہ کھول کر وزارت' سفارت' عہدے' پلاٹ' کارخانے اور ٹھیکے مانگنے کے حوصلے سے عاری ہوتے اور اپنی وفاداری اور حمایت کی کسی بھی قیمت کو غنیمت جانتے۔ جانثاروں کا یہ گروہ بنا مانگے مل جانے کے نیم ساختہ خود دارانہ اصول پر کاربند نظر آتا۔ ان لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا کہ سرکاری زائرین کہلائے جاتے' حکومتی اقامت گاہوں اور ایوانوں میں قیام پذیر ہوتے' مفت کا ہوائی سفر' رنگ برنگے کھانے' ون سونّے عشائیے' روزانہ ڈیلی الاؤنس' شاپنگ' زر مبادلہ' امیرالمومنین کی ہمراہی اور مفت کا عمرہ' اوپر سے بلکہ الگ سے اس ساری مذہبی کارگزاری کا سرکاری تصدیق نامہ جو سرکاری البم کی صورت میں اختتام عمرہ پر پیش کیا جاتا۔

اس البم کا بھی خاطر خواہ اور موثر استعمال کیا جاتا۔ معاصروں اور حریفوں پر ہائی کمان سے اپنی قربت ثابت کرنے اور ان کی احساس محرومی وکمتری کو گہرا کرنے میں یہ سرکاری عمرہ البم سائنائیڈ جیسی تیز تاثیر دکھاتا۔ البم دیکھنے والے شریکوں کی حالت دیدنی ہوتی کبھی ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور کبھی منہ' کبھی منہ سے سرد آہیں برآمد ہوتیں' کبھی رنگ پیلا پڑ جاتا' ننھے سے دماغ

میں خون کا دوران بڑھ جاتا اور چہرے پر سرخی پھیل جاتی۔ کبھی عزم اور کچھ کر گزرنے کی لہر' لہرا جاتی اور کبھی حقارت اور نفرین بھری طنزیہ مسکراہٹ' مگر زبان پر اللہ مبارک کرے' اللہ قبول کرے کا ذکر جاری رہتا۔

سعودیہ کی سرزمین آتے ہی جنرل ضیاء الحق پر انصاف پسندی غالب آجاتی اور ان کے لہجے میں عدل جہانگیری جھلکنے لگتا۔ شاپنگ کے لیے زر مبادلہ بانٹتے وقت دونوں طرح کی خواتین میں امتیازی لکیر مٹا دی جاتی اور سب کو یکساں فارن کرنسی کی وافر مقدار مہیا کر دی جاتی۔ بیگمات کے پرس سعودی کرنسی سے اور ان کے دل جذبہ شکر گزاری سے بھر جاتے' عین ممکن ہے کہ حرمین شریف میں یہ خواتین سب سے پہلے دو نفل نماز شکرانہ برائے وصولی زر مبادلہ ادا کرتی ہوں۔

زر مبادلہ ہاتھ لگتے ہی زائرین کی کایا پلٹ جاتی' پروگرام تبدیل ہو جاتے' زیارتی مقامات پر حاضری کا از سرنو جائزہ لیا جاتا اور نظر ثانی کی جاتی' آنکھوں میں چمک آجاتی اور ہر طرف ہرا ہی ہرا ہو جاتا۔

حرمین شریفین سے منسلک بازاروں میں رونق آجاتی' مناسک عمرہ وحج کے کتابچوں اور مناجاتی دعاؤں کے ریشمی جز دانوں سے شاپنگ کی لمبی لمبی فہرستیں برآمد ہوتیں' خریداری کا ڈول ڈالا جاتا اور آپس میں مسابقت و موازنہ شروع ہو جاتا۔ مرد حضرات خریداری میں دلچسپی سے زیادہ ان مصاحبوں پر نظر رکھتے جو حصول ثواب وعبادات سے زیادہ اطاعت امیر المومنین میں مصروف ہوتے اور ان کی قربت' توجہ اور نظر کرم حاصل کرنے کے لیے عزت نفس' ایمان اور آبرو گنوانے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے۔

مسجد نبوی سے ملحقہ پاکستان ہاؤس کے ملازمین اور جدہ میں ہمارے سفارتخانے کے عملے کی ان غول در غول عمرہ گزاروں کو دیکھ کر باچھیں کھل

جاتیں وہ جانتے تھے کہ دو چار دن ہی سہی مگر اللے تللے تو رہیں گے ایسے موقعوں پر وہ اپنے اہل و عیال سمیت پاکستان ہاؤس میں مقیم ہو جاتے۔ سامان خریداری کے بوجھ اور بھاؤ تاؤ کی چیخ چیخ سے نڈھال خریدار طائفہ شام ڈھلے جب پاکستان ہاؤس میں وارد ہوتا تو یہ سفارتی عملہ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ انواع واقسام کے گرم گرم کھانوں کی دیگوں کے منہ کھول دیئے جاتے' کونسی نعمت ہوتی جو زینت دستر خوان نہ ہوتی اور کون تھا جو کھانے والوں میں شامل نہ ہوتا۔ سفارتی عملے کے بسیار خور اور چرب زبان' زیادہ کھانے اونچا بولنے اور گندے زیر جامے پہننے والی بھاری بھرکم عورتیں اور ان کے اضطراری کیفیت میں مبتلا بد تمیز بچے' کھانا اس طرح سے کھایا جاتا کہ گویا کھانا آخری اور لوٹ مار کا پہلا موقع ہو۔ مگر یہ دونوں قیافے غلط ہوتے' نہ کھانا آخری ہوتا نہ لوٹ مار پہلی ہوتی یہ طبقہ تو مسلسل نصف صدی سے اسی کام میں مصروف ہے نہ ان کے کھانے میں کمی بیشی آئی نہ ان کی لوٹ مار میں۔

عمروں کے یہ دورے درمیانے سائز کے جہازوں پر شروع کیے گئے تھے۔ مگر سرطان کی طرح آناً فاناً بڑھتی ہوئی مصاحبین کی تعداد درمیانے سائز کے جہازوں کی متحمل نہ رہی' پھر بڑے سائز کے اور آخری سالوں میں سب سے بڑے سائز کے جہاز بھی چھوٹے پڑ جاتے۔ جاتے ہوئے تو گزارہ ہو جاتا کہ زائرین بھی سہمے اور سمٹے ہوتے اور رخت سفر بھی مختصر ہوتا مگر واپسی پر گھمسان کارن پڑتا۔

خریداری کے مال کی مقدار کا اندازہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ جاتے ہوئے جو جہاز زائرین' تحفے تحائف میں پیش کیے جانے والے جانوروں' قالینوں کے رول' نوادرات کے پیٹیوں اور خواہشات و مفادات کے بکسوں سے بھرا جاتا واپسی میں یہی جہاز انہی زائرین کو اپنے اندر سمو لینے سے قاصر ہوتا۔

اگر قضائیہ کے حکام یا ان کی بیگمات زائرین میں شامل ہوتیں تو بالا بالا ایک اور جہاز کا بندوبست ہو جاتا بصورت دیگر بلکہ بالعموم ملک الموت کے اس مال کو منزل مقصود پہ پہنچانے کی ذمہ داری سفارتی عملہ اپنے سَر لے لیتا۔ ہمارے سفارتی حکام ڈپلومیسی کے اسرار و رموز سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن مال کی نقل وحمل کے داؤ پیچ سمجھنے میں ان کی صلاحیت اور مہارت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

ادھر خریداری اپنے عروج پر ہوتی قومی خزانے کا منہ اور زر مبادلہ کا رجسٹر کھلا ہوتا' زر مبادلہ کو مال غنیمت اور غنیم کی ملکیت سمجھ کر مدینہ اور مکہ کے بازاروں میں اڑایا جا رہا ہوتا ادھر عمرہ وفد میں شامل وزارت خزانہ کے حکام سعودی حکومت کے سامنے اسی زر مبادلہ کے قحط کا رونا رو رہے ہوتے۔ افسردہ مسکراہٹ' عاجزانہ لہجے اور خوشامدانہ اطوار سے لیس یہ ریا کار حکام ہماری معیشت کی بدحالی اور کسمپرسی کا ایسا عبرتناک نقشہ اور المناک زائچہ کھینچتے کہ نوجوان سعودی شہزادوں کے دل بھر بھر آتے۔ عمرے کے ساتھ ساتھ ان شب بیداروں کو کچھ نہ کچھ مالی یافت بھی ہو جاتی۔ بخشش' امداد' قرض' گرانٹ' اعانت' اسلامی بھائی چارے کے تھیلے سے جو بھی برآمد ہوتا اور جتنا بھی ہوتا اسے عمرے کا فوری اور اضافی اجر سمجھ کر صبر شکر سے قبول کر لیا جاتا۔

اس معرکے کو سر کرنے والوں کو ایک اضافی مبارکباد یہ بھی دی جاتی کہ وہ سعودی حکومت سے بھی مال بٹورنے میں سرخرو ہوئے یوں جب یہ طائفہ واپس آتا تو ہر طرح سے فائدے ہی فائدے میں ہوتا۔ ذاتی' مذہبی' مالی' سیاسی غرضیکہ کوئی کامیابی ایسی نہ ہوتی جو اس عمرے سے منسوب نہ ہوتی۔

اس دور میں غیر ملکوں کے سیاسی دوروں کو ہی نہیں بلکہ عمرے کے

دوروں کو بھی کامیاب اور ضروری ثابت کرنے کے لیے گھٹنوں سے گردن تک کا زور لگا دیا جاتا۔

مذہب' معاشرے' ملک اور قوم کو جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا سو پہنچا مگر ایک بات کا کریڈٹ انہیں ضرور دیا جاتا رہے گا۔ سیاستدانوں کو بے وقعت' بے حمیت اور بے آبرو کرنے کا جو کارنامہ جنرل ضیاء الحق نے انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا' یہ کارنامہ انجام دینے کی اہلیت ہمارے کسی اور حکمران میں کم ہی تھی۔ مرحوم صدر ایوب خان کی جو رائے ہمارے سیاستدانوں کے بارے میں تھی جنرل ضیاء الحق کی رائے بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ جنرل ضیاء الحق بھی سیاستدانوں کو ضمیر فروش' بکاؤ مال' شہدے اور پاؤں کی جوتی ہی سمجھتے تھے۔ سیاستدانوں کو بے عزت کرنے اور نیچا دکھانے میں صدر ایوب خان اپنے رکھ رکھاؤ اور وضعداری میں ایک خاص حد سے آگے نہیں گئے۔ لیکن ضیاء الحق کی ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ان کے راستے میں رکھ رکھاؤ اور وضعداری کی کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔

صدر ایوب خان مرحوم نے سیاستدانوں کو محض ایبڈو کیا تھا لیکن ضیاء الحق مرحوم نے انہیں بلڈوز کر دیا۔ سیاستدانوں کے بارے میں جنرل ضیاء الحق کی یہ رائے بڑی صائب اور حقیقت پر مبنی تھی کہ ان کے بلانے پر سب دم ہلاتے ہوئے آجائیں گے اور حقیقتاً ہوا بھی یہی' انہوں نے سیاستدانوں کی تذلیل کا کام بڑی مہارت اور دھیمے پن سے کیا۔

چپیڑ مارتے وقت انہوں نے منہ کا خاص دھیان رکھا کہ یہ چپیڑ کس کے منہ پر ماری جا رہی ہے۔ کسی کو وزارتیں دے کر اور کچھ کو محض وزارتوں کا لالچ دے کر' کسی سے وزارت واپس لے کر اور کسی کو پیپلز پارٹی کا ڈراوا دے کر' کسی کو بھٹو صاحب کی بڈو مانی دکھا کر' کسی کو ان کے مردے سے

خوفزدہ کرے، کسی کو احتساب کے شکنجے سے اور کسی کو مستقبل کے بھکاوے سے غرضیکہ ایک ایک کر کے سیاستدان مارشل لاء کے زیر اہتمام قائم ہونے والے الیکشن سیل اور احتساب سیل میں اپنی تجاویز، تاثرات، لائحہ عمل اور حلف نامہ وفاداری لے کے پیش ہوتے رہے، یہ لوگ سرنگوں جاتے، جاتے ہی سجدہ ریز ہو جاتے، سجدہ سہو ادا کرتے اور سرخرو واپس آتے، از سر نو مشرف بہ اسلام ہونے کا جشن منایا جاتا، مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوتا مگر موصوف کا ایمان، آبرو، نظریہ، اصول اور ضمیر ڈوب چکا ہوتا اکثر وبیشتریوں بھی ہوتا کہ ڈبونے کا یہ مرحلہ درپیش ہی نہ آتا۔ پتہ چلتا کہ یہ سب کچھ تو بہت پہلے ڈبویا جا چکا ہے اور اب مزید ڈبونے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

اپنے اعمال نیت اور مفادات کے ہاتھوں جو سبکی اور تذلیل ہمارے راندہ درگاہ سیاستدانوں کو جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں اٹھانی پڑی اور جس ہزیمت کا وہ شکار ہوئے یہ ضیاء الحق کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اور فتح مبین تھی۔ سیاستدانوں کو بے آبرو اور بے نقاب کرنے کا جو عظیم الشان کارنامہ انہوں نے انجام دیا اسے بہر حال سراہا جاتا رہے گا۔

جنرل ضیاء الحق کا دور عوامی سائیکی میں ایک ایسی ناپسندیدہ و منفی تبدیلی لانے کا موجب بنا کہ جس کے نتیجے میں ہمارے مجموعی معاشرتی رویے کے عناصر واجزائے ترکیبی سے ہماری مخصوص مروجہ اور روایتی معاشرتی بھائی چارے کی فضاء یکسر غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ہمارے ہاں غیرمانوس کلچر رائج کر دیئے گئے۔ ٹکٹکی کلچر نے اظہار حق سے محروم کر دیا، باہمی اخوت کی جگہ ہماہمی اور کلاشنکوف نے لے لی، لین دین مک مکا کی اساس پر استوار ہوا۔ ضبط اور ضابطے کی جگہ ضابطہ شکنی اور چھینا جھپٹی رائج ہوئی۔ سنگین جرائم نظریہ ضرورت کے اندھیرے میں چھپ گئے۔

جنرل ضیاء الحق کے مسند اقتدار پر جلوہ افرو ہونے پر اس وقت کی ہماری مروجہ اقدار ان کی رخصتی تک قباحتوں میں بدل چکی تھیں' مک مکا کا آکٹوپس اپنی پوری ٹانگوں پر ایستادہ ہو چکا تھا اور ہر ٹانگ معاشرے کی گردن کو جکڑے ہوئے تھی' مال بناؤ' جیبیں بھرو' خزانہ لوٹو' یہ بھی لے لو' وہ بھی لے لو' پلاٹ ہتھیاؤ' قبضہ جماؤ' جانے نہ دو' مل کے کھاؤ' تحفظ دو' ایک رہو' عمرے کرو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔

کچھ لوگ جاتے جاتے اپنے لیے صدقہ جاریہ یا ذلت جاریہ کا اہتمام کر جاتے ہیں جو ان کے چلے جانے کے بعد بھی جاری وساری رہتا ہے۔ دونوں طرح کے جاریہ سلسلے انسان کی پوری زندگی اور جس طور زندگی گزاری گئی' کا عکس ہوتے ہیں یہ مکافات عمل ہے اس سے مفر اور اس میں کسی کمی بیشی وتبدیلی کا امکان نہیں ہوتا ہے۔

ذلت جاریہ کا ایک مظاہرہ کچھ عرصہ پہلے نیویارک میں دیکھنے میں آیا۔ اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے ہزاروں کشمیری مظاہرین جمع ہیں۔ وہ کشمیری رہنما شیخ فاروق عبداللہ کے پاکستان مخالف بیانات' نام نہاد انتخابات اور کشمیری مجاہدین کی شہادت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے' انصاف اور حق خود ارادیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مظاہرہ بڑا منظم اور جاندار ہے۔ مظاہرین میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں' جوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں وقفے وقفے سے آگے آتے ہیں مٹھی بند ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہیں۔ نعرہ بلند ہوتا ہے مظاہرین جواب دیتے ہیں۔ آگے آنے والے پھر پیچھے چلے جاتے ہیں تاکہ دوسرے آگے آسکیں۔

ذرا سی دور ہٹ کر چار پانچ کشمیری نوجوان اس سارے مظاہرے اور

اہتمام سے بے نیاز شیشے کی ڈھیر ساری بوتلوں کو سیل کرنے میں مصروف ہیں۔ لائٹر سے کالے رنگ کی لاکھ پگھلاتے ہیں کارک اور ڈھکنوں کو بوتل کے منہ پر سیل کرتے ہیں اور بوتل کو احتیاط سے گتے کے ڈبے میں رکھ دیتے ہیں۔ طرح طرح کی بوتلوں میں ہر طرح کی بوتلیں شامل ہیں' چھوٹی' بڑی' درمیانی' پچکی ہوئی' لمبی گردنوں والی' رنگ برنگ' مٹیالی' ہلکی نیلی' سبز اور شفاف' زیادہ تر بوتلیں بیئر اور شراب کی ہیں کچھ تیل' کیمیکل' ماؤتھ واش اور نیل پالش اتارنے والے محلول کی بھی ہیں۔

پتہ کرنے پر بتایا گیا کہ ان تمام بوتلوں میں انسانی پیشاب بھرا ہے اور جس کا پیشاب ہے اس کے نام کی پرچی بوتل پر لگی ہے۔ ہر ہفتے عشرے کے بعد ان بوتلوں کو کشمیر روانہ کر دیا جاتا ہے وہاں تنظیم کے کارکن ان بوتلوں کو وصول کر کے کشمیری رہنما اور کشمیر کے مرد آہن مرحوم شیخ عبداللہ کی قبر پر لے جاتے ہیں۔ عوام کے بڑے مجمع کے سامنے باآواز بلند بوتل پر لکھا نام پکارا جاتا ہے اور بوتل کو مرحوم شیخ صاحب کی قبر پر انڈیل دیا جاتا ہے۔

لوگ تالیاں بجاتے ہیں آوازے کستے ہیں۔ شیخ صاحب کی قبر برائے تفریح و ٹھٹھہ مخول' استعمال میں آ رہی ہے۔

ذلت جاریہ کی یہ عبرتناک مثال کشمیریوں کے اس غم وغصے اور نفرت کی مظہر ہے جس سے وہ سالہا سال سے دوچار ہیں اور شیخ عبداللہ مرحوم کو اپنے موجودہ مصائب ومسائل کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

دہلی میں ابو الکلام آزاد کی قبر پر بھی اس سے ملتا جلتا عمل جاری ہے گو کہ نوعیت مختلف ہے۔ قبر کے اطراف واقع محلوں سے گندگی اور غلاظت کو قبر کے قریب پھینک دیا جاتا تھا سالہا سال یہ عمل جاری رہا اب دہلی میونسپلٹی نے کوڑا کرکٹ کے اس ڈھیر کو قبر کے بالکل قریب بلکہ قبر سے متّصل کر دیا

ہے۔ اگر کبھی کوئی فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھانا بھی چاہے تو شدید تعفن کی وجہ سے نامراد اور باز رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ کیسی حکمت اور کیا اسرار ہے کہ جو بھی قیام پاکستان' استحکام پاکستان اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے آڑے آیا دیکھتے ہی دیکھتے ذلت جاریہ کی زد میں آگیا۔ جو ابھی تک بچے ہوئے ہیں ان کا انجام بھی کچھ مختلف نہیں ہو گا۔

مک مکا کی قیمت بعد از مرگ بھی چکانی پڑتی ہے۔ شیخ عبداللہ مرحوم کے برعکس جنرل ضیاء الحق اپنے پیچھے ایک صدقہ جاریہ چھوڑ گئے ہیں جو بڑے زور شور سے جاری وساری ہے۔ سرکاری خزانے سے عمرے ادا کرنے کی جس روایت کو ضیاء الحق نے استحکام بخشا اور پروان چڑھایا' ان کی تقلید میں جب تک حکومتی ارکان' سرکاری اہلکار اور صاحب ثروت زائرین سرکاری خرچے پر عمرے ادا کرتے رہیں گے' ان عمروں کے ثوابات کا اگر بڑا حصہ نہیں تو کچھ نہ کچھ حصہ ضیاء الحق مرحوم کو ضرور پہنچتا رہے گا انشاء اللہ۔

سجدہ کش و ثواب کشید

امریکہ میں آج کل اس دماغ رسا سیلزمین کو نہایت زور شور سے ڈھونڈا جا رہا ہے کہ جس نے 1999ء کے شروع میں میل مارکیٹنگ یا اپنے لفظوں میں بذریعہ ڈاک سودے بیچنے کے سسٹم میں ایسی اختراع کر دی کہ میل مارکیٹنگ کی دو اعشاریہ چھ بلین ڈالر سالانہ کی انڈسٹری ایک سال سے بھی کم عرصے میں چار بلین ڈالر سالانہ کی انڈسٹری میں تبدیل ہو گئی ہے اور یہ شتر بے مہار کسی طور رکنے میں نہیں آرہا۔ ہوا یہ ہے کہ روزانہ آنے والی ڈاک میں اب ایسے خط نما حکم نامے کثرت سے آنے لگے ہیں کہ جن میں آپکے علم اور رضامندی کے بغیر بھی کچھ نہ کچھ آپ کو بیچ دیا جاتا ہے۔

یہ انشورنس کمپنی کا خط ہے آپ کا بیمہ کر دیا گیا ہے اگر آپ کو منظور نہیں ہے تو تیس دنوں کے اندر اندر اسے منسوخ کرالیں' وقت معینہ میں منسوخی کی اطلاع نہ دینے کو آپ کی منظوری سمجھا جائے گا۔ اور ماہانہ پریمیم آپ کے کریڈٹ کارڈ اکاؤنٹ سے وصول کر لیا جائے گا۔ یہ خط کسی آٹو کلب کی طرف سے آیا ہے کہ آپ کی کار کو چوری' مرمت' ٹوٹ پھوٹ' حادثہ اور

خرابی کے ممکنات سے نبرد آزما ہونے کے لئے انشورڈ کر دیا گیا ہے اور یہ بل بھی ارسال ہے اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو فلانی تاریخ تک منسوخ کرا لیا جائے ورنہ آپ کی کار بیمے کی زد میں آچکی ہے۔ یہ کمپنی من پسند جگہ پر قبر پلاٹ' جنازہ جلوس اور جنازے کو باوقار بنانے کے لئے افرادی قوت فراہم کرنے کی ضمانت دیتی ہے سو سے ایک ہزار افراد تک جنازے میں شرکت کے لیے' مدعو کیے جا سکتے ہیں۔

کوئی خط بچوں کی تعلیم کی انشورنس کے بارے میں ہے' کوئی تفریحی مقامات پر جیب کٹ جانے کے بعد نقد رقم کی فراہمی کے وعدے کا کوئی جوتے بھیج رہا ہے کوئی کپڑے بھیجنے پر بضد ہے' کسی کسی نے ارسال بھی کر دیئے ہیں' کہیں سے سی ڈی پلیئر چلا آرہا ہے کہیں سے رسالے اور کہیں سے جرابیں اگر آپ یہ سب لینا نہیں چاہتے ہیں تو مقررہ تاریخ تک واپس کر کے مطلع کریں ورنہ مال موصولہ کی رقم ارسال کر دیں۔

میل مارکیٹنگ کی انڈسٹری امریکہ میں سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے اور بہت استوار ہے مگر پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا کمپنی کی طرف سے بذریعہ ڈاک آفر بھیج دی جاتی تھی' مصنوعات کی تفصیل' تصویریں' نمونے' ڈیزائن اور قیمتیں ارسال کر دی جاتی تھیں۔ جنہیں ضرورت ہوتی وہ بذریعہ واپسی ڈاک مصنوعات کا آرڈر دے دیتے جنہیں ضرورت نہ ہوتی یا اشیاء پسند نہ آتیں وہ ان خطوں کو کوڑے میں پھینک دیتے۔

اختراع کا یہ نیا پہلو صارف کی پسند' ضرورت اور قوت خرید پر دباؤ قائم کر دیتا ہے اور قباحت اس نئے میل آرڈر سسٹم میں یہ ہے کہ یہ صارف کی چوائس کو محدود کر دیتا ہے اسے نہ کرنے کا جو فطری اختیار حاصل ہے اس اختیار کو تردد میں اور بعض صورتوں میں قباحت میں بدل دیا گیا ہے۔ یا تو

آپ معینہ مدت کے اندر اندر "نہ" کریں اور اس "نہ" کو یقینی بنائیں ورنہ سودا آپ کے سر منڈھ دیا گیا ہے' اللہ آپ کو برتنا نصیب کرے بسم اللہ کر کے ادائیگی کر دیں۔

امریکی جمہوریت کی اساس چوائس سے وابستہ ہے اور OPPORTUNITY کے گرد گھومتی ہے۔ فرد کو چننے اور چناؤ کا موقع میسّر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے مختلف چوانسز اور آپشنز ہونا ضروری ہیں تاکہ وہ اپنی پسند' صلاحیت' رحجان اور معیار کے مطابق چن سکے' موازنہ کر سکے اور فیصلہ کر سکے۔

جسے فارسی پسند نہیں ہے وہ بے شک فارسی نہ پڑھے بلکہ نیچرل سائنس کا مضمون پڑھ لے' جو پینو پرائی کی بجائے اپنی گلابو پر فریفتہ ہے اسے گلابو ہی ملنی چاہئے بعد میں جو ہو سو ہو مگر ایک دفعہ ملے تو' جسے ایلوپیتھک طریق علاج ناپسند ہے وہ آفتاب طریقت بابائے حکمت جناب فقیر الدین تصوف شاہ سنیاسی سے رجوع کر لے۔ جسے انشورنس ایجنٹ بننا ناپسند ہے وہ سی آئی اے' ڈرگ مافیا یا پولیس کا ایجنٹ بن سکتا ہے۔ جسے سمگلر اور صنعتکار ناپسند ہیں وہ عالموں' اچکوں اور بابوؤں کو ووٹ دے سکتا ہے اور جسے سیدہ بی بی آنسہ طاہرہ سید کی آواز زہر لگتی ہو وہ میڈم نور جہاں سے دل بہلا لے یعنی فرد کے پاس چوائس اور چننے کی گنجائش ضرور ہونی چاہئے اور جس قدر یہ گنجائش زیادہ ہو گی فرد اسی قدر آسودہ اور معاشرہ اتنا ہی جمہوری ہو گا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ صارفین اس نئے میل آرڈر سسٹم پر چیخ اٹھے ہیں ان کی شکایت یہ ہے کہ انہیں چوائس سے محروم کیا جا رہا ہے اور وہ مسلّط کر دیئے جانے کی زد میں آگئے ہیں ان پر دن رات' اشیاء' سودے اور معاہدے ٹھونسے جا رہے ہیں۔

صارف کی اس برہمی پر صارفین کے تحفظ کی کمیٹیاں' انسانی حقوق کی تنظیمیں اور جمہوری کمیشن سب حرکت میں آچکے ہیں اور کاروبار کی اس نئی طرز کے خلاف بحث' مباحثہ اور اقدامات شروع کئے جا چکے ہیں اور اس فرد کو سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں کہ جس نے یہ آئیڈیا پروان چڑھایا ہے اور فرد کی چوائس کو محدود کر دینے کے جرم کا مرتکب ہوا ہے اس کا یہ اقدام غیر جمہوری اور فرد کی آزادی سلب کرنے کے مترادف قرار دیا جا چکا ہے اور اس سیلزمین پر فرد جرم عائد کی جا چکی ہے۔

دوسری طرف مصنوعات بنانے والے' بیچنے والے اور سادہ لوح صارف کو پھانسنے والے بھی اسی بافراست سیلزمین کو کسی دوسری وجہ سے ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ اسے اگر معاشیات کا نوبل پرائز نہیں تو کم ازکم کاروباری ذہانت یا سیلزمین آف دی سینچری کا ایوارڈ ضرور دیا جا سکے کہ جس کی فراست سے صرف چند ہی ماہ میں کاروبار میں ایسی گھما گھمی آگئی ہے کہ جو اگلے پچاس برسوں میں بھی متوقع نہیں تھی۔

حسب ضرورت کوئی اس سیلزمین کو معتوب کرنا چاہتا ہے اور کوئی اسے ہار پہنانا چاہتا ہے لیکن بلا تفریق دونوں فریقین یہ ضرور مانتے ہیں کہ آئیڈیا غضب کا تھا اس کے نظریے میں کوئی کلام نہیں' سیدھا سادا' مال منافع بھرا اور قابل عمل۔

ہماری دانست کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے یہ آئیڈیا اس نامعلوم امریکی سیلزمین کا نہیں ہے بلکہ یہ آئیڈیا ہماری سرزمین سے پھوٹا وہیں پروان چڑھا اور وہیں سے چوری ہو کے امریکہ تک آن پہنچا۔ ہمارے جنرل ضیاء الحق اسی CHOICELESS آئیڈیے کو اپنے ریفرنڈم میں بہت پہلے متعارف کرا چکے ہیں۔

اگر آپ اسلامی نظام چاہتے ہیں تو مجھے بھی گلے لگانا پڑے گا' اگر اللہ کی حاکمیت عزیز ہے تو مجھے جھی ڈال لیجئے' مساوات محمدی کے لئے میری بیعت کرنی ہی ہو گی۔

بیمہ اور بیعنامہ دونوں ہو چکے ہیں یہ سودا آپ کو بیچ دیا گیا ہے اب یہ آپ ہی کا ہے' دن نکلنے سے پہلے پہلے سودا منسوخ کرو یا رقم ادا کرو۔ اگر کچھ نہ کرنا چاہو تو میں تو ہوں ہی بلکہ میں تو ہر صورت میں ہی ہوں جس سودے کے ساتھ اللہ کی حاکمیت اور اس کے دین کی سرفرازی منسلک ہو اسے بھلا کون مسلمان منسوخ کر سکتا تھا خصوصا ہمارے ہاں کے معاشرے میں کہ جہاں آج بھی بڑی بی بی کی شادی قرآن سے کر دینا ممکن ہے اور جہاں ووٹر اپنی رسمی اور رواداری والی ہاں کے خلاف ووٹ ڈالتے ہوئے فسخ نکاح کے دباؤ میں آجاتے ہیں۔

سو' سودا منسوخ ہوا نہ جنرل ضیاء الحق کی بیعت' نہ ریفرنڈم پر حرف آیا نہ عوام اور جنرل صاحب کے جمہوری مزاج پر۔ اس ریفرنڈم میں یوں تو رجسٹرڈ ووٹرز کے قریب سات فیصد ووٹ وصول ہوئے مگر ان سات فیصد کی بھاری اکثریت نے سودے کی توثیق کے حق میں لبیک کہا تو یہی سات فیصد جنرل ضیاء الحق کے اسلامی جھرلو کی بدولت ننانوے فیصد میں بدل گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ عوام کو چوائس' موازنے اور آپشنز سے محروم کرنے کا تیکنیکی ایوارڈ اس امریکی سیلزمین سے پہلے ہمارے مرحوم صدر کو دیا جانا چاہئے وہی اس کے اصل حقدار ہیں۔ ریفرنڈم کا ننگ سب کے سامنے برپا ہوا' سبھی نے دیکھا اور سب کو پسند' ناپسند کے جھنجھٹ سے نجات بھی مل گئی مگر اس سے پہلے اور اس کے سوا بھی جنرل ضیاء الحق طرح طرح کے ریفرنڈم جیتے ہوئے' جھرلو کے آزمودہ کار' راستہ بنانے' بچ نکلنے اور مسلّط ہو جانے کے

فطری وصف سے آراستہ تھے۔

اس واقعے کی جس قدر سنجیدگی سے تحقیق ہونی چاہیے تھی کہ آخر وہ کون سے عناصر تھے جو جنرل ضیاء الحق کے بطور چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر میں معاون ثابت ہوئے اس بارے میں اسی قدر لاپروائی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کا اپنی تمام تر شخصی کمزوریوں' غیر متاثر کن شخصیت' مطلوبہ اہلیت' قیادت کی صلاحیت اور تجربے کی کمی کے باوجود بھی ان کا چیف آف آرمی سٹاف بن جانا کئی طرح کے مضمرات کی طرف کھلا اشارہ ہے۔

بار بار کے اس وجہ تنازعہ اور خرابی کی جڑ پر سنجیدگی سے توجہ دی جانی چاہیئے کہ آرمی چیف کے تقرر کے لئے سول حکومت کے سربراہ یا مملکت کے سربراہ کے لئے کوئی فارمولا' کوئی ضابطہ اور معیار کیوں مروج نہیں ہے جیسا کہ دوسرے اداروں میں ہے مثلاً سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے لئے تو سینیارٹی کا اصول موجود ہے مگر چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر میں سیاسی وفاداری' نظریاتی رجحان' برادریوں اور سیاسی حلقوں کا اثر ونفوذ اور اسی طرح کے دوسرے عناصر کو معیار بنا لیا جاتا ہے اگر خالصتاً پیشہ ورانہ اہلیت اور سینیارٹی کی بنیاد پر آرمی چیف کا تقرر کیا جاتا تو جنرل ضیاء الحق کو اس منصب پر فائز ہو جانے کے لئے ایک اور عمر درکار ہوتی۔

یہ کیوں ضروری ہے کہ چیف آف آرمی سٹاف حکومت وقت کا موافق ہو' مخالف ہو' طرف دار ہو یا برطرف کر دینے والا ہو۔ انتہائی پیشہ ورانہ نوعیت اور ہمہ وقت قیادت کے متقاضی منصب پر فائز فرد سے یہ صریحاً زیادتی ہے کہ اسے بھی سیاسی بد رو میں غوطے دیئے جائیں۔

کرنل کے عہدے کے بعد جنرل ضیاء الحق کی ترقی کے مدارج جس قدر تیزی سے طے ہوئے اسی قدر پر اسرار اور غیر شفاف بھی ہیں ورنہ ان جیسے

واجبی ذہانت، بہشتی زیور گریجویٹ، غیر تسلی بخش ریکارڈ اور قیادت کی اہلیت کے شدید فقدان کے حامل شخص کا اس ذمہ دار منصب پر فائز ہو جانا مملکت کی بد قسمتی، عوام اور اس عہدے کی توہین کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی ترقی کی شرائط مروجہ ومطلوبہ سے زیادہ خفیہ اور اندرون خانہ ہی تھیں۔

جنرل ضیاء الحق کے اس عہدے پر فائز ہو جانے میں کسی مضبوط اور پراسرار ہاتھ کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تقرر کے پیچھے دو ہی ہاتھ ہو سکتے تھے ایک تو اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جو کہ عموماً" بے عملوں، بدعہدوں اور دو رخوں کے پیچھے کم ہی ہوتا ہے دوسرا امریکی ہاتھ جو کہ ایسے اوصاف وکردار والے فرد کے پیچھے ہو سکتا ہے کہ جس طرح کے جنرل ضیاء الحق تھے۔ یوں بھی جس عرصے میں جنرل ضیاء الحق نے اردن میں خدمات انجام دیں، فلسطین، اردن اور لبنان کے اس پر آشوب دور میں ایک محتاط اندازے کے مطابق مشرق وسطیٰ کے اس علاقے میں ہر چوتھا آدمی موساد کا مخبر اور ہر پانچواں آدمی سی آئی اے کا سنپولیا ہی ہوتا تھا۔

اردن میں پاکستان کے ملٹری مشن کا سربراہ نہ ہونے کے باوجود بھی جنرل ضیاء الحق نامعلوم وجوہات کی بنا پر شاہ حسین مرحوم کے بہت قریبی جانے جاتے تھے۔ شاہ حسین اور سی آئی اے کے درمیان جس طرح کا گہرا بھائی چارہ موجود تھا عین ممکن ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی مطلب برار فطرت بھی اس بھائی چارے کی زد میں آگئی ہو اور واپسی پر جنرل صاحب کچھ چارہ اپنے ساتھ بھی لیتے آئے ہوں۔

جنرل محمد یحییٰ خان اور جنرل گل حسن خان بطور جنرل ضیاء الحق کے سینئر آفیسرز اور کمانڈر انچیفس ان پر بہت مہربان رہے ابو الفضل اور ملا دو پیازے

کے درمیان اشتراک عمل کی نوعیت والی اس راز داری سے مملکت پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ پاکستان آرمی میں اپنی نوعیت کی یہ واحد مثال ہو گی کہ ایک ایسا نااہل اعلیٰ قیادت کے منصب پر فائز ہو گیا کہ جس کے بارے میں واضح طور پر یہ خفیہ رپورٹ موجود تھی کہ "یہ شخص پاکستان آرمی میں ایک آفیسر کے طور پر موزوں نہیں ہے" اس واقعے کو جنرل گل حسن خان نے قدرے تفصیل سے اس طرح بیان کیا ہے:

"جنرل محمد ضیاء الحق 1970ء کے دوران اردن وفد کے ساتھ' بریگیڈیئر کے طور پر فرائض کی انجام دہی کے دوران اپنے ترغیب پذیر امتیازی اوصاف کے باعث اپنی حد سے باہر نکل گیا تھا۔ قدرتی طور پر' اس نے بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) نوازش علی خان' کو جو اومان (Amman) میں پاکستان ملٹری مشن کے سربراہ تھے کو پریشان کیا تھا۔ نوازش نے ایک بے حد موزوں خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اس کے خلاف ایک خفیہ رپورٹ بھجوائی تھی' جو ان الفاظ پر ختم ہوتی تھی: "یہ پاکستان آرمی میں ایک آفیسر کے طور پر موزوں نہیں"

(He is not fit to be an officer in the Pakistan Army) اسے ضیاء الحق کی خوش قسمتی سمجھئے کہ فلک کے ستاروں کی گردش اس کے لئے درست سمت میں تھی اور جنرل یحیٰ نے میری مداخلت کی وجہ سے اس تاریخی رپورٹ کو خارج کر دیا تھا۔

1970ء میں اردن کے اپنے مختصر دورے کے دوران میں ضیاء الحق سے ملا' وہ اومان میں ہمارے ملٹری مشن کا ایک ممبر تھا' جس کی سربراہی جنرل نوازش علی کر رہا تھا۔ موخرالذکر کو ضیاء الحق کے بارے میں بہت کچھ کہنا تھا' حالانکہ مجھے کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی بات قابل

تعریف نہ تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ شاید اس نے نوازش کو اپنے رویے سے غلط طور پر پریشان کیا ہو گا اور اس سے زیادہ نہیں۔ اومان سے ایک یا دو ماہ واپسی کے بعد میرے دیرینہ دوست پیر عبداللہ شاہ نے مجھے اطلاع دی کہ وہ ہفتہ وار تعطیل گزارنے مہمان کے طور پر راولپنڈی میرے گھر آئے گا۔ پیر گائیڈز کیولری میں ضیاء الحق کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ ہفتے کے روز پیر آیا اور مجھے بتایا کہ وہ ایک عفو ودرگزر (Mercy) کے مشن پر آیا تھا۔ نوازش علی نے ضیاء الحق کو ایک بے حد خراب سالانہ خفیہ رپورٹ دی تھی اور اگر اس رپورٹ کو منسوخ نہ کیا گیا تو اس کا مطلب ضیاء الحق کے کیرئیر کا خاتمہ ہو گا۔ میں نے رپورٹ کی ایک کاپی طلب کی لیکن پیر نے خود اسے پڑھا تک نہ تھا۔ میں نے پیر سے پوچھا کہ ضیاء الحق کہاں تھا۔ وہ دونوں کوہاٹ سے راولپنڈی اکٹھے آئے تھے لیکن مجھے بتایا گیا کہ اسے میرا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگلے پیر کو جنرل حمید باہر دورے پر گیا ہوا تھا اس لئے صدر' جو عام طور پر پرنسپل سٹاف آفیسروں کی میٹنگ کی صدارت کرنے جی ایچ کیو آیا تھا' کا استقبال مجھے کرنا تھا۔ جب میٹنگ ختم ہو گئی تو میں نے ضیاء الحق کی رپورٹ کا ذکر اس سے کیا۔ اس نے وہ پڑھ لی تھی۔ مگر میری سفارش پر اس نے نہایت مہربانی سے اسے ختم کر دیا۔

اتفاقاً یہ پہلا موقع نہ تھا کہ میں نے ضیاء الحق کی مدد کر کے اسے بچایا تھا۔ دراصل، اسے اردن میں تعینات کروانے میں بھی میں ہی وسیلہ بنا تھا۔ 1970ء کے دوران کوئٹہ میں وار کورس (War Course) شروع ہونے سے بمشکل چند روز قبل' جس پر بھیجے جانے کے لئے اسے نامزد کیا گیا تھا' وہ ڈر گیا اور دوبارہ کرنل پیر عبداللہ شاہ کی وساطت سے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے جنرل یحییٰ سے' مطلوبہ کام کی گذارش کی تھی۔ کافی بحث کے بعد وہ مان گیا

اور مجھ سے پوچھا آیا وہ اردن جانا پسند کرے گا۔ میرا جواب تھا کہ اگر اسے کورس پر نہیں بھیجا جاتا تو ضیاء الحق جہنم کو بھی جانے کے لئے تیار تھا۔

میں نے ضیاء الحق کی مدد اس لئے نہیں کی کہ وہ کسی حوالے سے میرا کوئی رشتہ دار تھا' بلکہ اس لیے کہ اس نے براہ راست میرے زیر کمان سروس کی تھی اور میں فطرتاً اپنے ماتحتوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ مجھے کیا علم تھا کہ ضیاء الحق کی مدد کر کے ایک روز میں اسے پاکستان پر مسلّط کر دوں گا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر' جو چند سال قبل میجر جنرل نوازش علی نے اس کو سمجھا تھا اس نے اپنے آپ میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں لائی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس نے بھٹو کی طرف سے ذلتیں' دھتکاریں اور اسی قسم کی دوسری اہانت آمیزیاں قابل تعظیم طور پر برداشت کیں' اس لیے کہ وہ اس کو اپنا مربّی سمجھتا تھا' بھٹو اپنی کتاب "اگر میں قتل کر دیا جاتا ہوں" میں کہتا ہے۔ "اس نے کچھ ایسے ہی انداز میں پہلے اور پھر آرمی چیف مقرر کئے جانے کے بعد مسلسل سرگرمی کے ساتھ مجھے خراج عقیدت پیش کیا۔ واقعی' جیسا کہ میں نے واضح کیا ہے' یہاں تک کہ مارشل لا نافذ کئے جانے کے بعد بھی اس نے تعریف و توصیف میں مجھے آسمانوں پر چڑھائے رکھا۔"

(جنرل گل حسن خان: آخری کمانڈر انچیف صفحہ 476 تا 478)جنرل گل حسن یہاں ڈنڈی مار گئے دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ جنرل نوازش کی رپورٹ کو آشکارا کر دیتے' چوروں کا چوروں کو تحفظ دینے کا دباؤ ان کے آڑے آگیا ہو یا اس میں جو بھی امر مانع رہا مگر جنرل نوازش کی رپورٹ کے مندرجات کا اندازہ لگانے کے لئے کسی انتہائی اعلیٰ درجے کی ذہانت یا تصوفانہ قیافہ شناسی کی ضرورت ہی کہاں ہے ؟۔ سبھی کچھ تو عریاں اور آشکارا ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے جنرل گل حسن خان کے زیر نگرانی جتنا بھی عرصہ

گزارا اور جس طرح کی خدمات انجام دیں جنرل گل حسن نے اس کا تذکرہ خاصے فلسفیانہ مگر دلچسپ انداز میں کیا ہے جس سے جنرل ضیاء الحق کے کردار کی گرہیں کھولنے اور پرتیں پرتنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ جنرل گل حسن خان مزید کہتے ہیں کہ

"میں اس سے قبل کا ایک اور واقعہ یاد کرتا ہوں جو اس کے کردار پر زیادہ روشنی ڈالتا ہے۔ 10 اپریل 1966ء کو جنرل موسیٰ نے مجھے بتایا کہ اس نے فرسٹ آرمرڈ ڈیژن کی کمانڈ کے لئے مجھے منتخب کیا تھا۔ وہ چند ثانیئے جو مجھے اپنے دفتر آنے تک لگے' ان میں مجھے اس غیر معمولی ذمہ داری کا احساس ہوا جس کا مجھے ملتان میں سامنا کرنا تھا۔ جیسے ہی میں نے کام کی طرف توجہ دینے کے لئے خود کو تیار کیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ فون کرنے والا لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الحق (بعد میں جنرل / صدر) جنرل سٹاف آفیسر گریڈ 1 فرسٹ آرمرڈ ڈویژن تھا۔ اپنی مبارکبادی کے الفاظ بھرپور انداز میں ادا کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا کہ میں ملتان کب آرہا تھا۔ میں نے بتایا کہ اسے اس کے بارے میں زیادہ تشویش کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے میرے پروگرام کے متعلق اطلاع کر دی جائے گی۔ اس کے ساتھ میرے لہجے میں روکھاپن اس لئے تھا کیونکہ میں یہ معمہ حل نہ کرسکا کہ چیف کے مجھے بتانے کے چند منٹوں میں اس نے میرے پروموشن کے بارے میں کیسے دریافت کر لیا تھا؟۔

ملتان پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ضیاء الحق الگ تھلگ ایک نرالا انسان تھا اس نے جان بوجھ کر خود کو الگ تھلگ کئے رکھا' یا اس کے ساتھیوں نے اس سے فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ میرے کرنل سٹاف فریدی رحمان نے تصدیق کی کہ اپنے سٹاف میں ضیاء الحق زیادہ پسندیدہ شخصیت نہ تھا۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے تیار نہ تھا' کیونکہ بریگیڈیئر کے لیول پر ایسی کند

ذہن ہستیاں موجود تھیں، جن کو پہلے ہٹانے کی ضرورت تھی۔ دوسرے یہ اہم اقدام اس لئے بھی ضروری تھا کہ بجائے باہر سے اجنبی لانے کے میں چاہتا تھا کہ اپنے بہتر تربیت یافتہ بریگیڈئیروں کا ایک گروپ وجود میں لایا جائے، جو ضرورت کے وقت دونوں آرمڈ ڈویژنوں کی کمان سنبھال سکے۔ میرے نزدیک تباہ کن نتائج سے بچنے کا یہی ایک راستہ تھا۔

پہلے چند ماہ کے دوران مجھے بادل نخواستہ ایک کمانڈنگ آفیسر کو برطرف کرنا پڑا اور باہر سے اس کا متبادل منظور کرنے کے بجائے، میں نے اس یونٹ کی کمانڈ کے لئے ضیاء الحق کی پوسٹنگ کو مفید خیال کیا۔ اس یونٹ میں اس کی موجودگی کے دوران حالات کسی حد تک بہتر ہوگئے۔ آخر کار جب میں نے دسمبر 1968ء میں کمانڈ چھوڑی تو سنیارٹی کے مطابق ضیاء الحق کو کرنل سٹاف مقرر کیا گیا تھا۔

ویانہ میں بھٹو نے آرمی چیف کے لئے جو فہرست دی تھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس فہرست کے آخر میں جنرل محمد ضیاء الحق کا نام تھا۔ مجھے چند ذرائع، جنہیں قابل یقین سمجھتا ہوں، سے معلوم ہوا کہ بھٹو کے ملتان کے دوروں کے دوران، جہاں جنرل ضیاء تعینات تھا، اس نے اپنے طور طریقوں سے قابل تعریف حد تک، اپنے ذاتی مفاد کو بڑھایا، اس کے اس رحجان کو بھٹو کی حسّاس صلاحیتیں نظر انداز نہ کر سکیں۔ جلد ہی ضیاء کو امتحان میں ڈالا گیا۔ بھٹو نے اسے ان باغیوں کے خلاف کورٹ مارشل کا پریذیڈنٹ نامزد کیا، جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، ایک ایسا فرض منصبی جو کہ ان دونوں کے مستقبل کے تعلقات کے حوالے سے زیادہ اہم ہو گا۔ وقتی طور پر جنرل کو وزیراعظم سے بلا واسطہ رابطہ قائم کرنے کا فائدہ حاصل ہو گیا۔ دراصل مجھے ایک سے زیادہ ذرائع نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق کو کورٹ مارشل کا پریذیڈنٹ مقرر کر کے بھٹو خود چیف سرکاری

وکیل اور جج بن گیا۔

1974ء میں نومبر کے ابتداء میں جنرل ضیاء الحق نے تاش کا سب سے بڑا پتا (حکم کا یکّہ کھیلا۔ بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ اگلا آرمی چیف وہی ہوگا۔ آرمرڈ کور کے کرنل کمانڈنٹ کی حیثیت میں' اس نے اپنے پیش رو کی ملی بھگت سے بھٹو کو کور کا کرنل انچیف مقرر کیا۔ بھٹو نے اپنی کتاب "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" (If I am Assassinated) میں تسلیم کیا ہے کہ وہ جنرل اس تجویز کا ذمہ دار تھا۔ اتفاقاً" پاکستان آرمی میں یہ ایک پہلا موقع نہ تھا کہ ایسا تقرر عمل میں لایا گیا تھا، لیکن یہ بے مثل اس لئے تھا کہ ایک سویلین جس کا آرمرڈ کور سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا، اسے اس طرح کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

وہ تقریب کھاریاں چھاؤنی میں منعقد کی گئی تھی' جہاں 6 آرمرڈ ڈویژن نہایت سازگار ماحول میں مقیم تھا اور اس کے ساتھ ہی ان آسودہ ایام میں اس کی کمانڈ میجر جنرل سید وجاہت حسین کر رہا تھا' اس کی طرح بخوشی کام کرنے والا جوشیلا ساتھی' جو اتنے بڑے شو کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ واقعی ایک شاندار منظر تھا' جسے وزیراعظم کی مدح سرائی میں تقاریر کے دوران اس کی ان خدمات کا ذکر کیا گیا' جو اس نے آرمی کی خاطر انجام دی تھیں۔ کور کا ایک مفید ممبر بنانے کے لئے بھٹو کو ٹینک فائرنگ رینج پر لے جایا گیا' جہاں اس نے ٹینک کی بڑی گن' پٹرول سے بھرے بیرلوں کے ایک جھرمٹ پر فائر کی' تاکہ جب اس پر ضرب لگے تو آگ کے شعلے بھڑک اٹھیں' اس طرح نئے کرنل انچیف کو اچھی اور پوری طرح روحانی طور پر پاک کر دیا گیا۔ گن کو پہلے ہی سے ٹارگٹ پر لگا دیا گیا تھا اور بھٹو کو صرف بٹن دبانا تھا' لیکن پھر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں'

ایک آفیسر کو ٹارگٹ کے نیچے ایک چھوٹے چارج کو آگ لگانے کے لئے ٹارگٹ سے کچھ دور ایک مورچے میں بٹھایا گیا تھا' تاکہ کرنل انچیف کے فائر کا نشانہ خطانہ ہو جائے۔ تمام کا تمام شو نہایت باریک بینی سے ترتیب دے کر بے مثل درستگی سے عمل میں لایا گیا تھا۔ ٹینک کے ارد گرد کئی ایکڑ زمین کو تیل سے سیراب کیا گیا تھا' یہ یقین کرنے کے لئے کہ گن کے دھماکے سے کوئی گرد نہ اڑے اور جیسے ہی آرمرڈ کور کے بگلچیوں کی آواز بند ہوئی تو جنرل محمد ضیاء الحق' اس یقین دہانی کے ساتھ کہ وہ بلاشک وشبہ اگلا چیف آف آرمی سٹاف ہو گا ضرور اپنی کارگزاری سے خوش ہوا ہو گا اور یہ کہ اس نے ذاتی ترقی کی خاطر آرمرڈ کور کو ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا' اور وہ اس کے باعث پریشان نہ تھا۔ اگر یہ سارا تماشا مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا تو اس سے انکار نہیں کہ یقینی طور پر اس پر دل کا دورہ پڑ جاتا۔"
(جنرل گل حسن: آخری کمانڈر انچیف صفحہ 74 تا 475)

جنرل ضیاء الحق کے جوڑی دار خاص اور فیئر پلے ماسٹر' جنرل فیض علی چشتی بھی جنرل ضیاء الحق کے بارے میں کم وبیش اسی طرح کی رائے رکھتے ہیں' جیساکہ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں آرمی کے دوسرے جرنیلوں کی رائے ہے۔ جنرل فیض علی چشتی نے جنرل ضیاء الحق کو بہت قریب سے دیکھا اور انہیں جنرل ضیاء الحق کی کارکردگی' کردار اور کارگزاری کے مشاہدے کا طویل تجربہ ہوا۔ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں جنرل نوازش کی رپورٹ میں جو بات جنرل گل حسن خان نے خاصے ڈھکے چھپے انداز میں کی' جنرل فیض علی چشتی نے ذرا واضح طور پر کہہ دی:

"میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ غالباً سی آئی اے کو انہوں نے اپنا آلہ کار بنا لیا تھا۔ آخر جنرل ضیاء نے ٹیکساس کی ریاست کے شہر ہیوسٹن میں پاکستان کے

اعزازی قونصل مسز ہیرنگ سے کیوں دوستانہ تعلقات قائم کئے تھے؟ ممکن ہے اردن میں قیام کے دوران ضیاء سی آئی اے اور سعودیہ کے بنیاد پرست مسلمانوں سے قریب آگئے ہوں۔ یہ بات یقینی ہے کہ بھٹو صاحب کے مزاج میں دخیل ہونے کے لئے کسی نہ کسی نے انہیں ضرور سبق پڑھایا تھا اور یہ کام انہوں نے بڑی کامیابی سے مکمل کیا۔

(بھٹو' ضیاء اور میں: جنرل فیض علی چشتی۔ صفحہ 86)

جنرل فیض علی چشتی نے اس امر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ آخر وہ کون سے عناصر تھے اور جنرل ضیاء الحق کی وہ کون سے خدمات اور صلاحتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے شاطر اور معاملہ پرکھ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر براجمان ہوئے۔

"چیف آف دی آرمی سٹاف کے عہدہ پر ترقی کے لئے زیر غور سات لیفٹیننٹ جنرلوں کے نام تھے۔ سینیارٹی کے حساب سے ان کے نام یہ تھے۔ جنرل محمد شریف' آفتاب احمد خان' محمد اکبر خان' عظمت بخش اعوان' ملک عبدالمجید' غلام جیلانی خان اور محمد ضیاء الحق۔ ترقی کے لئے جنرل ٹکا خان نے لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان کا نام تجویز کیا تھا اور اگر یہ منظور نہ ہو تو لیفٹیننٹ جنرل محمد شریف کو سی او اے ایس بنا دیا جائے۔ لیفٹیننٹ جنرل آفتاب اور لیفٹیننٹ جنرل عظمت کو صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے ترقی کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل مجید اور لیفٹیننٹ جنرل ضیاء کو اس لئے خارج کر دیا گیا تھا کہ وہ ابھی چند عرصہ قبل ہی ترقی حاصل کر چکے تھے اور اس عہدے کے لئے جس تجربے کی ضرورت تھی' وہ انہیں حاصل نہیں ہوا تھا۔ جنرل جیلانی اس عہدے کے اہل قرار نہیں دیئے گئے کیونکہ انہیں کمانڈ کا

تجربہ نہیں تھا۔

"چند دنوں بعد گولف کھیلتے ہوئے میجر جنرل صغیر حسین نے جو صدر کے ملٹری سیکرٹری تھے' مجھے بتایا کہ لیفٹیننٹ جنرل ضیاء اگلے سی او اے ایس ہو رہے ہیں۔ میں نے اس بات کی صداقت پر شک کا اظہار کیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ ترقی کے لیے کس کا نام پیش ہوا ہے اور کس کا نہیں۔ میں نے پوچھا کہ خبر انہیں کہاں سے ملی ہے؟ انہوں نے کہا کہ خود لیفٹیننٹ جنرل ضیاء نے ان سے کہا ہے کیونکہ وہ ملتان میں پیپلز پارٹی کے مشاہیر کے توسط سے وزیراعظم کے بہت قریب ہو چکے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے جنرل ضیاء کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے' اس لئے اس پر کیا کہہ سکتا ہوں؟

چیف آف آرمی سٹاف کے لئے سفارش ارسال کرنے کے ایک ماہ بعد جنرل ٹکا خان نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور بتایا کہ وزیراعظم نے انہیں مطلع کیا کہ آج سہ پہر وہ کابینہ کے اجلاس میں یہ اعلان کرنے والے ہیں کہ لیفٹیننٹ جنرل اکبر اور لیفٹیننٹ جنرل مجید کو ریٹائر کر دیا گیا ہے' لیفٹیننٹ جنرل شریف کو جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی نئی آسامی پر مقرر کر دیا گیا۔ (یہ ایک عیاشی تھی جس کا ملک متحمل نہیں ہو سکتا تھا) اور لیفٹیننٹ جنرل ضیاء کو ترقی دے کر چیف آف آرمی سٹاف متعین کر دیا گیا ہے۔ ریٹائرمنٹ اور تعیناتی کے یہ احکام اسی شام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہو جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ جب فوج نے سفارش نہیں کی تو جنرل ضیاء کو چیف آف آرمی سٹاف کیوں بنا دیا گیا؟ بھٹو صاحب کو ان میں کیا خوبی نظر آئی؟ جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب کے دل میں کس طرح گھر کیا؟ جنرل کا حمایتی حلقہ کون سا تھا؟ بھٹو صاحب جیسے شخص کو متاثر کرنے کا سبق انہیں کس نے

پڑھایا؟

پانچ جولائی 1977ء سے اس مسئلے کے متعدد پہلوؤں کے بارے میں کئی باتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ جنرل ضیاء نے یہ خود کہا کہ انہیں کسی انسان نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے چیف آف آرمی سٹاف مقرر فرمایا۔ اس لئے وہ اپنے اعمال کے لئے صرف اللہ ہی کو جواب دہ ہیں اور وہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے لئے مقدس مشن پر کام کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ کہ وہ سی او اے ایس کیسے بنے؟ اگر جنرل ضیاء زندہ رہتے تو پھر بھی حل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سچ بات کبھی نہ بتاتے۔ ہمارا تجربہ یہی تھا کہ وہ سچ بولنے والوں میں سے نہ تھے۔ یہ امر تو مسلم ہے کہ بھٹو صاحب کی عنایتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے پرلے درجہ کا خوشامدی ہونا ضروری تھا۔ ابھی حال ہی میں مجھے چند ایسی باتوں کا علم ہوا ہے' جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے جنرل ضیاء نے پہلے بھٹو صاحب کی توجہ اور بعد میں نظر کرم حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کیا۔ یکم جنوری 1988ء کو لاہور میں ایک عشائیہ پر میری ملاقات کرنل ظہور چغتائی سے ہوئی۔ وہ جنرل ضیاء کے دوست تھے اور ان کے ساتھ ہی 1955ء میں کوئٹہ سٹاف کالج کا کورس کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ملتان میں اپنے قیام کے دوران جنرل ضیاء پی پی کے لیڈوروں کے مکان پر ان سے جا کر ملا کرتے تھے۔ ان لیڈروں میں خاص طور پر صاحبزادہ فاروق' حامد رضا گیلانی' صادق حسین قریشی اور سجاد حسین (جنہیں انہوں نے گورنر پنجاب مقرر کیا تھا) شامل تھے۔ وہ مختلف تقریبوں کے دعوت نامے مانگ مانگ کر حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے اس طرح کی خوشامد سے ذوالفقار علی بھٹو کی قربت حاصل کی ' تاکہ وہ کمانڈر انچیف کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو جائیں۔ جنرل ضیاء نے کرنل چغتائی کو اپنا ایک خط بھی دکھلایا تھا' جو انہوں نے جنرل صاحبزادہ

یعقوب کو واشنگٹن لکھا تھا کہ وہ بھٹو صاحب کو آرمڈ کور کے کرنل انچیف کی تقرری کرانے میں مدد دیں۔ انہیں سی او اے ایس جنرل ٹکا خان کے تعاون سے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔

لیکن یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کیا جنرل ضیاء سدا سے ہی ایسے تھے یا حالات نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا؟ سی او اے ایس بننے کے لئے بھٹو صاحب سے قریب ہونے کی یہ ترکیب انہیں کس نے سمجھائی؟ کیا یہ کسی ایسے فرد کی گہری سازش تھی، جو پاکستان میں جمہوریت نواز عناصر کو سبق سکھانا چاہتا تھا؟"

(بھٹو، ضیاء اور میں : فیض علی چشتی صفحہ 85)

بعد میں بیگم نصرت بھٹو کے اس بیان سے بھی اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کے قریب آنے کے لئے کیا کیا جوکھم نہیں اٹھایا اور خود کو کیسے کیسے بے آبرو نہیں کیا۔ بیگم نصرت بھٹو کہتی ہیں کہ :

"ہر چند صادق پیلس کے قیام کے دوران پریذیڈنٹ کی قیام گاہ کے آس پاس سیکیورٹی کا انتظام موجود تھا، مگر اس کے باوجود ایک رات بھٹو کے سکیورٹی انچارج نے ہمیں بتایا کہ میجر جنرل ضیاء الحق بہ نفس نفیس بھٹو صاحب کے لئے سکیورٹی کی نگرانی کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے میجر جنرل ضیاء الحق کو اپنے پاس طلب کر کے اس سلسلہ میں ان سے استفسار کیا تو ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کی شخصیت اور قوم کے لئے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک طویل تقریر کر کے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ قوم کے بطل عظیم (بھٹو صاحب) کے قیام ملتان کے دوران خود کو ان کی سکیورٹی کا براہ راست ذمہ دار سمجھتے ہیں اس لئے وہ اپنی خوشی سے بھٹو صاحب کے گارڈ کے طور پر صادق پیلس

میں موجود رہنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب ضیاء الحق کے اس جذبے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے انتہائی فخریہ انداز میں کہا "مجھے ٹکا خان کے بعد اپنا اگلا چوائس مل گیا ہے" بھٹو صاحب نے ضیاء الحق کو اس واقعہ کے جلد ہی بعد لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی دے دی اور اشارتاً ضیاء الحق کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ (بھٹو صاحب) انہیں کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب بھٹو صاحب نے ضیاء الحق کو پاکستان کا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا تو ملک کے سیاسی اور فوجی حلقوں کو اس پر انتہائی حیرت ہوئی تھی۔ ضیاء الحق ایک جونیئر جرنیل تھے اور کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی چیف آف آرمی سٹاف کے عہدہ پر ترقی پا جائیں گے۔ بھٹو صاحب کے علاوہ یہ بات صرف میں جانتی تھی یا ضیاء الحق جانتے تھے کہ وہ جنرل ٹکا خان کے بعد فوج کے کمانڈر انچیف ہوں گے۔ جب ضیاء الحق ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے تو ہمیں اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بھٹو صاحب کو ضیاء الحق پر بے پناہ اعتماد تھا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ ضیاء الحق کو بہت ہی نچلی سطح سے اوپر لائے تھے۔ 5 جولائی 1977ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تھینکس ضیاء الحق کے الفاظ اسی پس منظر میں کہے تھے۔ مہذب الفاظ میں انہیں اور کیا کہہ سکتی تھی"۔ (مون ڈائجسٹ : جولائی۔اگست۔ صفحہ 79)

جنرل فیض علی چشتی نے جنرل ضیاء الحق کی پیشہ ورانہ ناقص کارکردگی، نااہلی اور ان کی حاضر جناب خوشامدانہ طینت کے کئی حوالے دیئے ہیں۔ جنرل چشتی نے اس چار کے ٹولے کا بھی ذکر کیا ہے جو راتوں رات ارب پتی، بااختیار اور سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔ جنرل فیض علی چشتی کی مہیا کردہ ان معلومات کو اس لئے بھی مستند مانا جا سکتا ہے کہ اکثر دیگر ذرائع نے بھی ان کی

تصدیق کی ہے یا اس سے ملتی جلتی اطلاعات و واقعات کی نشاندہی کی ہے وہ مزید کہتے ہیں کہ

"ایک اور معاملہ جو زبانی زبانی مجھ تک پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ 1975ء میں جب جنرل ضیاء ملتان میں کور کمانڈر تھے تو انہوں نے وزیراعظم کو ملتان مدعو کیا۔ وزیراعظم کے سفر کے لئے جو راستہ مقرر کیا گیا تھا وہ فوجی افسروں کی کالونی سے گزرتا تھا۔ جنرل ضیاء نے خواتین اور بچوں سے کہا کہ وہ وزیراعظم کے استقبال کے لئے گھروں سے باہر آجائیں اور تالیاں بجا کر استقبال کریں۔ ایک افسر نے اس پر اعتراض کیا۔ اس پر جنرل ضیاء نے مجھ سے کہا کہ اس افسر کو ریٹائر کر دیا جائے۔ ملٹری سیکرٹری کی حیثیت سے میں ایسا کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ اس بے چارے افسر کا قصور کیا تھا لیکن جنرل ضیاء نے سی او اے ایس ہونے کے بعد اس افسر کو قبل از وقت ریٹائر کر دیا۔

سلیکشن بورڈ کے لئے افسروں کے کاغذات تیار کرتے وقت میں نے دیکھا کہ جو افسر جنرل ضیاء کے ماتحت کام کر رہے تھے ان کی سالانہ کنفیڈنشل رپورٹیں موصول نہیں ہوئی تھیں۔ چند افسروں کی رپورٹیں دو دو سال سے نہیں آئی تھیں۔ میں نے انہیں ایک مراسلہ لکھا مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر میں نے انہیں فون کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا وہ جلد ہی یہ رپورٹیں بھجوا دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اکثر معاملات میں تاخیر کیا کرتے تھے میں نے ایک تنبیہی خط لکھا اور جنرل ٹکا خان سے اس پر دستخط کرا دیئے۔ اس کا تھوڑا بہت اثر ہوا۔ اپریل 1975ء میں جب وہ سلیکشن بورڈ کے سلسلے میں راولپنڈی آئے تو میں نے یہ رپورٹیں دو دو، چار چار کر کے روزانہ کے حساب سے لکھوائیں۔ ہر لحاظ سے یہ غیر ذمہ داری کی انتہا تھی اور اس کے کور کمانڈر اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں

لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ گویا کہ کوئی سیاسی ہاتھ ان کی پشت پر تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ نئے رتبے اور نئے عہدے سے ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے وہ ہنسے اور بولے "مرشد! میں احتیاط کروں گا" لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لفظ "مرشد" ان کا تکیہ کلام تھا۔

پیشہ ورانہ اصول کے مطابق اور فوجی تربیت کے مطابق ایک کمانڈنگ افسر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کو اس طرح تربیت دے کر رکھے کہ وہ کسی بھی وقت کمانڈنگ افسر کی جگہ سنبھال سکے۔ یہ ایک جنگی ضرورت ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ایک کمانڈنگ افسر کو توسیع دی جاتی ہے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس بناء پر دی گئی توسیع اس لئے دی جاتی ہے کہ سیکنڈ ان کمانڈ ہے تو ٹھیک ٹھاک مگر ایک سال بخشش کے طور پر کمانڈر کو دے دیں تو یہ حق تلفی ہے کیونکہ جس کا موقع کمانڈر بننے کا تھا اس سے وہ موقع چھین لیا گیا۔ اگر توسیع اس لئے دی جاتی ہے کہ سیکنڈ ان کمانڈ پوری طرح سے تربیت یافتہ نہیں ہے تو کمانڈر کو توسیع دینے کی بجائے سزا دینی چاہئے کیونکہ اس نے اپنے ماتحت کو جان بوجھ کر پوری تربیت نہ دی اور اس حالت میں کمانڈنگ افسر یا کمانڈر انچیف یا چیف آف دی آرمی سٹاف کو جلد از جلد ریٹائر کر دینا چاہئے۔ بھٹو صاحب نے تو صرف یہ تین ہی فیصلے جن کا تعلق بری فوج سے تھا' کئے تھے مگر بعد میں جنرل ضیاء نے تو ذہنی بددیانتی اور بددیانت فیصلوں کی انتہا ہی کر دی۔ انہوں نے تو بے شمار میجر جنرل' لیفٹیننٹ جنرل اور جنرل ایسے ایسے بنائے' جنہوں نے کبھی کمانڈ ہی نہ کی تھی۔ گویا کہ جرنیلی پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے نکل کر خوشامدانہ خطوط پر ملنے لگی۔ مومن ایسے ہی کرتے ہیں کیا۔؟

جنرل ضیاء کی شخصیت میں کوئی دل آویزی اور رنگینی نہ تھی اور حقیقت

حال تو یہ ہے کہ وہ افسروں اور جوانوں میں کبھی بھی مقبول نہ رہے۔ چیف بننے سے پہلے ملک میں تو انہیں مشکل سے ہی کوئی جانتا ہو گا۔ ظاہراً ان کا طور طریق ایک سیدھے سادے سپاہی جیسا تھا۔ وہ ہر بات بڑے غور سے سنتے تھے' جس سے کہنے والے پر یہ تاثر ہوتا تھا کہ انہیں ہر بات سے اتفاق ہے۔ لیکن وہ کرتے وہی تھے جو ان کے جی میں آتا تھا۔ جیسے ہی وہ سی او اے ایس کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے، ان کی شخصیت سازی کے لئے بڑے بڑے جتن شروع ہوگئے۔ کوشش یہ کی گئی تھی کہ ایک سادہ مزاج پاکباز مسلمان بنا کر پیش کیا جائے۔ ایک ایسی شخصیت جو سادگی پسند ہے اور جب وہ سی ایم ایل اے ہو گئے تو اس کوشش میں مزید شدت آگئی اس میں کتنی حقیقت ہے' وہ صرف اتنی ہے کہ صداقت میں کہیں کہیں ملاوٹ کر دی گئی تھی۔

عوام میں ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ دین دار مسلمان ہیں اللہ پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور تن بہ تقدیر رہتے ہیں' سچ تو یہ ہے کہ انہیں اپنی زندگی کی فکر کھائے جاتی تھی انہیں ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔ انہیں پتے کی تکلیف تھی لیکن جب تک وہ مجبور نہیں ہو گئے' آپریشن پر رضامند نہیں ہوئے۔ آخر کار جب حالت خراب ہوئی تو جنرل محمود الحسن نے ان کا آپریشن کیا۔

بھٹو صاحب کی طرح ضیا صاحب کو بھی کئی کئی قسم کی وردیوں کا بہت شوق تھا۔ بھٹو کے دور میں فوج کا سربراہ بنتے ہی انہوں نے فوج کے لئے رسمی وردیاں تبدیل کر دیں۔ پہلے ایک بہت اچھی سلیقہ والی وردی تھی جس کے کندھوں پر پیتل کے چاند ستارے ہوا کرتے تھے۔ ضیاء صاحب نے اس کے بدلے ایک سفید چمکدار یونیفارم سنہری بٹی ہوئی رسیوں کے ساتھ شروع کر دی۔ اسے پہنے ہوئے افسروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ہنسی آتی تھی۔ سنہری

رسیوڑ سے بٹا ہوا کندھے کا پھجا بہت ہی زیادہ نمائشی نظر آتا تھا۔ اسی لئے افسروں نے اسے پسند نہیں کیا کیونکہ اسے پہن کر افسر ہوٹل کے بڑے بیرے معلوم پڑتے تھے۔ چند ایک نے اس بارے میں شکایتیں بھی کیں۔

ضیاء نے کبھی دوسروں پر اعتماد کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اسی لئے وہ اختیارات دوسروں کو دینے کی بجائے تمام کے تمام اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ انہوں نے گذشتہ طریقے کے مطابق کسی کو ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر نہیں کیا۔ میں نے اس سلسلہ میں ان سے سختی سے کہا کہ آپ کا نائب مقرر کرنا ضروری ہے تاکہ آپ کی غیر حاضری اور خدانخواستہ موت کی صورت میں کام حسب معمول چلتا رہے اور کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ اس کے لئے جنرل شریف اور لیفٹیننٹ جنرل اقبال کے نام تجویز کئے' انہیں ضرورت کا احساس تو تھا لیکن کسی کی تقرری نہیں کی' وہ سی ایم ایل اے اور صدر پاکستان تو تھے ہی اس لئے بظاہر نائب مقرر کرنے میں ان کو کوئی خدشہ یا خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہئے تھا۔

ضیاء صاحب نے 16 ستمبر 1978ء کو صدر پاکستان کا منصب سنبھالا۔ فوج میں بہت کم لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ سی ایم ایل اے' سی او اے ایس اور صدارت کے تمام منصبوں پر خود ہی فائز ہو جائیں گے۔ جنرل شریف اور جنرل ضیاء کو مارچ 1979ء میں ریٹائر ہونا تھا کیونکہ ان کے موجودہ عہدے کی مدت تین سال گزرنے کے بعد مارچ میں ختم ہونے والی تھی۔ جنرل شریف نے یکم جنوری 1979ء سے ریٹائر ہونے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ جنرل ضیاء جنرل شریف کی جگہ پر چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کا عہدہ سنبھال لیں اور کسی اور کو سینیارٹی کے مطابق سی او اے ایس مقرر کر دیں اس پر ضیاء نے کہا کہ وہ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اس طرح تو

وہ سی او اے ایس کے رحم وکرم پر ہو جائیں گے۔

میں نے جواب دیا کہ فوج میں تقریباً چالیس جنرل ہیں۔ کیا ان کو کسی پر بھی اعتماد نہیں ہے اور اگر یہی حال ہے تو پھر ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

اور جنرل ضیاء اپنی ملازمت میں "توسیع" کے طفیل اپنی موت تک اس عہدے سے چمٹے رہے اور اس طرح ان کی حق تلفی کرتے رہے جو ان کی جگہ سی او اے ایس بن سکتے تھے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ پاکستانی فوج نظم وضبط کی بہت زیادہ پابند ہے اور وہ اپنے سی او اے ایس کے خلاف کبھی بغاوت نہیں کرے گی۔ وزیراعظم کو اقتدار سے ہٹانا فوج کے سربراہ کی زبردستی علیحدگی سے مختلف ہوتا ہے ضیاء صاحب نے اس اصول کو اپنے مفاد کے حصول کے لئے استعمال کیا اور ان کی موت بھی یونیفارم میں ہی ہوئی۔

ضیاء کے گرد مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ اکٹھا ہو گیا تھا' جنہوں نے فوج کے اعلیٰ عہدوں پر بتدریج تبدیلیاں کروائیں اور اس طرح چار کا ٹولہ پیدا ہو گیا۔ جن میں شادی بیاہ کے ذریعے تعلقات مزید مضبوط کر لئے گئے۔

ضیاء کے صاحبزادہ کی شادی جنرل رحیم الدین کی صاحبزادی سے ہوئی۔

جنرل اختر کے صاحبزادے نے جنرل رحیم الدین کی دوسری صاحبزادی سے شادی کی۔

جنرل اختر کے دوسرے بیٹے کا نکاح جنرل زاہد علی اکبر کی بیٹی سے ہوا۔

جنرل ضیاء سی او اے ایس تھے' جنرل رحیم الدین کو چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف مقرر کیا گیا۔ ان کے بعد جنرل اختر اس عہدے پر آئے اور جنرل زاہد کو واپڈا کا چیئرمین بنا دیا گیا۔

ان کلیدی افسروں کے علاوہ جنرل ضیاء نے چند ایسے افسروں کو ترقی دی' جو (عمر یا ملازمت کے لحاظ سے) ریٹائر ہونے والے تھے۔ ان کا تعلق مختلف

عہدوں سے تھا اور یہ ان کی مخصوص عنایتوں کے سزاوار قرار پائے۔ ضیاء کے قریبی حلقے میں تین ایسے افراد بھی شامل تھے جو یکے بعد دیگرے وفاقی سیکرٹری اطلاعات نشریات مقرر ہوئے۔ یہ مسعود نبی نور، ظہور آذر، (ضیاء کی طرح وہ بھی اسٹیفن کالج دہلی کے سابق طالب علم تھے) لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن تھے۔ سیکرٹری اطلاعات ونشریات کی حیثیت سے وہ ضیاء کی شخصیت کی تعمیراور تشہیر کے لئے ذرائع ابلاغ کو پوری طرح استعمال کرتے رہے۔

ضیاء صاحب کے سی او اے ایس کا عہدہ حاصل کرنے کے بعد فوج میں افسروں کی ترقی کے لئے لیاقت اور اہلیت کے جو اصول رائج تھے۔ ان میں ترامیم کر دی گئیں۔ معیار کی بات تو یہ تھی کہ ترقی صرف اور صرف لیاقت کی بنیاد پر دی جائے۔ افسروں کے بارے میں رائے زنی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جب تک وہ افسر کسی کے زیر کمان کام نہ کرچکا ہو' اس کے کام کے بارے میں اور کوئی رائے نہ دے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں بھی رائے دینے کی روایت نہیں تھی۔ چند سینئر افسروں نے نئے طریقوں کی مزاحمت بھی کی لیکن 1980ء سے بورڈ کے اجلاس میں متعلقہ افسر کی ملازمت کے کوائف پر بات چیت تقریباً موقوف ہو گئی۔ اس سے پیشتر تمام جنرل برابری کی سطح پر بورڈ میں ترقی کے نکات پر بحث کیا کرتے تھے۔ بعد میں ایسا بھی ہوا کہ کسی میجر کو ضیاء صاحب نے زبانی ہی کہہ دیا کہ اس کو ترقی دے دی گئی ہے اور اس طرح ترقی دینے کے طریق کار کو قطعی نظرانداز کر دیا گیا۔ اس کو سکھا شاہی کہا جاتا ہے۔"

(بھٹو' ضیاء اور میں: جنرل فیض علی چشتی صفحہ 88 تا 91)

یہ کہنا سراسر نازیبا ہے کہ اسلام پر برا وقت آیا، آگیا یا آنے والا ہے اسلام ایک ایسی اٹل سچائی، ایک مضبوط و محفوظ راستہ اور ہمیشہ قائم رہنے

والی حقیقت ہے کہ اسے کسی صورت آنچ نہیں ہے۔ اسلام کی حقانیت جنرل ضیاء الحق کے اسلام پھیلاؤ جیسے منصوبے کی زیر بار کبھی نہیں رہی۔

اسلام پر برا وقت نہیں آتا بلکہ برے لوگ اسلام میں در آتے ہیں۔ البتہ یہ لوگ اپنا منہ کالا کر لینے کے بعد کچھ نہ کچھ کالک مذہب اور معاشرے پر بھی پھیر دیتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش خواہ شعوری ہو یا لاشعوری بحر حال کالک بھرے ہاتھوں کے بدنمانشان اور دھبوں کو دھونا تو پڑتا ہی ہے۔

جنرل ضیاء الحق ہماری زمین میں کوڑھ کی ایسی قسم کاشت کر گئے ہیں کہ اسے کاٹتے کاٹتے اور دھوتے دھوتے ایک عرصہ لگ جائے گا اور اسے پوری طرح کاٹا اور دھویا بھی جاسکے گا یا نہیں یہ نہیں کہا جا سکتا۔

بد دیانتوں کو راستہ دینے والا' لوٹ مار پسند اور برائی پذیر معاشرہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ایسے بھرپور طریقے سے ابھر کر سامنے آیا کہ اچھے اور برے' نیکی اور بدی کی تعریف' تمیز اور نوعیت ہی بدل گئی۔

جنرل صاحب نے اپنی عمر' میراث اور کرامات تفویض کرنے کے لئے بھی ایسے گنی کو چھانٹا کہ جو خاندان اس ملک کا سب سے بڑا نا دہندہ ہے وہی ریاست کے سب سے اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہے۔ جس طرح میاں مافیا کو بار بار منتخب کرنے کی تین ہی وجوہات ہو سکتی ہیں' اسی طرح بے بی بد نظیر کو منتخب کرنے کی ایک وجہ بھی نہیں ہے۔ جن نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے' آخر وہ سچ کیوں نہیں ہوں گی اور کب تک نہیں ہوں گی۔ عوام کے اعمال کا عکس اور آئینہ حکمران ہی تو ہوتے ہیں۔

۱۔ ووٹ دہندگان کا حافظہ خطرناک حد تک کمزور ہو چکا ہے۔

۲۔ سرکاری مال کے ہڑپ کر لینے کو جرم نہیں بلکہ صلاحیت سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ منتخب کرنے کی شرط خدمت

خلق' کردار' دیانت اور نیک نامی نہیں رہی ہے۔

یہ نمبر دو ہیں اور ویسے بھی دو نمبر ہیں۔ وزیراعظم کے بعد قومی اسمبلی کا سپیکر ہی آئینی طور پر سربراہ بن سکتا ہے۔ گوہر ایوب خان بھی نادہندہ' قرضے معاف کرائے ہوئے کئی بار کے منتخبہ ہیں۔ گویا نمائندگی کے لئے نادہندگی' قرضوں کی معافی' مالی بد دیانتی اور ٹیکس کی عدم ادائیگی شرط اول ہے۔ اوصاف وکردار کی جو خوبیاں اور نمائندگی کی جو شرائط نمبر ایک اور نمبر دو سے شروع ہوتی ہیں۔ بہت دور تک جاتی ہیں اور گہرائی تک نظر آتی ہیں۔ غور سے دیکھو چاہے سرسری' اصل میں سارے ایک سے ہی ہیں' ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے' ایک جیسے' ایک سے بڑھ کر ایک بلکہ دوسرا بھی' اور دوسرا پہلے والے سے بھی سوا اور پہلا سب سے بڑھ کر، سب پر حاوی اصیل، حلقہ زن اور محاصرہ باز۔

شب خون، شب و روز

سرگودھا سے شمالاً" قریب تیس میل کی دوری پر لالہ موسیٰ کی طرف جانے والی برانچ ریلوے لائن پر چبّہ پرانا کے نام سے قدیم قصبہ واقع ہے، جو بعد میں پھلروان کے نام سے پکارا جانے لگا۔ گو کہ اس علاقے میں ترقی، جرائم، پسماندگی اور بے روز گاری کے بڑھنے سے کافی تبدیلیاں آئی ہیں مگر 1970ء کے عشرے میں بھی چبّہ پرانا ایسا ہی تھا، کچھ زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ اس علاقے میں بے روزگاروں کے ہجوم جب بھی اسی قدر بڑے ہوتے تھے، جتنے کہ آج ہیں۔ روزگار کی طرح تفریح کے مواقع بھی ناپید تھے۔ جہاں روزگار کے ہی لالے پڑے ہوں، وہاں تفریح کا بکھیڑا کون پالتا۔ سو تفریح کا واحد ذریعہ دوسرے شہروں سے آنے والے بازیگر، گشتی سینما، سلاجیت بیچنے والے پٹھان اور بنیادی جمہوریت کی برکات پر آدھے گھنٹے کی ڈاکو مینٹری فلم جو سال بہ سال ضلع کونسل والوں کی مہربانی سے عوام کو دکھائی جاتی، عوامی تفریح کے ذرائع تھے

1972ء کی سردیوں میں ایک صبح ایسی بھی آئی کہ جس نے چبّہ پرانا پر

چھائی ہوئی افلاس اور افسردگی کو فرط مسرت میں بدل دیا اور ایسی تفریح اپنے جلو میں لائی کہ جس نے کئی دنوں کے لئے قصبے کی کایا ہی پلٹ دی۔

نقارے پیٹنے والے ڈھول بجاتے جاتے تھے اور ان کے آگے آگے پانچ سات نوجوان لڑکے لڈی ڈالتے جاتے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھوں میں ریشمی کپڑے کے لمبے لمبے پرنٹنڈ مفلر تھے جنہیں وہ ہوا میں لہراتے کبھی کمر پر باندھ لیتے، کبھی گردن میں حمائل کر لیتے، ڈھول بجانے والوں کے پیچھے پیچھے چلنے والوں کا خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ جس میں سکول سے بھاگے ہوئے لڑکے، بالے، دودھ بیچ کر دیہاتوں کو واپس جانے والے گوالے اور کمیٹی کے خاکروب نمایاں تھے۔

ڈھول بجانے والے ایک مخصوص وقفے کے بعد ڈھول پیٹنا روکتے اور با آواز بلند اعلان کرتے کہ فخر پاکستان، شہنشاہ شہ سواراں جناب بشیر مستانہ سائیکل چیمپئن نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ چیمہ پرانا میں مسلسل سو گھنٹے تک سائیکل چلانے کا مظاہرہ کریں گے اور اس دوران زمین پر پاؤں نہیں لگنے دیں گے۔ یہ اعلان کیا ہوا، ہر طرف افراتفری در آئی، جمود زدہ قصباتی زندگی میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ جسے دیکھو اور جس طرف دیکھو بشیر مستانے کا قصہ، اس کی مہارت کی گواہی اور حوصلے کی شہادت اور اس کے فن پر تحسین آمیز کلمات بلند ہونے لگے۔ کہیں کہیں بھانجی مار اور معاملہ بگاڑ قسم کے جہاں دیدہ بزرگ بیچ بیچ میں شک کا پلچ بھی لگاتے دیکھے گئے۔ ان معترضین کا کہنا تھا کہ بشیر صاحب سائیکل تو چلا لیں گے مگر نیند کا توڑ کیسے کریں گے۔ مسلسل چار راتیں جاگنا اور سائیکل بھی چلانا خاصا ناممکن لگتا ہے۔ جواب میں موافقین اور بات سنوارو گروپ کہتا کہ یہی مشکل کاٹنے کی وجہ سے ہی تو بشیر مستانہ آج اس منصب پر سرفراز ہیں۔ ورنہ سائیکل تو سبھی

چلا لیتے ہیں۔

قصبے کی ساری سرگرمیاں اس نکتے پر مرکوز ہو گئیں کہ آخر بشیر مستانہ کب آئیں گے؟ کب سائیکل پر چڑھیں گے اور کب اتریں گے اور انہیں کیسے اتارا جائے گا؟ دیکھتے ہی دیکھتے تیاریاں ہونے لگیں اور انتظامی پارٹی کے مزید افراد بھی وارد ہو گئے۔ عوام کی اس پذیرائی اور والہانہ پن سے بشیر صاحب کی انتظامیہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ ڈھول پیٹنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور انہیں قرب وجوار کے دیہاتوں میں بھی بھیجا جانے لگا۔ جو دیواریں بی مارکہ خضاب' صوفی سوپ اور بچے کم خوشحال گھرانہ کے اشتہاروں' کی زد سے بچ گئی تھیں' انہیں بشیر مستانہ سائیکل چیمپئن کے مظاہرے کی وال مارکنگ سے سیاہ کر دیا گیا۔

بالآخر تیاریاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو گئیں اور عوام کا جوش وخروش اپنی انتہا تک آن پہنچا۔

سبزیوں کی نیلامی والے آڑھتیوں کے تھڑے کو صاف ستھرا کیا گیا۔ تھڑے کے بیچوں بیچ ایک شامیانہ لگایا گیا' بجلی' لاؤڈ سپیکر' ریکارڈنگ اور مائیکروفون کا انتظام کیا گیا۔ شامیانے کے چاروں طرف گول دائرے میں مٹی اور لال بجری کا ٹریک سا بنایا گیا کہ اسی ٹریک پر سائیکل نے چلنا ہے۔ ٹریک کے چاروں طرف رسی باندھ دی گئی کہ تماش بین اس رسی سے باہر باہر رہیں گے۔ اندر آنے والوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ صرف وہی اندر داخل ہو سکے گا۔ جو انتظامیہ کا فرد ہو' مدعو ہو یا کم ازکم سو روپیہ نقد انعام میں دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ایسے افراد کو شامیانے کے نیچے کرسیوں پر بٹھانے کا انتظام ہے تاکہ بشیر مستانہ کے ساتھ ساتھ عوام ان مخیر حضرات کو بھی دیکھ سکیں۔

تشہیر جس قدر زیادہ ہو گی اسی قدر مخیرین کا ہجوم ہو گا' لگتا ہے کہ مستانہ

صاحب کی انتظامی پارٹی مخیرین کی سائیکی کو خوب سمجھتی تھی۔ اسی لئے ایسا انتظام کر دیا گیا تھا کہ شامیانے تلے آجانے والا سب کو نظر آتا رہے۔ سب کی نظروں میں رہے اور ساتھ ہی ساتھ تشہیر پسند مخیرین کا چہرہ بھی ہوتا رہے۔ عوام اور خواص کو جدا کرنے والی رسی پر جھنڈیاں نصب کر دی گئیں اور شامیانے پر غبارے باندھ دیئے گئے جس سائیکل کو بشیر مستانہ صاحب نے چلانا تھا' اسے شامیانے کے بیچوں بیچ کھڑا کر دیا گیا اور اس سائیکل کے ہینڈل پر دو غبارے اور گیندے کے پھولوں والا ہار باندھ دیا گیا۔

جس شام مستانہ صاحب نے سائیکل پر سوار ہونا تھا' اس دن جوش وخروش کا عالم ہی سوا تھا' جوان' بچے' بوڑھے' بے فکرے اور فکرمند دوپہر سے ہی گول دائرے کی چاروں طرف براجمان ہو گئے۔ کچھ ہنرمندوں نے محض جگہ مل لی تھی۔ کہیں کہیں لوہے کی کرسیاں بھی رکھ دی گئی تھیں جن سے جگھوں کے ملے جانے کا پتہ چلتا تھا۔ ریکارڈنگ کو پوری آواز پر چھوڑا جا چکا تھا۔ ریکارڈنگ کے شروع ہوتے ہی تماشائیوں کی آپس میں گفت وشنید مفقود ہو گئی کہ آواز اس قدر تیز تھی کہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا اور آپس میں بات کرنے کے لئے وہ ایک مختصر سا لمحہ ہی میسر رہ گیا کہ جب ایک ریکارڈ کے بعد دوسرا لگایا جا رہا ہوتا۔

میری کشتی پار لگا دینا والے پہلے ریکارڈ سے ہی بشیر مستانہ کے لئے تماش بینوں کے دلوں میں نیک خواہشات' اسلامی اخوت اور ہمدردی کے ایسے جذبات پیدا ہو گئے کہ اکثر وبیشتر حاضرین مستانہ بھائی کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگے۔ گھروں میں مقید خواتین جو صرف ریکارڈنگ سے ہی محظوظ ہوتی تھیں' وہ بھی اس کار خیر میں شامل ہو گئیں۔ کسی نے نفل مان لئے' کسی نے کہانی بول دی' کسی نے بشیر مستانہ کی نذر اتارنے کے لئے کچھ ریزگاری مختص کر

دی۔ متموّل گھرانوں کی کچھ بیبیوں نے مستانہ صاحب کے لئے کھانا بھیجنے کی آفر بھی کر دی۔

ترحّم، ترس، تجسّس، اشتیاق اور انہونی کو ہوتے دیکھنے کا دباؤ جب اپنی حدود کو چھونے لگا اور پاؤں رکھنے کو بھی جگہ نہ رہی تو یکایک ریکارڈنگ روکی گئی، تالیاں بجائی گئیں اور بشیر مستانہ شامیانہ سے باہر تشریف لائے۔

جو بیٹھے تھے مستانہ صاحب کو دیکھ کر کھڑے ہو کر تالیاں مارنے، کپڑے جھاڑنے اور سیٹیاں بجانے لگے۔ تماشائیوں سے خاموش ہو جانے کی استدعا کی گئی، ریکارڈنگ کے رکنے سے جیسے زمین کی گردش میں ٹھہراؤ سا آگیا اور بشیر مستانہ کا تعارف کرایا گیا۔

بشیر مستانہ درمیانے قد کا صحت مند آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں ذرا اندر کو اور ان کی بناوٹ سے ناقابل یقین انکساری ٹپکتی تھی۔ اس کے قدرے دبلے اور لمبے منہ پر نسبتاً بھاری مونچھیں تھیں اور اس کے گہرے سیاہ بالوں میں تیل لگا تھا، جنہیں سیدھی مانگ کے رخ عین درمیان سے دونوں طرف بٹھایا گیا تھا۔ بشیر مستانہ صاحب نے تنگ موری کا پتلون کٹ کالا پاجامہ پہن رکھا تھا اور اوپر کالی ریشمی قمیض، گلے میں سنہری چین اور گردن میں سرخ رومال بندھا تھا۔ وہ قدرے سیاہی مائل رنگت والا اور بے فکرا سا لگتا تھا اور اس میں مستانوں والی کوئی بات نہیں لگتی تھی۔ وہ کم گو، سمجھدار اور چالاک نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرمے کی لکیر سے لگتا تھا کہ وہ اپنے بارے میں خاصا محتاط اور ہوش مند آدمی ہے۔ ایسا آدمی جو سوچ سبھاؤ، سودے اور اپنے فائدے میں پکا ہو اور خوب اچھی طرح جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا کرنے والا ہے؟

اعلان کیا گیا کہ انجمن تحفظ آڑھتیاں و سوداگراں کے صدر بشیر مستانہ کو

سائیکل پر سوار کرانے کے لئے تشریف لا چکے ہیں' عوام سے پھر درخواست کی گئی کہ وہ اپنی صفوں میں نظم وضبط قائم رکھیں اور بے قابو ہونے سے احتراز کریں۔ رسی کے اندر آجانے سے مستانہ صاحب کے مظاہرہ میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔ ان کا پاؤں زمین پر لگ سکتا ہے' جو کہ اس شرط اور چیلنج کی خلاف ورزی ہو گا کہ وہ بنا سائیکل سے اترے اور رکے مسلسل سو گھنٹے سائیکل چلائیں گے۔ آڑھتیوں اور سوداگروں کے صدر نے بشیر مستانہ کو گلے لگایا اور اس کے گلے میں روپے روپے کے نوٹوں والا ہار ڈال دیا۔ دو مزید ہار گیندے کے پھولوں والے بھی ڈالے گئے۔ تالیاں بجائی گئیں صدر صاحب نے ہینڈل تھاما اور بشیر مستانے کو سائیکل پر سوار کر دیا۔

وقت کا اعلان کیا گیا۔ ٹھیک چار بجے تھے۔ سیٹی بجی اور بشیر مستانہ گول دائرے میں ہوا ہو گیا۔ تین چار چکر تیز رفتاری سے طے کرنے کے بعد مستانے نے دو چکر آہستگی سے مکمل کئے۔ ادھر ریکارڈ بدلا گیا۔ جونہی وہ نظر سے پلائے تو میں کیا کروں والا ریکارڈ لگایا گیا تو مستانہ جیسے واقعی مستی میں آگیا ہو اس نے کرتب دکھانے شروع کر دیئے۔ وہ سائیکل کے فریم میں گردن پھنساتا اور بائیں طرف سے داخل ہو کر دائیں جانب نکل جاتا۔ کبھی ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر الٹا کھڑا ہو جاتا۔ کبھی منہ سیٹ کی مخالف سمت کر لیتا کبھی ہاتھوں سے پیڈل گھمانے لگتا اور ٹانگیں ہینڈل پر رکھ لیتا۔ اس کی ہر ہر ادا پر تماشائی واری صدقے ہو ہو جاتے کوئی روپے کا نوٹ دیتا۔ کوئی روپے کے دو دو نوٹ۔ ایک صاحب نے جب دس روپے کا نوٹ دوسری مرتبہ عنایت کیا تو انہیں عوام کی کچ کچ سے نکال کر شامیانے کی عزت افزائی میں بٹھا دیا گیا۔

بشیر مستانے کو اب اسی گول چکر میں مسلسل گھومنا ہے اور سائیکل چلانا ہے۔ فن کا یہ مظاہرہ ہی اس کی شناخت اور اس کا روزگار ہے گو کہ کام کٹھ

ہے مگر ناموری بہت ہے۔ ہزاروں کا مجمع اسے تکتا رہتا ہے۔ اسے چیمپئن مانا جاتا ہے اور ماسٹر مستانہ کہا جاتا ہے کوئی اسے شہسوار کہتا ہے اور کوئی اسے دھرتی کے شرف سے منسوب کرتا ہے' یہ فرزند پاکستان ہے' اس کی آمد کا اعلان ہوتا ہے اور نام کے اشتہار لگتے ہیں اس کی ہر ہر حرکت پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ناموری اور نظروں میں رہنے کی خاطر لوگ اپنے آپ کو کیسی کیسی مشکلوں میں ڈال لیتے ہیں ؟

21 نومبر 1979ء کو جنرل ضیاالحق نے بھی اپنے آپ کو ایسی ہی مشکل میں ڈال دیا۔ بلاوجہ اور بیٹھے بٹھائے وہ سائیکل سائیکل کھیلنے کے درپے ہو گئے۔

مال بٹورنے اور فائدے اٹھانے والا اسلامی گروہ اور مومنین کی جماعت جو جنرل صاحب کے دماغ میں ان کے امیرالمومنین ہونے کا بیج بوتی اور ان کے خیالات کو پراگندہ کرتی رہتی تھی۔ اس مال بٹورو گروہ نے مشورہ دیا کہ عوام الناس میں ہر دلعزیز بننے کے ہر ہر پہلو کو آزمایا جائے اور پہلی آزمائش کے طور پر سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ یوں بھی سینڈو نما صدر کو سائیکل چلانے سے ہو بھی کیا سکتا ہے۔

ابھی یہ سازش نما مشورہ پوری طرح پروان بھی نہیں چڑھا تھا کہ جنرل ضیاء الحق سادگی' کفایت شعاری اور بے خوفی کی سائیکل پر سوار ہو کر ہوا ہو گئے۔ انہوں نے بشیر مستانے کی یاد تازہ کر دی۔ تالیاں بجانے' ہلاشیری دینے اور پیچھے پیچھے بھاگنے والوں کا اتنا بڑا ہجوم بھائی جان بشیر مستانے کے پیچھے بھی نہیں تھا۔

21 نومبر 1979 کا دن جو دنیا بھر کے مسلمانوں پر بھاری تھا ضیاء الحق کے سائیکل مظاہرے نے اسے مزید بھاری کر دیا۔ انہوں نے سائیکل تو مستانے

سے کہیں کم چلائی لیکن اس کی قیمت بہت زیادہ دینی پڑی۔

اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ ملوکیت طرز حکومت کی حامل سعودی حکومت کے خلاف احتجاجاً" کچھ لوگوں نے خانہ کعبہ پر اسی روز قبضہ کر لیا تھا۔ اس انہونے واقعے سے سارے عالم اسلام میں تشویش کی لہر دوڑ گئی' ادھر سائیکل دوڑاتے ہوئے اس واقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ضیاالحق مرحوم نے اس واقعے میں امریکی ہاتھ کے ملوّث ہونے کا اشارہ دے دیا' جو ہجوم ان کی سائیکل کے پیچھے دوڑ رہا تھا' اس نے اپنا رخ بدل کر اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کی طرف کر دیا' اسلام آباد پہنچ کر اس ہجوم نے امریکی سفارتخانے کو آگ لگا دی' آگ بجھانے اور سفارتخانے کو واگزار کرانے کی کوشش میں پولیس فائرنگ سے چھ پاکستانی شہری جاں بحق ہو گئے۔ ادھر آگ لگے سفارتخانے میں پانچ امریکی اہلکار آتشزدگی سے مارے گئے۔

گھر کے بھیدی جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی کہتے ہیں کہ امریکن سفارتخانے کو آگ لگنے سے جو نقصان پہنچا اس کی مرمت کی ذمہ داری ہمارے قومی خزانے پر آن پڑی۔ پچیس کروڑ کا خطیر سرمایہ مرمت کی مد میں دے کر جنرل ضیاء الحق نے اپنی جان چھڑائی۔ سائیکل چلانے کا جو مظاہرہ کفایت شعاری اور سادگی کا سکہ جمانے کی خاطر کیا گیا تھا' پٹھا پڑ گیا۔ شام گئے تک مظاہرے کی نقد یافت گیارہ انسانی جانوں' پچیس کروڑ روپیہ نقد اور امریکی حکومت کی جھاڑوں تک جا پہنچی۔ امریکی صدر جمی کارٹر کی یہ لعن طعن جنرل ضیاء الحق کو ہمیشہ یاد رہی اور وہ گاہے بگاہے امریکی صدر پر طنز کرتے رہتے لیکن چھیڑ کا بدلہ چٹکی لے لینے سے کہاں اترتا ہے۔ سائیکل کے ساتھ ساتھ اکثر انہیں جمی کارٹر بھی یاد آجاتے۔

اس مظاہرے کے بعد جنرل ضیاء الحق جب تک حیات رہے وہ بھولے

سے بھی سائیکل کے نزدیک نہ پھٹکے بلکہ وہ سائیکل دیکھتے ہی اکھڑ اکھڑ جاتے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

جنرل ضیاء الحق کے اکثر شوق اور بیشتر اقدامات انسانی جانوں اور قومی خزانے کے زیاں سے ہی وابستہ رہے۔ چاہے وہ سائیکل چلانے کا سیدھا سادا مظاہرہ ہو' عمرے کی ادائیگی ہو یا سعودی حکمرانوں کو تحفے میں پیش کئے جانے والے جانور ہوں۔ ان کے عہد اقتدار میں بلا تفریق کسی کو بھی امان نہیں تھی جانور ہوں یا انسان' داخلی سالمیت ہو یا قومی منظر نامہ' ہر طرف لہو کے چھینٹوں سے گلنار دہکتا رہتا تھا۔

شب و روز مسلسل ایک ایسے شب خون کی زد میں تھے کہ جس کی شدت کم ہوتی تھی نہ دورانیہ' یہ ایک عشرہ گزارنا جیسے ایک صدی گزارنا ہو پاکستان پر یہ گیارہ سال صدی جتنے بھاری گزرے نہ ان کے جبر کا حصار ٹوٹتا تھا نہ نحوست کا نرغہ۔ ہر طرف اس موت رقصاں اور لہو ارزاں والی تذبذب' دبدبے اور بددلی کی کیفیت کو وہ اسلامی نظام کا نام دینے کی سعی رائیگاں کرتے رہے اور اسی میں ضائع ہو گئے۔

گو کہ جنرل ضیاء الحق کو کئی آیتیں' بہت سی احادیث' مسئلے مسائل اور استخارے ازبر تھے اور انہیں ایصال ثواب کے سارے گر آتے تھے لیکن اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے بہشتی زیور کی سطح سے اوپر والی جس سطح کی علمیت درکار ہوتی ہے وہ جنرل صاحب میں مفقود تھی اسلامی تاریخ سے لاعلمی کے سبب وہ کبھی اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ اسلامی ضابطوں' شعائر اور نظام کی قبولیت ہمیشہ اسی دور میں عام ہوئی کہ جب بھی انسانی و معاشرتی نفسیات کو مطمئن کر دینے والی چاروں بنیادی شرائط و صفات موجود تھیں۔

۱۔ فرد اور معاشرے کا احساس تحفظ

۲۔ معاشرتی وسماجی انصاف

۳۔ اقتصادی ومعاشی خوش حالی

۴۔ حکمرانوں کی سادگی' اخلاص اور دیانت

عہد فاروقی میں اسلام صرف پھیلا نہیں بلکہ ملٹی پلائی ہوا' مقبول عام ہوا اور محض اسلامی ضابطوں کا نفاذ ہی نہیں بلکہ عین اسلام کی روح متعارف ونافذ ہوئی۔ بعد کے کئی ادوار بھی اسی امر کی شہادت دیتے ہیں جیسے حضرت عمر بن العزیز اور حضرت ہشام بن عبدالرحمن کا عہد حکومت کہ جب بھی مذکورہ شرائط پوری کر دی گئیں گویا نفاذ اسلام کے بنیادی تقاضے پورے کر دیئے گئے۔ جس سے اسلامی نظام سہل' جامع' نافذ اور قبول عام ہوا۔ اس کے برعکس جنرل ضیاء الحق اپنے اسی فلسفے پر کاربند رہے کہ وہ قومی نفاق' شب وروز شب خون' آئی چلائی' چادر چڑھاوا' دستار بندی' عمرے کرو' استخارہ کھینچ اور عوام کو چھک کر رکھنے سے اسلامی نظام نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے

بار بار منہ کی کھانے کے باوجود بھی جنرل ضیاء الحق اپنے مزاج کی دو رخی پر قائم رہے جس صبح انہوں نے روزہ ماروں کی چمڑی اتارنے کے فرمان پر دستخط فرمائے اسی دوپہر وہ ذوالفقار علی بھٹو سے دوران ملاقات انہیں چائے پینے کی آفر کر رہے تھے لیکن بھٹو صاحب نے یہ کہہ کر کہ میں تو روزے سے ہوں' جنرل صاحب کو شرمسار کر دیا اور ان کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

خجالت کے کڑے سے کڑے لمحے میں بھی جنرل ضیاء الحق کی مسکراہٹ قائم رہی۔

عدالت عالیہ وعدالت عظمیٰ سے بھٹو صاحب کی پھانسی کی سزا پر جنرل

ضیاء الحق یہی کہتے رہے کہ ہر شہری کے لئے چونکہ قانون یکساں ہے' لہٰذا بھٹو صاحب سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گیا انہیں پورا پورا انصاف ملے گا چونکہ وہ بھی ریاست کے یکساں شہری ہیں لیکن جب کھوجے ماروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو شہریوں پر قانون کے یکساں نفاذ کے عہد کو جنرل ضیاء الحق نے سب سے پہلے خود ہی بد عہد کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے جرم پر تو مملکت کے دوسرے شہریوں کے برابر سزا دی گئی لیکن کھوجے ماری کے ضمن میں جنرل صاحب ذوالفقار علی بھٹو پر بہت مہربان رہے اور فیاضی سے پیش آئے یا بھٹو صاحب کی قسمت اچھی تھی کہ وہ روزے سے تھے' ورنہ عین ممکن ہے کہ کھوجے ماروں کے جس ہجوم کو آرمی کے صوبیدار صاحب نے راجہ بازار میں گھیر رکھا تھا' بھٹو صاحب بھی اسی ہجوم میں شامل ہوتے ۔ جنرل ضیاء الحق کے ظاہر اور باطن کے اس تضاد پر سب سے جامع تبصرہ جنرل فیض علی چشتی نے کیا۔ بلاشبہ جنرل چشتی ان کے بہت قریبی اور مزاج شناس رہ چکے ہیں جیسا کہ آثار و قرائن اشارہ کرتے ہیں کہ جنرل چشتی' جنرل ضیاء الحق کے حقیقی بہی خواہ ہونے کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ آرمی چیف کی کیپ' صدارتی ٹوپی اور امیرالمومنین کے عمامے کے بیک وقت وزن سے جنرل ضیاء الحق کا نسبتاً چھوٹا سر مزید چھوٹا نظر آنے لگے یا انہیں ٹوپیوں' شیروانیوں' یونیفارم' عماموں' تسبیوں' استخارے کے موم جاموں اور ہریری کاغذوں کے ڈھیر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالنا پڑے۔

لگتا ہے کہ جنرل چشتی نے جب مال غنیم میں اپنا حصہ لگایا اور جنرل ضیاء الحق کا بوجھ بانٹنے میں سرگرمی دکھائی تو بہی خواہی کو بد خواہی میں بدلتے دیر لگی' نہ جوتیوں میں دال بٹنے میں۔ وقوعہ جیسے بھی سرزد ہوا ہو مگر جنرل چشتی کے تبصرے کا وزن بہر حال اپنی جگہ وہ کہتے ہیں کہ :

"ضیاء صاحب کے دور میں رمضان المبارک میں بڑی سختی سے روزوں کی پابندی کرائی گئی۔ لیکن اس ضمن میں جو اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سے ریاکاری کا اظہار ہوتا تھا۔ گویا امراء کے لئے ایک قانون تھا اور غرباء کے لئے دوسرا۔ متمول افراد اور اعلیٰ افسروں کو رمضان کی بے حرمتی کے لئے کوئی سزا نہیں تھی لیکن غریب اور بے بس لوگوں پر روزہ کا احترام نہ کرنے کے جرم میں بھاری جرمانے کئے جاتے اور سزائیں دی جاتیں۔ سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ میں ضیاء صاحب کے علم میں تھا کہ رمضان میں دوپہر کا کھانا پکتا ہے' چائے بنتی ہے اور وزیر صاحبان اور چند ایک جرنیل صاحبان کو حاضر کی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تو کئی خان صاحب ان کے سامنے سگریٹ بھی پیتے تھے گویا کہ منافقت کی حد تھی۔"

"جہاں تک ضیاء صاحب کی ذاتی دیانت کا تعلق ہے۔ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ تاہم ان کی نجی زندگی کی تفصیلات میں چند باتیں ایسی ضرور تھیں' جن کو دیکھ بڑی حیرت ہوتی تھی اور بظاہر جن کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ ضیاء کے پاکستان کے بدنام ترین اسمگلروں سے گہرے دوستانہ روابط تھے۔ ایف ایس ایف کے بدنام زمانہ ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کے برادر نسبتی سیٹھ عابد اور اتنی ہی بدنام شخصیت ڈوہسل سے ان کی دوستی تھی۔ سیٹھ عابد کو جو متعدد مقدمات میں ملوث تھا' ضیاء صاحب نے مکمل طور پر کاروبار کی آزادی دے رکھی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اسے ایک بنک کھولنے کی بھی اجازت دیدی گئی تھی۔

ضیاء صاحب کے بیرون ملک دوروں سے واپسی پر یہ معمول تھا کہ ان کا سامان جہاز سے ٹرک میں لادا جاتا اور سیدھا ایم ایل اے ہاؤس پہنچا دیا جاتا۔ اس پر کسٹم والے رسمی طور پر بھی کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے"۔

(بھٹو' ضیاء اور میں: جنرل فیض علی چشتی)

پہنچی وہیں پہ خاک......

جس آصف علی زرداری کی لوٹ مار کو بنیاد بنا کر سابق صدر غلام اسحٰق خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کیا تھا کچھ عرصے بعد غلام اسحٰق خان اسی آصف علی زرداری سے ایوان صدر میں خوشامدانہ لہجے میں مذاکرات میں مصروف تھے کہ وہ انہیں یعنی آصف علی زرداری کو کونسی وزارت پیش کریں۔ گو کہ ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ اقتدار سے چمٹے رہنے کی خاطر ہمارے قائدین بے حمیت' و بے آبرو ہوئے اور اس راہ میں ہر وہ قیمت اور قربانی دی گئی کہ جب انہیں اقتدار سے رخصت کیا گیا تو ذلت' رسوائی اور پشیمانی کے سوا ان کے دامن میں کچھ بھی نہیں تھا۔

یوں تو حسب توفیق ہر کوئی مک مکا کے مرحلوں سے گزر کر ہی بے مراد ہوا مگر مک مکا کے اس اکھاڑے کے مردِ میدان غلام اسحاق خان ہی ہیں۔

باون سالہ سرکاری خدمات کے ریکارڈ کو بے داغ' بااصول اور بے لوث ہونے کے دعویٰ کرنے والے' آئین اور قانون کے علمبردار غلام اسحاق خان پر جب اپنے دعوی کی صداقت کو ثابت کرنے کی ساعت آئی تو ان کے پاؤں

لڑکھڑا گئے' ان کے اندر کا جاہ طلب' مطلب برار خوشامدی اور بے اصولا غلام اسحاق خان ان کے اور ان کے اصولوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ اپنی زندگی کے اس تاریخی اور فیصلہ کن لمحے میں وہ حق پسندانہ اور اصولوں کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور اسی ہجوم میں شامل ہو گئے کہ جہاں ان جیسے پہلے ہی موجود تھے۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت برطرف کرتے ہوئے غلام اسحاق خان نے بدعنوانی کے جو سنگین اور سنجیدہ الزامات ان کی حکومت پر عائد کئے تھے' ان الزامات کی حقیقت اور صداقت میں کم ازکم غلام اسحاق خان صاحب کو کوئی شبہ نہیں تھا اور اس بارے میں ان کی دو آرائیں نہیں تھیں' ورنہ وہ جس طرح کے محتاط اور غیر فیصلہ کن صلاحیتوں کے مالک تھے' ان کے پیش نظر وہ اتنا بڑا قدم ہرگز نہ اٹھا سکتے۔ ان کی شان میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہی غلام اسحاق خان کچھ عرصے بعد اسی برطرف بے نظیر بھٹو کو دوبارہ حکومت سازی کی ترغیب دے رہے تھے حالانکہ ان کے سامنے ایک بہت باعزت اور باوقار راستہ یہ بھی موجود تھا کہ وہ یہ کہتے ہوئے مستعفی ہو جاتے کہ چونکہ میں بے نظیر بھٹو کو بدعنوانی کے الزام میں برطرف کر چکا ہوں اور انہیں بدعنوان ہی سمجھتا ہوں لہٰذا میں ایک دوسرے بدعنوان اور نااہل کو برطرف کرنے کے لئے پہلے والے کو گلے نہیں لگاؤں گا۔ لیکن انہوں نے اقتدار میں رہنے کی خاطر حمیت' آبرو' عزت نفس اور اصولوں کو قربان کر دیا۔

غلام اسحاق خان نے اندرون خانہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے جو بھی سودا طے کیا' یہ اعلیٰ حکومتی حلقوں میں ہونے والے مک مکا کی ایسی ہی قسم تھی کہ جس سے معاشرے' ملک اور قوم کو نقد رقم کے لین دین والے مک مکا سے نسبتاً زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔

میاں نواز شریف کو نیچا دکھانے کے شوق میں وہ اس حد تک چلے گئے کہ جہاں وہ خود بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ میاں نواز شریف کے ساتھ مستعفی ہوجانے میں وہ اس قدر بے آبرو نہ ہوتے کہ جتنا میاں صاحب کے خلاف بے نظیر سے مک مکا کر کے ہوئے۔ ان کے اس طرز عمل نے ان کی شخصیت کا اصل روپ بے نقاب کر دیا کہ اصول' قانون' آئین اور ضابطوں کا پرچارک کس قدر مہارت اور دیدہ دلیری سے ضابطوں کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہے۔ توڑ سکتا اور کس حد تک گر سکتا ہے۔

اس بات کا جواب دیا جانا چاہئے کہ غلام اسحاق خان جیسا جہاندیدہ اور تجربہ کار شخص یہ کیسے نظرانداز کر سکتا تھا کہ یہ وہی بے نظیر بھٹو ہیں کہ جن کی حکومت کو وہ بدعنوان قرار دے کر برطرف کر چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس امید پر آصف علی زرداری اور بے نظیر بھٹو کی چاپلوسی شروع کر دی کہ وہ نہ صرف انہیں عہدۂ صدارت پر سرفراز رکھیں گی بلکہ نواز شریف کو نیچا دکھانے میں بھی ان کے کام آئیں گی۔

مک مکا کے اس انتہائی گھناؤنے اور عریاں طرز عمل کے واضح اظہار کے باوجود غلام اسحاق خان پر ندامت' خجالت اور تاسف کا کبھی ایک لمحہ بھی نہ گزرا۔ انہوں نے ہٹ دھرمی' بے اصولی اور بے شرمی کی انتہا کر دی۔ اس قدر شرمناک رویئے کے باوجود وہ اس بارے میں خاصے خوش فہم رہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو عہدۂ صدارت کے لئے بہرحال انہیں ہی نامزد کریں گی۔

دیکھا یہ جانا چاہئے کہ طویل مدت تک کلیدی عہدوں پر متمکن رہنے والے غلام اسحاق خان نے ملک اور قوم کو کیا دیا اور اس ملک نے انہیں کیا نہیں ' دیا۔ ایک اوسط درجے کی ذہانت' صلاحیت اور تعلیم کے حامل فرد کو ہر وہ عہدہ پیش کیا گیا کہ جن کی خواہش میں ان کے بیشتر ہمعصر اس جہان فانی

سے کوچ کر گئے۔ چیئرمین واپڈا' سیکرٹری خزانہ' وزیر خزانہ' سیکرٹری جنرل اسٹیبلشمنٹ' چیئرمین سینٹ اور صدر مملکت' اس قوم اور ملک سے اس سے زیادہ اور کیا حاصل کیا جا سکتا تھا اور ایک مفلوک الحال قوم سے وہ مزید کیا توقع رکھتے تھے کہ جو پوری نہ ہو سکی۔؟ تمام مناصب اور اعزاز جو ان کو حاصل رہے' اس کے بدلے میں انہوں نے قوم کو کیا دیا' چیئرمین واپڈا کی حیثیت سے انہوں نے واپڈا میں جس ناقص پالیسی سازی' اقربا نوازی اور انتہائی Centralized Decision Making کی جو بنیاد رکھی تھی' بالآخر ان کی اسی کارگزاری نے واپڈا کو مقروض' دیوالیہ اور قوم کا خون چوسنے والے ایسے سفید ہاتھی میں بدل دیا' جو ہمہ وقت پیرا سائٹ کی صورت عوام کا خون چوس رہا ہے۔

سیکرٹری خزانہ اور وزیر خزانہ کی حیثیت سے ان کی کارکردگی پر کوئی تبصرہ و تجزیہ ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ایسے الفاظ ہیں ہی نہیں کہ جو مالیات کے میدان میں غلام اسحاق خان کی ناکامیوں کا احاطہ کر سکیں۔ ہمارے آج کے معاشی و اقتصادی دیوالیہ پن اور زبوں حالی کی خشت اول سابق سیکرٹری خزانہ' وزیر خزانہ و ماہر مالیات جناب غلام اسحاق خان کے دست نحس سے ہی رکھی گئی تھی۔

غلام اسحاق خان کی سب سے بڑی کامیابی اور سب سے سنہرا اصول' جس پر وہ پوری نصف صدی کاربند رہے' وہ یہ ہے کہ مارشل لاء حکام کو بیورو کریسی کا تعاون اور وفاداری کی یقین دھانی اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز کے چرنوں میں بیورو کریسی کو سرنگوں کرنے کے عمل کے وہ سدا بہار محافظ رہے۔ بیورو کریسی کے خلیفہ کی حیثیت سے جنرل ضیاء الحق کی جناب میں اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے دست تعاون بڑھانے میں غلام اسحاق خان کی پھرتیاں اور خود

سپردگی قابل دید تھی۔ وہ جیسے اسی انتظار میں تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی بہرحال آئینی حکومت کو کب تاراج کیا جائے گا' ان کے بروقت اقدامات سے ایسا تاثر ملتا تھا کہ جیسے وہ باخبر تھے' مخبر تھے یا ضرورت سے زیادہ متوجہ تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔؟

سابق صدر نے اصول پسندانہ اور مومنانہ کردار کا جو نام نہاد حصار اپنے گرد باندھا ہوا تھا' اس کی ایک جھلک جنرل عبداللہ ملک کی اس گفتگو سے عیاں ہوتی ہے' جو انہوں نے سول اور فوجی سازشیں نامی کتاب کے مصنف رفیق ڈوگر سے انٹرویو کی صورت میں منکشف کی۔ جنرل عبداللہ ملک کہتے ہیں کہ چار جولائی کی رات مارشل لاء کے نفاذ کے وقت وہ جنرل ضیاء الحق کے دفتر میں موجود تھے اور جنرل ضیاء الحق نے ان کے مشورے پر ہی کہ بیورو کریسی سے کیسے کام لینا ہے اور اسے کون ہدایات دے گا' اس سلسلے میں جنرل ضیاء الحق نے اپنے سٹاف کو ہدایات دیں اور اس سلسلے میں جو پہلا شخص وہاں آیا وہ غلام اسحاق خان تھے۔

غلام اسحاق خان کو لے کر جنرل ضیاء الحق ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور کافی دیر تک ان کے ساتھ کانا پھوسی کرتے رہے۔ غلام اسحاق خان مسٹر بھٹو کی بدعنوانیوں کے بارے میں جنرل ضیاء الحق کو بتا رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ بیورو کریسی کا نظام غلام اسحاق خان کے ذریعے چلایا جائے گا اور انہیں سیکرٹری جنرل انچیف مقرر کر دیا (بحوالہ رفیق ڈوگر: سول اور فوجی سازشیں صفحہ 332)

ایک ایسا عہدیدار جو ہمیشہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہو اور نصف صدی تک رہا ہو' اسے ریاست کی طرف سے ہر سہولت اور مراعت میسر رہی ہو۔ کیا ایسے شخص پر کوئی ایسی اخلاقی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ آزمائش کی

گھڑی میں صدارت کے عہدے کے شایان شان اور اپنے مرتبے و منصب کے مطابق باوقار انداز میں اس آزمائش سے نبرد آزما ہو اور اس مرحلے سے سرخرو گزر کر قوم اور نوجوان نسل کے لئے خصوصاً رول ماڈل بن سکے' اخلاص اور بڑائی کی مثال بن سکے' اصول اور عزت نفس کا حوالہ بن سکے۔ قوم اور ملک سے مخلص ہونے کا شرف حاصل کر سکے۔

عمر بھر آئین' قانون' اصول اور انصاف کے پرچارک غلام اسحاق خان سے سردار فاروق لغاری بدر جہا بہتر ثابت ہوئے کہ آزمائش کی مماثل گھڑی میں انہوں نے زیادہ آبرو مندانہ فیصلہ کیا اور اصول کی بنیاد پر صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ حالانکہ حالات کو بگاڑنے' بے آبرو ہونے' مک مکا کرنے اور جوتیوں میں دال بانٹنے کے ابھی بہت سے سنہری مواقع ان کے پاس تھے۔ اپنے پیش رو کی طرح جوڑ توڑ اور سودے بازی میں ملوث ہونے کی بجائے انہوں نے نسبتاً ایسا راستہ اختیار کیا کہ ہماری تاریخ میں کم از کم وہ اس حوالے سے ضرور یاد رکھے جائیں گے کہ عہدۂ صدارت سے علیحدہ ہونے کے لئے مستعفی بھی ہوا جا سکتا ہے۔

قصر صدارت سے بے دخلی کے لئے قوم کو حالت نزاع میں مبتلا کرنا اور ملک بھر میں ہیجانی اور جنگ کی سی کیفیت طاری کر دینا ہی ضروری نہیں ہوتا۔ سازش' سودے بازی' مک مکا اور جوڑ توڑ کے بغیر بھی قصر صدارت سے روانگی ممکن ہے۔

ملک مالِ غنیم

مکان اور مکین، قوم اور ملک، دھرتی اور اس کے باسیوں کے درمیان اخلاص اور درد مندی کا جو فطری ناطہ موجود ہوتا ہے، وہ نہ صرف وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے بلکہ ہر سطح پر اور ہر جگہ موجزن ہوتا ہے، نظر آتا ہے، محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن ہماری زمین اپنے زمین زادوں کے اس شرف اخلاص سے محروم ہے یا محروم ہوتی جا رہی ہے۔

جو اس زمین کی مانگ سجا سکتے ہیں اور جو اس کے وارث ہیں، وہ فیصلے کے اختیار سے محروم ہیں اور جو فیصلے کرنے کے اختیار سے مسلّح ہیں وہ غیر نمائندہ، مصنوعی وارث، خائن اور بہروپیئے ہیں۔ ایسے ہی دو چہرہ فیصلہ سازوں اور غیر نمائندہ رہنماؤں نے ایک ایسے رجحان کو جنم دیا ہے کہ دھرتی اور اس کے مکینوں کے درمیان دردمندی کا ناطہ اور وراثت کا افتخار کمزور پڑتا جا رہا ہے۔

ہم میں کوئی عیسیٰ مسیحا نہیں ہے، جو اتفاقاً بھی کوڑھیوں کے احاطے میں آ نکلے، دُعا مانگے، گہرے بادل اُمڈ آئیں، تیز بارش ہو، کوڑھ دھل جانے کا معجزہ

رونما ہو اور شفا کی شفاف دھوپ چمکنے لگے۔ ہمارے حصے میں آنے والے مسیحا کوڑھ تریاق اور کوڑھ رکاوٹ نہیں ہیں بلکہ کوڑھ فروغ اور کوڑھ پھیلاؤ ہیں۔ یہ جہاں ہوں گے' کوڑھ پھیل جائے گا۔ جہاں جائیں گے' کوڑھ پھیلا دیں گے۔ ان کی نظر غیر کرشماتی' بصارت اپنے سائے اور علم گننے تک محدود' ہاتھ اور ہستی معجزوں سے مبّرا' زبانیں دراز' دعائیں شرف قبولیت سے محروم' نیت ناسور' رجحان بددیانت' فطرت خائن' پرواز زیر زمین اور شریانوں میں جیسے لہو کی بجائے طمع اور ہوس کا سیاہ سیال بہہ رہا ہو' بدرنگ' ناتحقیق' نامعتبر' متعفن' راہ گم کردہ اور نامراد نسلوں پر ایسے مسیحاؤں کا نزول عین متوقع' فطری' لاجیکل اور بار بار ہوتا ہے۔

بڑھتی ہوئی بے زاری، لاتعلقی اور فرسٹریشن کا یہ رجحان کسی بڑے خطرے کی علامت، بڑے طوفان کا پیش خیمہ، بڑی بے حسی کی بات اور بہت ناامیدی کی علامت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ نصف صدی کی اس تکرار کے باوجود کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں پاکستانی' کام نہیں چلا ہے' نظریاتی ترجیحات کے غیر فطری تعین کی وجہ سے ہمارے نظریاتی اثاثے اور موجودہ ٹھوس حقائق کے درمیان ایک بڑا شگاف حائل ہو گیا ہے۔ دن بدن یہ شگاف گہرا اور فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔

اس شگاف کو بھرنا بہت ضروری ہے

بحیثیت مجموعی مسلمان اس وقت معتوب' مفلس' نفاق زدہ اور درماندہ ہیں۔ مسلمان ہونا ذاتی اور مذہبی نقطۂ نظر سے تو قابل فخر ہو سکتا ہے مگر معاشروں کی تقابلی ہماہمی میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ سو ہمیں پہلے مسلمان ہونے کے جس نظریاتی کھونٹے سے باندھا گیا' ہم اس کی مذہبی افادیت کو معاشی اور معاشرتی پہلو سے پرکھتے ہیں تو شرمسار اور دکھ زدہ ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بعد میں پاکستانی ہونے سے ہم پسماندگی' ناخواندگی اور نفسانفسی کی جس بدرو میں غوطے لگا رہے ہیں' یہ بھی کوئی قابل فخر مقام نہیں ہے۔

پہلے پاکستانی ہونے سے بھی ہمارے مذہب پر کوئی زد نہ پڑتی اور نہ ہی اسلام کو اس سے کچھ بھی فرق پڑتا ہے کہ ہم پہلے کون ہیں اور بعد میں کیا ہیں؟ البتہ معاشرتی نفسیات اس سے ضرور متاثر ہوتی ہے کہ ہم جس ابتلاء میں گھرے ہوئے ہیں' اس کی وجوہات میں سرفہرست کیا کیا ہے؟ نصف صدی کی موجودہ منفی یافت کے پیش نظر ہر دونوں خوش فہمیوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا جانا چاہئے۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ ہم اس قدر مشکل' بے یقینے' بے مہار اور بے سمت کیوں ہیں کہ ہم پر کچھ بھی نافذ نہیں ہو سکا' کچھ بھی لاگو نہیں کیا جا سکا۔ نہ اسلام' نہ اسلامی سوشلزم۔ نہ جمہوریت' نہ بنیادی جمہوریت' نہ اسلام' نہ مسلمانیت' ہم ہر ضابطے کو بے ضابطگی میں' قانون کو لاقانونیت میں اور ہر آئین کو دھجیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ آخر ہم ایسے کون سے اسلام کے خواہاں ہیں کہ جو کسی بھی صورت نافذ ہی نہیں ہو کے دیتا' ایسا کون سا رخنہ اور کیسی پیچیدگی اسلام سے وابستہ ہو گئی ہے کہ پوری قوم نفاذ اسلام چاہتی ہے' نظام مصطفےٰ کے جلوسوں میں جان دیتی ہے' ہر آنے والا سربراہ شروع میں شدت سے اور جاتے ہوئے زیادہ شدت سے اسی خواہش میں مبتلا جاتا ہے کہ اسلام کا اطلاق بہر حال ہونا چاہئے مگر پھر بھی اسلام ہے کہ کسی صورت ہم پر نافذ نہیں ہو کے دیتا حالانکہ اسلام کے بارے میں سب سے حتمی بات ہی یہ ہے کہ یہ فطری' سادہ' نافذ العمل اور ہمیشہ کے لئے ہے۔

یوں تو ہم مسلمان ہیں مگر مسلمانوں پر مسلمانیت کے اطلاق سے محروم اور لرزاں ہیں اور بعد میں پاکستانی ہیں مگر پاکستانیت کے شرف سے بے بہرہ

اور دست بردار ہیں۔

صورت حال کی اصلاح کا تقاضا ہے کہ ایسے دو چہرہ رہنماؤں کو شرف رہنمائی سے محروم رکھا جائے جو رات دن اسلام نافذ کرنے کے غم میں غلطاں رہتے ہیں۔ وعدے کرتے ہیں' مراقبے مارتے ہیں' چلے کھینچتے ہیں' عمرے کرتے ہیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں مگر اسلام ہی نافذ نہیں کرتے بلکہ اسلام کی بجائے خود نافذ ہو جاتے ہیں۔

رہنمائی کے منصب پر کبھی کبھار ایسے افراد کو بھی گوارا کیا جانا چاہئے کہ جن کی مسلمانیت خواہ کسی بھی درجے میں ہو مگر وہ اس مٹی کی حرمت اور قوم کی حمیت کا دفاع کر سکتے ہوں۔ اس دھرتی کے حقیقی وارث ہوں اور اس وراثت پر شرمسار ہوں نہ سرنگوں بلکہ سربلند ہوں جو اس مٹی کی لاج پال سکیں' نبھا سکیں' اس کے شرف کو جتلا سکیں' اس کے امتیاز کو ابھار سکیں اور اس کے مان کو منوا سکیں۔

ہماری زمین پر فرض اور قوم پر واجب ہو گیا ہے کہ کم از کم ایک فرد ایسا ضرور پیدا ہو جو اس زمین کی وراثت کے افتخار کو نبھائے' ثابت کرے اور قائم رکھے۔

ناجائز وارثوں اور غیر نمائندوں نے ہماری زمین پر مختلف قسم کے جو کوڑھ پھیلائے ہیں' ان میں سب سے خطرناک' بڑا لاعلاج کوڑھ وہ نامیدی ہے کہ جس کا اظہار شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایک طرف خود سوزی' خود کشی اور خود اذیتی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں اور دوسری طرف وہ طبقے مضبوط ہوتے جا رہے ہیں' جو اپنے مفادات کو پاکستان کے مفادات' بقاء اور استحکام پر ترجیح دیتے ہیں۔ حکومتوں کا جھکاؤ' محب الوطن عناصر کی بجائے وطن دشمن گروہوں کی طرف ہے۔ ریاست اور معاشرے کے خلاف سرگرم عناصر

زیادہ محفوظ ہیں۔ وطن دشمنی کا تاثر دینا' توجہ دلاؤ نوٹس کی طرح اکسیر ثابت ہو رہا ہے۔ جو بھی اس ملک اور قوم کا جتنا بڑا بدخواہ ہے اور جس قدر بڑے چھید تھالی میں ڈال سکتا ہے' حکومتیں اس کی ناز برداریاں اسی قدر زیادہ کرتی ہیں۔

آپ اس ملک سے جس قدر بڑا ہاتھ کر لیں' اسی قدر وی آئی پی' نیارے اور راج دلارے بن جائیں گے۔ آپ کا شمار اشرافیہ میں اور یلغار حکومتی ایوانوں تک ہو جائے گی۔ وطن دشمن ہونا' بے زاری کا تاثر دینا اور غیروں کے لہجے میں گفتگو کرنا واحد شرط ہے آپ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے۔

موجودہ طبقاتی و معاشرتی انتشار کی تہہ میں حکومتوں کے اس رویے کا بڑا ہاتھ ہے کہ جس کے تحت وطن دشمن عناصر اور سماج دشمن خواص کو نوازا گیا۔ ہر حکومت نے خود کو قائم رکھنے' اقتدار کو طول دینے اور اپنے خائن رویے کی تسکین کے لئے خواص کے ایک ایسے طبقے کو فائدہ پہنچایا کہ جس کی اس مٹی سے وفاداری ہی سوالیہ اور مشکوک رہی ہے۔ ریاستی خزانوں اور قومی وسائل کو ان افراد پر اس بے دردی سے لٹایا گیا ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

خیانت کے اس کار بد میں سبھی حکمرانوں نے ہاتھ رنگے ہیں۔ کوئی ہاتھ ایسا نہیں ہے کہ جسے مملکت کے وسائل کے تحفظ کے حلف نامے پر رکھنے کے بعد خرد برد کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ وفاداریاں' حمایت اور ایمان خریدنے کا جو نظام انگریزوں نے یہاں قائم کیا تھا' وہ آج بھی جوں کا توں اندرون خانہ قائم ودائم ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج بھی جن خانوادون کو سرکاری زمینوں سے نوازا جاتا ہے' یہ انہی خاندانوں کے افراد اور اسی غدار سلسلے کی کڑی ہیں۔ یہ ایسا بکاؤ بیج ہے' جو

1857ء سے آج تک بک رہا ہے۔ نہ لینے والے طمع کاروں کی ضرورت اور ہوس ختم ہوتی ہے' نہ دینے والے حکمرانوں کی مجبوری اور بددیانتی۔

ضرورت' ہوس' مجبوری اور بددیانتی کے بیچ بیچ بد ترین معیار زندگی سے چمٹے ہوئے اسی زمین کے اصل وارث کھلی آنکھوں اور لب بستہ ہونٹوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں' دیکھتے رہتے ہیں مگر کب تک؟ یہ منظراب بدلنے کو ہے۔ موجودہ صورت حال زیادہ دیر چل ہی نہیں سکے گی۔ لادینیت اور کفر کے ادوار سماجی انصاف کے زور پر قائم رہ سکتے ہیں مگر سماجی انصاف سے عاری اسلامی معاشرے کبھی قائم نہیں رہے۔

ایک سرسری سی نظران افراد' خانوادوں اور سرکاری حکام پر ڈال لینی چاہئے کہ جنہوں نے ایمان' ضمیر اور عزت نفس کے بدلے مراعات اور زمینوں کے حصول کا' کاروبار کر رکھا ہے گو کہ یہ لوگ اس کام کو نسل در نسل کرتے رہے ہیں' تجربہ کار ہیں مگر پلک جھپکتے ہی ایک حکمران کی آغوش سے نکل کر دوسرے کے سامنے سجدہ ریز ہونے میں جو ایک لمحہ حائل ہے' انہیں شناخت کرنے کے لئے صرف یہی ایک لمحہ میسر ہے۔ وہ حکمران بھی نظر میں رہنے چاہئیں' جنہوں نے اسلامی مملکت کی سرکاری زمینوں کو اپنی بددیانت صوابدید کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ان دونوں متعلقین کے یاد رکھنے سے فائدہ ہو گا (انشاء اللہ)

جنرل ایوب خان کو مس فاطمہ جناح کے مقابلے میں کامیاب کروانے کے لئے جس ہراوّل دستے نے راستے ہموار کئے۔ اصلاً اور نسلاً یہی گروہ پاکستان میں انتخابی بد دیانتی' ہارس ٹریڈنگ اور لوٹا و لفافہ ازم کا معمار اول تھا' ایوب خان حکومت کے بد دیانت تیور بھانپتے ہی اس گروہ نے انسانی ضمیر' آبرو اور ایمان کی خرید و فروخت کے لئے اپنا تجربہ اور خدمات پیش کر دیں اور اپنی

خدمات کی پوری پوری قیمت وصول کی۔ جب ایوب خان کا جہاز ڈوبنے لگا تو یہی ہراول دستہ ذوالفقار علی بھٹو کے کام آیا' ابھی ان کی لوٹ مار کا کفارہ بھی ادا نہیں ہوا تھا' صرف مارشل لا لگا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو واپس اقتدار میں آسکتے تھے مگر یہ تجربہ کار ہراول دستہ جنرل ضیاء الحق سے ہم آغوش ہو چکا تھا۔

ابھی جنرل ضیاء الحق کے خالی تابوت کی تدفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہی سائی دستہ جنرل صاحب کے چہکنے' چمکتے' ناپختہ بالک کی بلائیں لے رہا تھا اس ہراول دستے کی نشان دہی اور شناخت سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ کوڑھ کی نوعیت اور اس کا توڑ کرنے میں مدد مل سکتی ہے' تدارک کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں انتخابی عمل کو ہمیشہ کے لئے غیر شفاف اور خرید و فروخت سے منسلک کر دینے والے ان اولین معماروں میں جنہوں نے ایوب خان کو منتخب کروانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اس کی پوری پوری قیمت وصول کی ان میں مخدوم حمیدالدین' محمد امین کانجو' میجر افضل ڈاہا' سجاد حسین قریشی' مخدوم سجاد، رضی شاہ گردیزی، میاں خان کلیار، میاں غلام محمد، فتح خان ٹوانہ، بلخ شیر مزاری، پیر دیول شریف، سردار زادہ ظفر عباس، مخدوم محمد غوث، مہر علی شاہ' سید احمد نواز گردیزی' رائے منصب علی' رانا پھول محمد' سردار خورشید احمد' انور بھنڈر' سیف اللہ تارڑ' گل حمید روکڑی' چودھری عید محمد' ذوالفقار قزلباش' احمد سعید کرمانی' ملک معراج خالد' میر غلام محمد' حاجی علی حسن ماڈی' مسماۃ بادشاہ زادی' حاجی قلندر بخش' حاجی عبدالطیف' خواجہ محمود خان اخوند' میجر شمس الدین' میر اللہ بخش بجائیو' ایم مشتاق محمد خان' ممتاز محمد خان دولتانہ' محمد نذر حسین' محمد نواز شاہ' صوفی عطاء محمد' سردار شیر جان خان' میاں خدا یار خان' ملک محمد نواز خان' سید مبارک علی شاہ' سید محمد وارث' سردار غلام' غلام

ئی الدین، نوازش علی، ملک فضل الٰہی ٹوانہ، میجر جنرل جمالدار، غلام دستگیر زیر آغا، چودھری اصغر علی خان، چودھری ظفر اللہ خان، کرنل عطاء اللہ سنبل، ملک حبیب اللہ خان، سردار احمد نواز خان، ملک فیروز خان نون، چودھری اصغر علی، سردار دوست محمد، غلام جیلانی خان، محمد امین خان، میاں محمد سعید قریشی، کرنل محمد علی نون، نواب محمد مہر خان، میاں غلام محمد لنگیانہ، سلطان محمد چانڈیو، خانوادہ امیر بہاولپور، خانوادہ نواب کالا باغ ملک امیر محمد خان، ملک خضر حیات ٹوانہ، میر صاحب خیرپور، حاجی غلام رسول جتوئی، ایس غلام محمد خان، نواب سر محمد فرید، ایس گل حسن شاہ، کرنل سید عابد حسین، پیر صاحب رائی شریف میاں جمال شاہ اور ذوالفقار علی بھٹو شامل تھے۔

سیاستدان، جاگیر دار اور اور سرکاری اہلکار جنہوں نے مختلف حکمرانوں سے فائدے حاصل کئے، زمینیں ہتھیائیں اور مال بنایا۔ فائدے، مراعات، مال و دولت اور خرد برد کی بے شمار اقسام (جن کو لینے اور دینے والے خائنین کے سوا اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں) کے علاوہ بھی اراضی مملکت پاکستان کو جس بے دردی سے لوٹا گیا اور لٹایا گیا، عبرت اور یاد دہانی کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

صدر ایوب خان کے دست فیض رساں سے مستفیض ہونے والے

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
جسٹس ایس اے رحمان	150 ایکڑ
اختر حسین (گورنر مغربی پاکستان)	ایضاً
میاں امین الدین گورنر مغربی پاکستان)	ایضاً
جسٹس محمد منیر	ایضاً
جسٹس عبدالعزیز	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
جسٹس زیڈ۔ بی۔ کیکاؤس	ایضاً
چوہدری اکبر علی (وزیر داخلہ)	ایضاً
خدا بخش بچہ (وزیر زراعت)	ایضاً
خان بہادر شیر زمان خان (کمشنر ڈیرہ اسمٰعیل خان)	ایضاً
عبدالرشید خان (ایڈیشنل کمشنر ریونیو)	ایضاً
کرنل اے ایس پی شاہ (چیئرمین پبلک سروس کمیشن)	ایضاً
میاں ناصر احمد (ممبر بورڈ آف ریونیو)	ایضاً
غلام صادق خان	ایضاً
ایس اے رحیم (چیئرمین امپروونٹ ٹرسٹ)	ایضاً
ایس اعجاز حسین شاہ (انٹی کرپشن)	ایضاً
ای کے ملک	ایضاً
اے ایچ قریشی (چیف سیکریٹری)	ایضاً
ایس غیاث الدین احمد (ایڈیشنل چیف سیکریٹری)	ایضاً
آغا محمد علی (آئی جی پولیس)	ایضاً
ملک عطا محمد نون (ڈی آئی جی پولیس)	ایضاً
جنرل کے ایم شیخ	ایضاً
ایس ایف حسن (چیف سیکریٹری)	ایضاً
ایم ایم احمد (سیکریٹری خزانہ)	ایضاً
این اے قریشی (چیئرمین ریلوے بورڈ)	ایضاً
آئی عبدالحمید (ڈائریکٹر پبلک سروس اکیڈمی)	ایضاً
ایم اے مجید (ممبر ریونیو بورڈ)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
این اے فاروقی (پرسنل سیکریٹری صدر پاکستان)	ایضاً
ڈاکٹر ایچ ایم طوسی	ایضاً
غلام فرید (ایس پی پولیس)	ایضاً
شیخ عبدالحمید (ایڈیشنل سیکریٹری خوراک)	ایضاً
میاں غلام صابری	ایضاً
خان بہادر رشید احمد	ایضاً
فرزند علی خان (کلیم کمشنر)	ایضاً
ظہور الحسن (ایڈیشنل سیکریٹری سیٹلمنٹ)	ایضاً
قاضی غضنفر حسین (سیشن جج)	ایضاً
شیخ عبدالکریم (ایگزیکٹو انجینئر اری گیشن)	ایضاً
اے وحید (ڈپٹی سیکریٹری صدر پاکستان)	ایضاً
خان عبداللہ خان (ایس پی پولیس)	ایضاً
ایس ایس کرمانی (چیف انجینئر واپڈا)	ایضاً
چوہدری محمد حسین (ڈائریکٹر انٹی کرپشن)	ایضاً
میاں محمد سعد اللہ (ڈپٹی سیکرٹری)	ایضاً
پیر محمد ابراہیم (چیف انجینئر سمال ڈیریز)	ایضاً
آغا ہلالی (سفیر پاکستان برائے برطانیہ)	ایضاً
آغا شاہی (سیکریٹری خارجہ)	ایضاً
جسٹس انعام اللہ خان	ایضاً
ایم ڈبلیو عباس (چیف سیکریٹری)	ایضاً
آئی چوہان (ممبر ریونیو بورڈ)	ایضاً
ایس آئی حق (چیف سیکریٹری)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
ایس ایم شریف (سیکریٹری تعلیم)	ایضاً
امیر محمد خان (سیکریٹری)	ایضاً
میر احسن الدین شاہ	ایضاً
ایس ایم سیال (ممبر واپڈا)	ایضاً
مشتاق احمد (جوائنٹ سیکریٹری خوراک)	ایضاً
چوہدری محمد افضل (سیکریٹری مواصلات)	ایضاً
میاں انور علی	ایضاً
ایم اے رشید (ڈپٹی سیکریٹری پلاننگ)	ایضاً
میاں عبدالعزیز (سیکریٹری مواصلات)	ایضاً
محمد اسلم خان (سفیر برائے افغانستان)	ایضاً
ایچ ولی خان	ایضاً
اے رحمان خان (سفیر برائے بیلجیئم)	ایضاً
میر بشیر خان (چیف انجینئر آبپاشی)	ایضاً
محمد یعقوب آغا (ممبر پبلک سروس کمیشن)	ایضاً
خان نجف خان (ڈائریکٹر انفورسمنٹ)	ایضاً
میاں ضیاء الدین (سفیر)	ایضاً
ایچ جے اصغر (چیف سیکریٹری ری ماڈلنگ)	ایضاً
محمد افضل (کمشنر ترقی زراعت)	ایضاً
جسٹس مسعود احمد	ایضاً
ایس عالم گیر (سیکریٹری)	ایضاً
سید نذیر عالم (آئی جی پولیس)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
شریف خان (چیئرمین روڈ ٹرانسپورٹ)	ایضاً
میاں مظفر احمد (چیف انجینئر آبپاشی)	ایضاً
میجر جنرل اکبر خان (ممبر روڈ ٹرانسپورٹ)	ایضاً
رانا میاں داد خان (جائنٹ سیکریٹری)	160 ایکڑ
ڈاکٹر عبدالستار (ڈائریکٹر زراعت)	ایضاً
سردار غلام فرید خان (کمشنر)	ایضاً
ایس ایم سعید (چیف انجینئر)	ایضاً
شیخ نور محمد (کمشنر)	ایضاً
الماس علی بیگ (ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر)	ایضاً
خان انور خان (ڈپٹی سیکریٹری ایڈمسٹریشن)	130 ایکڑ
شیخ عنایت اللہ (سیکشن آفیسر صحت)	ایضاً
عنایت اللہ خان (ڈپٹی کمشنر)	ایضاً
سید امیر علی شاہ (سیکریٹری صوبائی اسمبلی)	ایضاً
سید عباس علی شاہ (ایس پی پولیس)	ایضاً
فضل کریم (ایگزیکٹو انجینئر آبپاشی)	ایضاً
ایس ایم اقبال (اسسٹنٹ سیکریٹری قانون)	ایضاً
ممتاز احمد خان (اے آئی جی پولیس)	ایضاً
چوہدری نیاز علی (ریونیو بورڈ)	ایضاً
غلام محبوب سبحانی گورنرز انسپکشن ٹیم)	ایضاً
الطاف حسن ترمذی (ڈپٹی کمشنر)	ایضاً
چوہدری نصیر احمد ورک (ریونیو)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
رانا مقبول احمد (سیکریٹری ریونیو)	ایضاً
جی ایم شیخ (سیکریٹری پبلک ورکس)	ایضاً
بشیر احمد (اسسٹنٹ سیکریٹری ریونیو)	90 تا 100 ایکڑ
چوہدری محمد اقبال (سیکریٹری فنانس)	ایضاً
ایس اکبر احمد (کنٹرولر امتحانات لاہور بورڈ)	ایضاً
فتح علی خان	ایضاً
ایس ایم شریف (بجٹ آفیسر)	ایضاً
ملک حاکم خان (اے ڈی سی)	ایضاً
سید بشیر علی (سیکشن آفیسر)	ایضاً
چوہدری غلام رسول (ایس ایس پی پولیس)	ایضاً
مولا بخش (رجسٹرار پولیس آفس)	ایضاً
شیر علی (پی ڈی ایس پی)	ایضاً
بشارت حسین شاہ (ڈپٹی کلکٹر آبپاشی)	ایضاً
شفیق احمد خاں (ڈی ایس پی پولیس)	ایضاً
رحمت علی (ایڈمن آفیسر الیکٹریسٹی)	ایضاً
سلطان احمد (رجسٹرار کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ	ایضاً
ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ	240 ایکڑ
بریگیڈیئر ایف آر کلا	ایضاً
ڈاکٹر محمد سعید	ایضاً
ڈاکٹر ریاض قدیر (کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج)	ایضاً
احمد احسن (چیف انجینئر)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
شیخ مظہر الحق (ریجنل منیجر واپڈا)	ایضاً
میاں اصغر علی (ڈپٹی سیکریٹری تعلیم)	ایضاً
سعید حمید (چیف انجینئر)	ایضاً
یونس ای حسین (چیف انجینئر آبپاشی)	ایضاً
اے آر قریشی (چیف انجینئر)	ایضاً
احمد مسعود احمد (چیف انجینئر واٹر ونگ)	ایضاً

ذوالفقار علی بھٹو سے مال بٹورنے والے:

سردار شوکت حیات	3744 مربع گز
مولانا عبدالحق (ایم این اے) دو پلاٹ	1600
مولانا کوثر نیازی (ایم این اے)	3157
مولانا مفتی محمود (ایم این اے)	1066
ملک محمد صادق (ایم این اے)	800
ملک محمد اختر (ایم این اے)	800
فاروق لغاری (سینیٹر)	1133
محمد سردار خان (ایم این اے)	800
چوہدری غلام حیدر چیمہ (ایم این اے)	800
غلام نبی چوہدری (ایم این اے)	800
نیامت اللہ خان شنواری (ایم این اے)	800
چوہدری نثار احمد پنوں	800
چوہدری ممتاز احمد (ایم این اے)	800

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
مہر غلام حیدر بھروانہ (ایم این اے)	933
نذیر سلطان آف سلطان باہو (ایم این اے)	1066
خان کمال محمد گوریجہ (ایم این اے)	1066
مولوی نعمت اللہ (ایم این اے)	1066
مولوی صدر الشہید (ایم این اے)	1066
محمد خان چوہدری (ایم این اے)	978
چوہدری محمد اسلم (سینیٹر)	1066
محمد ہاشم غلزئی	1066
مس عذرا مسعود دختر میاں مسعود (ایم این اے)	1066
مولانا عبدالباقی (ایم این اے)	1066
میر مہران خان بجارانی (سینیٹر)	977
فضل الٰہی پراچہ (سینیٹر)	1066
عبدالنبی کانجو (ایم این اے)	933
اکبر خان (ایم این اے)	933
شہادت خان بھٹی (ایم این اے)	933
تاج محمد جمالی (سینیٹر)	1066
حاجی صالح خان (ایم این اے)	1011
شہادت علی خان (ایم این اے)	1011
حاجی سید حسین شاہ (سینیٹر)	933
غلام رسول تارڑ (ایم این اے)	800
اتالیق جعفر علی شاہ (ایم این اے)	800

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
خواجہ سلیمان (ایم این اے)	800
محمد حنیف خان (ایم این اے)	800
مس طلعت احسان دختر احسان الحق پراچہ (سینیٹر)	1244
سید قمر الزمان شاہ (سینیٹر)	1322
صاحبزادہ فاروق علی خان (سپیکر)	800
ملک محمد سلیمان (ایم این اے)	800
محمد زمان اچکزئی (سینیٹر)	933
منظور حسین سومرو (ایم این اے)	1066
شیر باز خان مزاری (ایم این اے)	ایضاً
شفقت خان (ایم این اے)	ایضاً
پیر عبدالقادر شاہ جیلانی (ایم این اے)	ایضاً
عبدالعزیز بھٹی (ایم این اے)	1000
مہر سمیع عثمان (سینیٹر)	1000
احمد وحید اختر (سینیٹر)	ایضاً
چوہدری جہانگیر علی (سینیٹر)	ایضاً
محمد داؤد خان (ایم این اے)	2000
مسز تونیہ خانم دختر زاہدہ سلطان (ایم این اے)	2500
نصر اللہ خان خٹک (ایم این اے)	2500
مولانا غلام غوث ہزاروی (ایم این اے)	555
قمر الزمان (سینیٹر)	500
ظہور الحق (سینیٹر)	1777

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
ڈاکٹر غلام حسین (ایم این اے)	1777
مخدوم محمد امین (ایم این اے)	800
احمد رضا قصوری (ایم این اے)	800
مولانا عبدالحکیم (ایم این اے)	800
سید خیال محمد شاہ (سینیٹر)	1244
چوہدری بشیر احمد (ایم این اے)	ایضاً
حفیظ اللہ چیمہ (ایم این اے)	ایضاً
منظور حسین ووہرہ (ایم این اے)	ایضاً
میاں حامد یاسین (ایم این اے)	ایضاً
میر دریا خان کھوسو (ایم این اے)	ایضاً
پاشا میر ولد خورشید حسن میر (ایم این اے)	933
ملک نصر اللہ خان آفریدی (سینیٹر)	800
ممتاز فاروق خٹک (ایم این اے)	1322
غلام مصطفیٰ جتوئی (ایم این اے)	1406
ملک جہانگیر خان (ایم این اے)	1244
راؤ عبدالستار (ایم این اے)	1244
نوابزادہ ذاکر قریشی (ایم این اے)	1175
کرم بخش اعوان (ایم این اے)	1311
خان حبیب اللہ خان (چیئرمین سینیٹ)	800
مخدوم محمد امین (ایم این اے)	800
سید ضرار گردیزی ولد عباس حسین گردیزی (ایم این اے)	800

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
عبدالحفیظ پیرزادہ (ایم این اے)	1444
راجہ تری دیورائے (ایم این اے)	1066
بیگم شیریں وہاب (ایم این اے)	1200
سکندر یوسف عبدالرحمان	1066
اسعد علی نون (ایم این اے)	1244
میاں احسان الحق (ایم این اے)	1066
میاں غلام عباس خان (ایم این اے)	1040
عبدالسبحان (ایم این اے)	ایضاً
سردار عبدالعلیم (ایم این اے)	1000

جنرل محمد ضیاء الحق کی کرم نوازیاں

محمد اسحاق بلوچ (سینیٹر)	1000 مربع گز
پورومل کوہلی (ایم این اے)	ایضاً
فضل دادا خان	ایضاً
محمد سالم خلیل	ایضاً
صاحبزادہ نورحسن	ایضاً
رائے صلاح الدین خان	ایضاً
ذوالفقار علی چشتی (سینیٹر)	ایضاً
مقبول احمد خان (ایم این اے)	ایضاً
ملک گلاب خان	ایضاً
ملک عبدل (سینیٹر)	ایضاً
ڈاکٹر محمد شفیق چودھری (ایم این اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
محمد ہاشم خان (سینیٹر)	ایضاً
غلام محمد احمد مانیکا (ایم این اے)	ایضاً
پیر محمد صابر شاہ (ایم این اے)	ایضاً
عبدالحمید قاضی (سینیٹر)	ایضاً
ملک سعد اللہ خان (سینیٹر)	ایضاً
رانا تنویر حسین (ایم این اے)	ایضاً
مولا داد خان (ایم این اے)	ایضاً
حسین بخش بنگزئی (سینیٹر)	ایضاً
سید منظور حسین شاہ (ایم این اے)	ایضاً
نواب امان اللہ خان سیال (ایم این اے)	ایضاً
حاجی خیر محمد پنواڑ (ایم این اے)	ایضاً
محمد علی ہوتی (سینیٹر)	ایضاً
علامہ مصطفیٰ الازہری (ایم این اے)	ایضاً
سیٹھ چمن داس (ایم این اے)	ایضاً
محمد قاسم خان (ایم این اے)	ایضاً
بریگیڈیئر افتخار اے بشیر	ایضاً
پیر محمد ثناء اللہ بودلہ (ایم این اے)	ایضاً
راجہ شاہد سعید (ایم این اے)	ایضاً
ملک عنایت خان (سینیٹر)	ایضاً
ملک عبدالواحد	ایضاً
سید خیال سعید میاں (سینیٹر)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
بریگیڈیئر عبدالقیوم (سینٹر)	ایضاً
اسلام الدین شیخ (ایم این اے)	ایضاً
جام کرم علی (سینٹر)	ایضاً
سردار غلام محمد خان مہر (ایم این اے)	ایضاً
حاجی خیال شاہ (ایم این اے)	ایضاً
ملک عمر دین بنگش	ایضاً
نواب محمد یامین خان (ایم این اے)	ایضاً
میر نواز خان مروت (ایم این اے)	ایضاً
عطاء محمد مری (ایم این اے)	ایضاً
راجہ محمد افضل خان (ایم این اے)	ایضاً
ایم پی بھنڈرہ (ایم این اے)	ایضاً
فتح محمد خان (ایم این اے)	ایضاً
حاجی جاوید اقبال عباسی (ایم این اے)	ایضاً
محمد اکرم خان (ایم این اے)	ایضاً
شاہ مردان پیر آف پگاڑا	ایضاً
پیر علی گوہر شاہ	ایضاً
محمد عبداللہ غازی (ایم این اے)	733 مربع گز
نور جہاں پانیزئی (ایم این اے)	ایضاً
آغا عطاء محمد خان (ایم این اے)	ایضاً
میاں ریاض احمد خان دولتانہ	ایضاً
چودھری محمد بشیر رندھاوا (ایم این اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
سید عبدالغفور شاہ (ایم این اے)	600 مربع گز
شہادت علی خان بلوچ (ایم این اے)	ایضاً
ڈاکٹر شیر افگن نیازی (ایم این اے)	ایضاً
محمد اسلم لون	ایضاً
بریگیڈیئر حامد نواز (ایم این اے)	ایضاً
فتح محمد خان (ایم این اے)	500 مربع گز
شہزادہ محمد گستاسب (ایم این اے)	ایضاً
ارباب محمد ایوب خان (ایم این اے)	ایضاً
بابر نسیم خان (ایم این اے)	ایضاً
غنی الرحمان (ایم پی اے)	ایضاً
امان اللہ خان کنڈی (ایم پی اے)	ایضاً
سردار حمید گل (ایم پی اے)	ایضاً
سردار عنایت اللہ خان گنڈا پور	ایضاً
ایم منیر آفریدی (سینیٹر)	ایضاً
حبیب اللہ مہمند (سینیٹر)	ایضاً
انجینئر محمد فضل آغا (سینیٹر)	ایضاً
ملک عبدالروف (ایم این اے)	672 مربع گز
غلام محی الدین خان مروت (ایم این اے)	ایضاً
میاں محمد آصف (ایم این اے)	ایضاً
صاحبزادہ محمد احمد (ایم این اے)	686 مربع گز
چوہدری ممتاز احمد ججی	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
چودھری محمد سرور (ایم این اے)	702 مربع گز
عبدالرحمان جمالی (سینیٹر)	800 مربع گز
رسول بخش (سینیٹر)	1000 مربع گز
بھگوا داس چاولہ (ایم این اے)	ایضاً
گل جی (ایم این اے)	ایضاً
ایمن روم (سینیٹر)	800 مربع گز
ملک محبوب حسین (ایم این اے)	ایضاً
احمد میاں سومرو (سینیٹر)	ایضاً
ممتاز احمد تارڑ (ایم این اے)	ایضاً
چودھری امیر حسین (ایم این اے)	ایضاً
پیر شجاعت حسین قریشی (سینیٹر)	ایضاً
ایمانیو ظفر (ایم این اے)	ایضاً
انور علی چیمہ (ایم این اے)	ایضاً
انور علی چیمہ (ایم این اے)	ایضاً
یوسف خان سوسولی (سینیٹر)	ایضاً
سید عباس شاہ (سینیٹر)	ایضاً
ملک نادر خان (ایم این اے)	ایضاً
حاجی فضل منان (ایم این اے)	ایضاً
شاد محمد خان (سینیٹر)	ایضاً
خیر محمد بھرگری	ایضاً
قمر الزمان شاہ کھگہ (ایم این اے)	ایضاً
خواجہ محمد صدر (ایم این اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
سید شاہ مہدی نسیم (ایم این اے)	ایضاً
بیگم سروری صادق (ایم این اے)	ایضاً
سردار مقصود احمد خان لغاری (ایم این اے)	ایضاً
ظفر اللہ جمالی (ایم این اے)	ایضاً
عارف حسین (ایم این اے)	ایضاً
ملک فرید اللہ خان (سینیٹر)	ایضاً
غلام محمد چشتی (ایم این اے)	ایضاً
ملک محمد علی (سینیٹر)	ایضاً
صاحبزادہ محمودہ بیگم (ایم این اے)	ایضاً
بیگم نسیم ماجد (ایم این اے)	ایضاً
رائے منصب علی خان (ایم این اے)	ایضاً
نواب مظہر علی (ایم این اے)	ایضاً
رائے احمد نواز (ایم این اے)	ایضاً
محمد اسلم کچھیلا (ایم این اے)	ایضاً
پرنس جام محمد یوسف (ایم این اے)	ایضاً
شہزاد محی الدین (ایم این اے)	ایضاً
محمد ایوب خان الائی (ایم این اے)	ایضاً
سید احمد عالم انور (ایم این اے)	ایضاً
حمید خان (ایم این اے)	666 مربع گز
یعقوب خان جدون (ایم این اے)	ایضاً
فیروز الدین انصاری (ایم این اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
شہاب الدین شاہ حسینی (ایم این اے)	ایضاً
بیگم ریحانہ علیم مشہدی (ایم این اے)	ایضاً
مولانا سمیع الحق (سینیٹر)	ایضاً
بریگیڈیئر محمد اصغر (ایم این اے)	ایضاً
بیگم سلمیٰ احمد (ایم این اے)	ایضاً
سردار محمد جہانگیر (ایم این اے)	ایضاً
بیگم بلقیس نصر من اللہ (ایم این اے)	ایضاً
گوہر ایوب (ایم این اے)	ایضاً
سید غلام مصطفیٰ شاہ (ایم این اے)	ایضاً
بیگم مہر النساء (ایم این اے)	ایضاً
چودھری نوریز شکور خان	ایضاً
ملک امیر محمد خان (ایم این اے)	ایضاً
سردار محمد ہاشم (سینیٹر)	600 مربع گز
سردار محمد سلیم (سینیٹر)	ایضاً
ملک نیاز احمد جھکڑ (ایم این اے)	500 مربع گز
بیگم شہناز وزیر علی (ایم این اے)	ایضاً
رانا شوکت حیات نون (ایم این اے)	ایضاً
نوابزادہ شیخ محمد عمر (سینیٹر)	ایضاً
امیر حیدر قریشی (سینیٹر)	ایضاً
حاجی نور شیر خان (ایم این اے)	ایضاً
حاجی گل شیر خان (ایم این اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
مولانا محمد رحمت اللہ (ایم این اے)	ایضاً
کنور قطب الدین (ایم این اے)	ایضاً
چودھری محمد اقبال (ایم این اے)	ایضاً
بیگم عشرت اشرف (ایم این اے)	ایضاً
سید اصغر علی شاہ (ایم این اے)	ایضاً
پیر محمد اشرف (ایم این اے)	ایضاً
چودھری امان اللہ رانا (ایم این اے)	ایضاً
میر محمد عارف (ایم این اے)	ایضاً
کیپٹن ثناء اللہ (ایم این اے)	ایضاً
چودھری محمد نواز بوسال (ایم این اے)	ایضاً
امان اللہ خان شاہانی (ایم این اے)	ایضاً
ملک غلام محمد مجتبیٰ غازی کھر (ایم این اے)	ایضاً
سردار وزیر محمد جوگیزئی (ایم این اے)	ایضاً
دل مراد جمالی (ایم این اے)	ایضاً
لیفٹیننٹ کرنل ڈبلیو ہر جٹ	ایضاً
صاحبزادہ الیاس (سینیٹر)	ایضاً
حاجی نادر شاہ (ایم این اے)	ایضاً
سردار محمد سرفراز (ایم این اے)	ایضاً
مہر خداداد خان ملک (ایم این اے)	ایضاً
ملک محمد رفیق کھر (ایم پی اے)	661
عبدالصمد (ایم پی اے)	500

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
بیگم شہزادہ محمد سلیمان (ایم پی اے)	ایضاً
محمد افسر خان (ایم پی اے)	ایضاً
سید مسعود کوثر (ایم پی اے)	ایضاً
محمد ایوب تنولی (ایم پی اے)	ایضاً
فقیر الدین (ایم پی اے)	ایضاً
سید حیدر زمان خان (ایم پی اے)	ایضاً
سید محمد منیر شاہ (ایم پی اے)	ایضاً
حبیب الرحمان (ایم پی اے)	ایضاً

مجلس شوریٰ و پارلیمنٹ کے ممبران کے علاوہ جنرل ضیاء الحق سے پلاٹ حاصل کرنے والے دوسرے افراد

اعجاز الحق	1066 مربع گز
اظہار الحق	1400
مسز ثریا فرمان علی	500
مسز شوکت آراء	223
مسز نسیم اختر کیانی	223
مسز مسرت حسین قاضی	ایضاً
مسز رفعت مسعود	ایضاً
مسز تسنیم کوثر	ایضاً
مسز نوشابہ خاتون	ایضاً
مسز سعدیہ انور	ایضاً
کیپٹن وحید ارشد	1378

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
ڈاکٹر محمد افضل (وزیر تعلیم)	855 مربع گز
مسز انجم نسرین	ایضاً
ڈاکٹر آفتاب احمد خان	800
مسز روبینہ سلیم	1066
ڈاکٹر بشارت جذبی	1666
مسز نسرین اختر	500
الٰہی بخش سومرو	1066
لیفٹیننٹ جنرل محمد اکرم	888
اے کے بروہی	933
مسز آر محمد علی خان	ایضاً
گل جی	938
مسز ثریا صفدر	1233
مسز سعید زمان نقوی	800
ریاض خان	ایضاً
انور حسین	933
ایئر مارشل وقار عظیم	1323
شوکت جاوید	555
صغیر اسد حسین	1200
محمد افضل کھوٹ	1122
لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان	1800
عبدالقیوم	556

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
راجہ محمد اکرم خان	558 مربع گز
سیٹھ اللہ دتہ	1066
سید حسن رضا	700
بریگیڈیئر محمد انور	700
ڈاکٹر ساجد شاہ	466
مسز سرور سلطانہ	ایضاً
مسز نیر محفوظ	ایضاً
مسز شاہد شمسی	ایضاً
لیفٹیننٹ کرنل محمد ظہیر ملک	800
لیفٹیننٹ عبدالجلیل	ایضاً
شفیع اے سہوانی	ایضاً
یڈمرل کے آر نیازی	1512
بریگیڈیئر ذوالفقار احمد خان	800
مسز سلیمہ آر خان	800
ایئر مارشل جمال اے خان	800
مسز عزت بانو بلگرامی	800
مسز زبیدہ فیاض	667
کرنل ایم اے حسن	ایضاً
محمد اسلم باجوہ	800
ایم زیڈ اے تیموری	700
وائس ایڈمرل احمد ضمیر	855

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
مسز بشریٰ ملک	600 مربع گز
یوڈی خان	500
میجر جنرل شاہ رفیع عالم	600
افتخار احمد خان	600
اے آر صدیقی	800
ایڈمرل طارق کمال خان	556
مسز شمیم اعجاز	666
پروفیسر شیخ امتیاز علی	600
سید احمد شہود الحق	600
چودھری فضل داد	1155
نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی	933
رفیق احمد	955
شیخ حفیظ الرحمان	861
الطاف یاور	738
طارق حمید	206
سردار خضر حیات	666

محترمہ بےنظیر بھٹو کے ہاتھوں الاٹ کردہ سرکاری اراضی

مسز ربیعہ طاہر	500 مربع گز
مسز غلام سرور چیمہ	1022
مسز فریدہ سعید	500

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
ملک رفیق کھر (ایم پی اے)	611
سردار حیدر زمان	500
فیض محمد خان	ایضاً
مسز سمیعہ پرویز	ایضاً
مسز نور جہاں (ایم پی اے)	ایضاً
عبدالعزیز	ایضاً
جاوید اکرم (ایم پی اے)	ایضاً
سید مسعود کوثر (ایم پی اے)	ایضاً
محمد ایوب تنولی	ایضاً
عباس قریشی	666
سردار عنایت اللہ خان	500
سردار حامد گل	ایضاً
شہناز وزیر علی	28 کنال
بیگم حسن نواب	1000 مربع گز
جسٹس چودھری محمد صدیق	500
مسز غلام محمد میمن	611
مسز شہناز وزیر علی	500
حبیب الرحمٰن	ایضاً
مسز ارباب محمد ایوب	ایضاً
فتح اللہ خان	ایضاً
فخر الدین	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
ولی محمد خان	ایضاً
مسز زرین	ایضاً
ناصر خان (ایم پی اے)	ایضاً
عصمت اللہ	ایضاً
رضی خان	ایضاً
بابر نسیم	ایضاً
امان اللہ خان کنڈی	ایضاً
امیر زیب خان	ایضاً
غنی الرحمان	ایضاً
شہزادہ گستاسپ	ایضاً
شیر محمد	ایضاً
شیر اکبر خان	ایضاً
سید رحیم	ایضاً
سید محمد امیر شاہ (ایم پی اے)	ایضاً
مسز فاطمہ	1022
مولوی محمد ولی خان	500
لیفٹیننٹ شوکت علی	ایضاً
چودھری نوریز شوکت خان	600
جاوید ملک	500
مسز حبیب اللہ سومرو	600
الطاف الرحمٰن (ایم پی اے)	ایضاً

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
مسز نگہت اسد	ایضاً
نصیر محمد شاہ	500
خواجہ محمد داؤد	ایضاً
محمد صدیق	700
مسز ناہید خان	1022
امیر خسرو خان (ایم پی اے)	500
خواجہ محمد خان ہوتی	ایضاً
سید سیف اللہ شاہ	ایضاً
لیاقت علی	ایضاً
محمد اعظم آفریدی	ایضاً
مسز ثریا بیگم	1022
کیپٹن عثمان زکریا اے ڈی سی	500
سکواڈرن لیڈر اقبال محمود	500
مسز شہناز بیگم	600
میجر سید فاوق حیدر پاشا	500
مسز شگفتہ	540
طاہر شاہ	500
عشرت جاوید	600
محمد سلمان فاروقی	600
مسز رانا ذکی	500
محمد الیاس	600

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
مسز زبیدہ نیازی	666
خالد احمد	527
ندیم احمد	702
انور کمال خان (ایم پی اے)	500
محمد مشاہد الدین	1003
احمد علی	500
عبدالغفور شاہ (ایم این اے)	600
شہادت علی خان (ایم این اے)	500
ظہیر احمد	600
بریگیڈیئر حامد نواز	ایضاً
عمر آفریدی (چیف سیکریٹری)	933
بیگم عبیدہ عالم	666
مس خالد آغا	600
ڈاکٹر ذوالفقار برق	600
چودھری نور احمد	ایضاً
مسز زینب خاتون	ایضاً
ملک فضل حسین	ایضاً
حاجی ملک محمد امین	ایضاً
مسٹر اسلم لون	ایضاً
مسٹر ولی محمد خان	500
مسٹر ارشاد سمیع خان	500

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/ کنال مربع گز
مسٹر عبدالصمد خان	ایضاً
سید غلام مصطفیٰ شاہ	600
رحیم داد خان	500
مسز بیگم شہزاد محمد سلمان (ایم پی اے)	ایضاً
خان محمد بروہی	600
ڈاکٹر عظمت راشد	500
مسز طیبہ افتخار	500
جاوید اختر خٹک	ایضاً
اعجاز اختر	ایضاً
نیاز احمد جھکڑ (ایم این اے)	ایضاً
شاہد خلیل	ایضاً
ڈاکٹر شیر افگن نیازی	600
مسز عطیہ جاوید	ایضاً
محمد یونس	500
ایئر چیف مارشل حکیم اللہ	1788
لیفٹیننٹ جنرل سید ذاکر علی زیدی	800
محمد صغیر	600
منور حسین سہروردی	500
چودھری آفتاب اسلم	600
سعید احمد خان	ایضاً
علی گوہر	500

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
قمر الدین منگی	600
مسز کشور قیوم	500
غلام علی	500
عبدالقادر	800
مسز شکیلہ راشد	500
بیگم نرگس پروین	600
سینیٹر سردار محمد سلیم	ایضاً
مسز ثمرین وقار	ایضاً
منگا خان	ایضاً
فہمیدہ جمال	ایضاً
رضوان الحق	800
محمد جاوید اقبال	600
ممتاز علی	600
کرنل (ر) حبیب خان	ایضاً
مسز جبین صفر شاہ	800
محمد نواز	600
بیگم مہر النساء (ایم این اے)	ایضاً
مسز شہناز اختر	ایضاً
ارجن داس	ایضاً
ظفر آرمز اینڈ ایمونیشن	57715
مسز سعیدہ بیگم	600

افراد جنہیں نوازا گیا	قطعہ اراضی ایکڑ/کنال مربع گز
طارق برادرز	3250
مسٹر محمد اصغر شیخ	2778
مارٹائن فنسٹان	11333

اللہ کے سپاہی اور شیر دل غازی جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے دور میں قیمتی ڈیوٹی فری کاریں درآمد کیں۔ ان میں نواب عباسی گورنر پنجاب، ایئر مارشل ریٹائرڈ رحیم خان، چیف آف نیول جائنٹ سٹاف مسٹر کرامت رحمٰن نیازی، چیئرمین جائنٹ سٹاف جنرل محمد شریف، لیفٹیننٹ جنرل سوار خان، وائس ایڈمرل ریٹائرڈ اے آر خان، لیفٹیننٹ جنرل رحیم خان، جنرل محمد اقبال خان، جنرل محمد موسیٰ خان لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی، لیفٹیننٹ جنرل فض الحق (چار مرتبہ) لیفٹیننٹ جنرل گل حسن، سابق ایئر مارشل نور خان، لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عبدالحمید خان، وائس ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایچ ایم ایس چودھری، وائس ایڈمرل مظفر حسن، ایئر چیف مارشل محمد انور شمیم ، سابق لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین (دو مرتبہ)، سابق میجر جنرل (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن خان (صدر آزاد کشمیر) لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان (دو مرتبہ) شامل تھے۔

کون بڑا بدعنوان: مجاہد حسین 101 تا 112)

حاجت مند مریض جن کا سرکاری خرچ پر بیرون ملک علاج کروایا گیا۔

میاں عبدالخالق	53700 روپے	امریکہ
میر نبی بخش کھوسہ	505000 روپے	انگلینڈ

دختر مولانا محمد خان شیرانی	216000	ایضاً
مسز شیلا ناصر اقبال چودھری	462230روپے	ایضاً
یحییٰ بختیار (سینیٹر)	212000روپے	ایضاً
غلام دستگیر خان (وفاقی وزیر)	28000روپے	امریکہ
مسز غلام دستگیر خان	115000 روپے	ایضاً
عبدالماجد ملک	297000روپے	ایضاً
ماسٹر جمال آصف	669000روپے	انگلینڈ
نقیب الرحمٰن خٹک	437000روپے	انگلینڈ
محمد خاور جمیل	395000روپے	امریکہ
مس فرح جمال	687000روپے	ایضاً
اے ایچ سجاد	436000 روپے	انگلینڈ
محمد خان اچکزئی	441000روپے	انگلینڈ
محمد پرویز	193000روپے	امریکہ
چودھری طالب حسین	396000روپے	انگلینڈ
والدہ حنا عمر	418000روپے	انگلینڈ
ظہیر الدین بابر	150000 روپے	انگلینڈ
محمد حبیب اللہ	334000روپے	انگلینڈ
والد امتیاز علی	1224000 روپے	امریکہ
غلام حیدر	926000روپے	امریکہ
مسز جسٹس محمد افضل لون	426000روپے	انگلینڈ
سید مدد علی شاہ	1325992 روپے	انگلینڈ
فرزند محمد شہر یار عمر	25930روپے	ایضاً
مسز اقبال راشد ملک	354000روپے	ایضاً

قاضی محمد علیم	615000روپے	ایضاً
عامر علی چانڈیو	150000روپے	ایضاً
ماسٹر محمد احمد	669000روپے	ایضاً
حسن رضا پاشا	437000 روپے	ایضاً
مسز اکرم ذکی	236000 روپے	ایضاً
مظفر محمد قریشی	356270روپے	ایضاً
شریف الدین پیرزادہ	300000 روپے	امریکہ
ڈاکٹر شمع لون	374000روپے	ایضاً
محمد احمد	205000روپے	انگلینڈ
راجہ اورنگ زیب	478000روپے	ایضاً
صاحبزادہ رؤف علی خان (آئی جی پولیس)	437000روپے	ایضاً
مسز جام یوسف	43500000 روپے	ایضاً
سید طارق محمود	42300000 روپے	ایضاً
غلام دستگیر خان	3400000روپے	ایضاً
مسز غلام دستگیر خان	23000000روپے	ایضاً
ظفر علی شاہ	33500000 روپے	ایضاً
آغا عطا محمد خان	29700000 روپے	ایضاً
سید منظور حسین شاہ (دو مرتبہ)	75100000روپے	ایضاً
مسز آفتاب شعبان میرانی	38300000 روپے	ایضاً
آمنہ چیمہ دختر اقبال چیمہ	41400000روپے	ایضاً
مسز ناصر اقبال	43700000 روپے	ایضاً
ثانیہ دختر میر نبی بخش کھوسو	67500000 روپے	ایضاً
ڈاکٹر منیر الدین (سینیٹر)	136600000روپے	ایضاً

اخوند زادہ بہرور سعید	53400000روپے	ایضاً
یحییٰ بختیار	19800000 روپے	ایضاً

(منو بھائی: روزنامہ جنگ، 13-8-1996)

غلام فرید چشتی (ایم پی اے)	8500 پاؤنڈ	ایضاً
سید حسنات احمد (ایم پی اے)	8300 پاؤنڈ	ایضاً
خالد جاوید ورک (ایم پی اے)	3000 پاؤنڈ	ایضاً
ارشاد حسین (ایم پی اے)	5000 پاؤنڈ	ایضاً
ڈاکٹر شیلابی چارلس (ایم پی اے)	3000 پاؤنڈ	ایضاً
مقصود احمد خان لغاری (ایم پی اے)	12000 پاؤنڈ	ایضاً
غلام فرید چشتی (دوسری مرتبہ)	24000 ڈالر	ایضاً
حاجی سردار خان (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
رخسانہ دختر عبدالخالق (ایم این اے)	5000 ڈالر	ایضاً
راؤ خضر حیات خان (ایم این اے)	8500 ڈالر	ایضاً
مسز ملک سلیم اقبال	5000 ڈالر	ایضاً
طارق اقبال فرزند ملک سلیم اقبال (دو مرتبہ)	8000 ڈالر	ایضاً
شمعون قیصر (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
مسز چودھری عبدالغفور (ایم این اے)	10000 ڈالر	ایضاً
مسز ذوالفقار علی کھوسہ	8500 ڈالر	ایضاً
والد شاہد فاروق (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
سردار محمد عارف نکئی	8500 ڈالر	ایضاً
حسن اختر موکل (ڈپٹی سپیکر) (دو مرتبہ)	17000 ڈالر	ایضاً
مخدوم علی رضا (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
سردار محمد صادق (ایم پی اے)	30000 ڈالر	ایضاً

والدہ چودھری محمد فاروق	8500 ڈالر	ایضاً
رانا پھول خان (صوبائی وزیر)	7500 ڈالر	ایضاً
سید طاہر احمد شاہ (ایم پی اے)	7500 ڈالر	ایضاً
حسن قریشی فرزند مظہر قریشی (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
رانا شمیم احمد خان (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
رشیدہ بیگم والدہ میاں محمود (ایم پی اے)	8500 ڈالر	ایضاً
مسز منظور احمد وٹو	8500 ڈالر	ایضاً

مہران بینک اور یونس حبیب سے براہ راست مستفید ہونے والے حضرات

جاوید ہاشمی	20 ملین روپے	ایضاً
جنرل مرزا اسلم بیگ	60 ملین روپے	ایضاً
غلام مصطفیٰ جتوئی	5 ملین روپے	ایضاً
آفاق احمد (ایم کیو ایم)	5 ملین روپے	ایضاً
ڈاکٹر فاروق ستار	2 ملین روپے	ایضاً
مظفر حسین شاہ	12.5 ملین روپے	ایضاً
آصف شاہ بذریعہ میاں نواز شریف	3.5 ملین روپے	ایضاً
دوست محمد فیاض	1 ملین روپے	ایضاً
جام حیدر علی	2.4 ملین روپے	ایضاً
جام معشوق علی	8 لاکھ روپے	ایضاً
غلام مصطفیٰ کھر	4 لاکھ روپے	ایضاً
لیاقت جتوئی	1.5 ملین روپے	ایضاً
اجمل خان (سابق وزیر)	1.4 ملین روپے	ایضاً
جام صادق علی (برائے افتتاح مہران بینک)	150 ملین روپے	ایضاً

پاکستان کے متنازعہ سیاستدان: مجاہد حسین صحہ 431)

ایک کروڑ روزگار

یہ شکاگو یونیورسٹی ہے اس یونیورسٹی کو دنیا بھر کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں امتیازی مقام حاصل ہے، ریسرچ، ایجوکیشنل لیڈر شپ، ریاضی، فزکس، میڈیسن، علم معاشیات اور نیوکلیئر سائنس سے متعلقہ مسائل کے حل اور حرف آخر کے لیے اسی یونیورسٹی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہاں کی فیکلٹی ہمیشہ سے ممتاز رہی ہے آج بھی مختلف شعبوں میں چار پانچ نوبل انعام یافتہ پروفیسرز یہاں کی فیکلٹی میں شامل ہیں اسی یونیورسٹی میں ایٹم کو پھاڑنے کے پہلے پہل تجربے سے لے کر جدید معاشی رجحانات کی تحقیق تک کے بے شمار ایسے علمی کارنامے سرانجام دیئے گئے کہ جن سے آج کے امریکہ کہ اس روئے زمین پر طاقتور ترین ملک اور امریکی قوم کو اعلیٰ ترین معیار زندگی حاصل ہونے والی قوم کا اعزاز حاصل ہوا۔ امریکہ کی معاشی، سائنسی اور تعلیمی ترقی میں اس درسگاہ نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔

اسی یونیورسٹی میں لکڑی کے فرش والے ایک لیکچر روم میں آئن سٹائن نے اپنی مشہور زمانہ RELATIVITY THEORY پر لیکچرز دیئے اور ملٹن

فریڈمین نے اپنے معاشی نظریے کی وضاحت کی، بڑے بڑے ممتاز سائنسدان نامور معاشی ماہرین، کیمسٹ، ڈاکٹرز اور ایجوکیٹرز اس یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور آج بھی ہیں۔

یہ یونیورسٹی کا سٹاف روم ہے اور یہاں پانچ چھ ماہرین اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یو این ڈی پی کی طرف سے ایک تجزیاتی رپورٹ پر اپنا تجزیہ اور تحقیق کرنے کے لیے بحث مباحثہ اور تبادلہ خیال کے لیے جمع ہوئے ہیں ان لوگوں میں یو این ڈی پی کے پاکستانی پراجیکٹس کے انچارج برٹ اولسن جو ابھی حال ہی میں پاکستان سے یہاں واپس آئے ہیں، یہاں موجود ہیں، انہی میں پروفیسر گیری سٹینلے بیکر ہیں جنہوں نے 1992 میں معاشیات کا نوبل پرائز حاصل کیا ہے، مشہور عالم اکانومسٹ ڈاکٹر امارتیاسن ہیں۔ ڈاکٹر امارتیاسن بھی معاشیات کی نوبل پرائز ہولڈر ہیں۔ مسٹر وول لارک ہیں جو آبی وسائل اور آب پاشی کے کئی منصوبوں میں اقوام متحدہ کے مشیر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں انہی میں صوابی (صوبہ سرحد) کی رہنے والی ریسرچ اکنامکس کی پروفیسر ڈاکٹر محبوبہ زمان ہیں جو آج بھی لوگوں کو مخاطب کرنے اور مخاطبین سے بات بڑھانے کے لیے پٹھانی لہجے والا ''مڑا'' کا بے تکلفانہ استعمال کرتی رہتی ہیں خواہ ان کا مخاطب ڈاکٹر امارتیاسن جیسا سنجیدہ اور کم گو ماہر معاشیات ہی کیوں نہ ہو۔

گوکہ ان صاحب علم اور ماہرین کے درمیان میری حیثیت محض ایک ترجمان اور منشی کی سی ہے۔ میرا کام اور تعلق اس سے زیادہ نہیں ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق پاکستانی اخباروں کی سرخیوں، ایڈیٹوریل، لیڈروں کے بیانات، ماہرین کے تجزیے اور تبصروں کو بزبان انگریزی ان لوگوں کو سناؤں اور ان کے سوالوں کے جواب اور متعلقہ اعداد شمار اخباروں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیش کر دوں۔

اپنی لاکھ لاعلمی کے باوصف بھی اس لمحے مجھے ان سب حضرات پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ زیر بحث موضوع پر میری معلومات اور میرا علم ان سب سے زیادہ ہے اور کم از کم میں اس موضوع کے حوالے سے جاننے والوں میں شامل ہوں۔

اس وقت میری حیثیت گھر کے اس بھیدی کی سی ہے جو چوروں کو جاننے کے باوجود بھی پولیس کی تفتیش کو غلط رستے پر ڈالے رکھتا ہے اصل بات کی کھل کر نشان دہی کرتا ہے نہ پولیس کے مفروضوں، قیاسوں اور اندیشوں کے آڑے آتا ہے جس طرح بھید بھاؤ جاننے والے قدرے بے فکرے، لاپرواہ اور لاتعلق نظر آتے ہیں سو میرا طرزِ عمل بھی ان ماہرین کے سامنے ایسا ہے کہ تم جس گتھی کو سلجھانے میں دل اور دماغ ہلکان کررہے ہو، ہمارے نزدیک تو یہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اس کا وجود ہی نہیں ہے یہ بات سرے سے ہے ہی نہیں۔

جو بات سرے سے موجود ہی نہ ہو، جس مسئلے کا وجود ہی نہ ہو اسے سلجھانا ہی کیا اور سلجھاؤ گے بھی کیسے؟

آج اس یخ بستہ سٹاف روم میں زیر بحث موضوع کا تعلق پاکستان میں صوبوں کے درمیان نہری پانی کی تقسیم کے فارمولے اور اس کے مضمرات سے ہے جسے وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے خاصی تگ و دو کے بعد بالآخر حل کرلیا ہے اور ایک ایسا معاہدہ طے پا گیا ہے کہ جس سے ہمیشہ کے اس اختلافی مسئلے کے ختم ہوجانے کا قوی امکان پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بات یہاں تک تو درست اور قابل ستائش ہے مگر اصل گھپلا اس کے بعد کا ہے۔

سر جوڑے بیٹھے ہوئے ان ماہرین کا مسئلہ اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ کیا واقعی وزیراعظم پاکستان کے اس دعویٰ کے مطابق کہ اس معاہدے کے طے ہو

جانے سے اب چند ہی برسوں میں پاکستانی معیشت کی کایا پلٹ جائے گی۔ نہری پانی کی تقسیم کے اس معاہدے پر وزیراعظم پاکستان نے جو خوش رنگ معاشی منظرکشی کی ہے اور آنے والے دنوں کا جو اقتصادی زائچہ کھینچا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1- اگلے دس برسوں میں اس معاہدے کی بدولت ایک کروڑ لوگوں کو روز مہیا ہوگا

2- لاکھوں مربع میل اضافی زمین سیراب ہوگی۔

3- زرعی معیشت میں ایک ایسی انقلابی تبدیلی رونما ہوگی کہ جس سے عوامی خوشحالی کے دروازے کھل جائیں گے۔

4- پاکستان زرعی اجناس میں نہ صرف خودکفیل ہوجائے گا بلکہ ان اجناس کی برآمدات کرنے والے ملکوں میں شامل ہوجائے گا۔

5- اربوں روپے کا زرمبادلہ نہ صرف درآمدات کے ضمن میں بچے گا بلکہ مزید اربوں برآمدات سے حاصل ہوں گے۔

6- جب مزید ایک کروڑ لوگ برسرروزگار ہوجائیں گے تو قوت خرید بڑھے گی، معیشت پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے، مصنوعات کی مانگ میں اضافہ ہوگا، کارخانے دن رات مال تیار کریں گے، پیداوار بڑھے گی، لوگ پلک جھپکتے چیزیں خرید لیا کریں گے، نقد و نقد اور ہاتھوں ہاتھ سودے بکیں گے، خوش حالی آجائے گی۔

نہری پانی کی تقسیم کے اس صوبائی معاہدے پر حکومت وقت نے ایک ایسا ہیجانی تاثر پیدا کر دیا کہ جیسے کسی غریب گھرانے

میں راتوں رات کروڑوں کی لاٹری نکل آئے اس معاہدے پر
دستخط کیا ہوئے کہ ہر طرف جشن کا ساماں باندھ دیا گیا۔ خیر
سگالیوں کا تانتا اور مبارک بادیوں کے ڈھیر لگ گئے خوش
فہمیوں کی لوٹ مچ گئی اور خوش قیافیوں کا زور بڑھ گیا۔
حکومتی پارٹی کے ارکان اسمبلی وزیر اعظم سے بھی دو ہاتھ
آگے نکل گئے' اعداد وشمار' شماریات اور لفظی بلکہ حرفی گورکھ
دھندے کی دھند میں سچ' حقائق اور اصلیت کو یوں مصلوب
کر دیا گیا کہ حزب اختلاف کے جن ارکان اسمبلی نے اس
کذب وریا' ہیجان اور غلغلے کی فضا میں حواس ٹھکانے رکھنے کی
کوشش کی تو اس کی مت مار دی گئی۔ ٹی اے' ڈی اے
روک لیا گیا اور اس بے چارے کے خلاف ایم این اے
ہوسٹلز کے تولئے' پنکھے اور چادریں چوری کرنے کے مقدمے
درج ہو گئے اور کچھ کے خلاف پہلے سے درج مقدموں کی
تفتیش شروع ہو گئی۔ بھلا کونسا ایم این اے یا ایم پی اے ہو گا
جو عدم ادائیگی واجبات سابقہ کی زد سے محفوظ ہو گا؟

جس نے بھی معاہدے پر تنقیدی نظر ڈالی وہ پولیس کی نظر میں آگیا اور جس نے بھی معاہدے کی افادیت پر شک کا اظہار کیا وہی مشکوک ٹھہرا دیا گیا۔ اخبار' ٹی وی' ریڈیو' اسمبلی' مذاکرے' مباحثے' ارکان اسمبلی' دلال' پاکستان نیشنل سنٹر' نائیوں کی دکانیں' بسوں کے اڈے' رنڈی خانے' گرم حمام اور مولوی مسافر خانے ہر طرف سے اور ہر جگہ سے اس کامیابی پر تحسین بلند ہوتی تھی۔

میاں صاحب کی حکومت نے ایک انچ زمین اور ایک فرد واحد کو بھی اس

کامیابی کے پراپیگنڈے سے غیر متاثر نہ چھوڑا یوں لگتا تھا کہ جیسے میاں صاحب کی حکومت نے معاشی ایٹمی دھماکہ کر دیا ہو۔

یو این ڈی پی والے اس تازہ بتازہ معاشی دھماکہ خیزی کے تناظر میں پاکستان میں اپنے ترقیاتی پروگرام اور پراجیکٹس پر مزید سرمایہ کاری سے پہلے یہ یقین حاصل کرلینا چاہتے ہیں کہ بقول وزیراعظم پاکستان عنقریب بدل جانے والے معاشی منظرنامے میں' ان کے منصوبے اور پراجیکٹس کی افادیت بہر حال مثبت اور کامیاب رہے گی۔ کم بولنے اور زیادہ سننے والے یہ ماہرین اسی نکتے کو سر کرنے سر جوڑے بیٹھے ہیں

میں نے ان پروفیسرز کو اس سے پہلے کبھی ایسی غیر یقینی صورت اور عالم اضطراب میں نہیں دیکھا تھا' اکنامکس کی تھیوریز' ماڈل اور فارمولے جو ان لوگوں نے ایجاد کئے تھے آج ناکام ہوتے نظر آرہے تھے ان لوگوں کی علمی جنتری میں جتنے بھی معاشی نقشے اور اقتصادی زائچے تھے وہ نہری پانی کے اس معاہدے پر کسی طرح بھی فٹ نہیں بیٹھتے تھے بلکہ اس پانی میں بہہ بہہ جاتے تھے۔

کبھی یہ لوگ ہمارے والے ایک مربع اراضی کو ایکڑوں میں بدلتے کبھی اسی مربع کو مربع میل میں بدل دیتے۔ کبھی دریائے سندھ کے اضافی پانی کے کیوسک فٹ نکالتے' اس پانی سے ممکنہ اضافی زمین سیراب کرتے تو کبھی پانی کم پڑ جاتا کبھی زمین کم پڑ جاتی' کہیں کہیں زمین پر پانی کھڑا ہو جاتا اور نچلے درجے کے سیلاب کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی جب بھی ایسے ہونے لگتا تو مسٹر وول لارک شک بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگتے کہ جیسے یہ کیا دھرا میرا ہی ہو یا میں قصداً کچھ چھپا رہا ہوں اس مرحلے پر وہ مجھے مزید احتیاط سے پاکستانی اخباروں میں شائع شدہ اعداد وشمار دوبارہ پڑھنے پر لگا دیتے اور خود ذمہ داری

سے بری الذمہ ہو کر ٹھنڈی کافی کی پیالی منہ سے لگا لیتے جو ان کے سامنے کئی گھنٹوں سے دھری تھی۔

فی ایکڑ پیداوار کے لئے مطلوبہ مین پاور سے ایک کروڑ کو تقسیم کیا جاتا تو زمین کی مقدار اس قدر بڑھ جاتی کہ ہمالیہ تک کی قابل کاشت اراضی پاکستان کے تصرف میں آجاتی اور ہماری سرحدیں آس پڑوس کے ملکوں کو تاراج کرتی ہوئی نکل جاتیں۔ ہماری سرحدوں کو یوں پھیلتا دیکھ کر ان ماہرین کی نظریں بھی پھیلنے لگتیں اور نئے سرے سے پاکستانی سرحدوں کے اندر اندر زمین پانی اور روزگار کا تناسب طے کیا جانے لگتا۔ پاکستان کے نقشے پر گہرے سرخ حاشیے کی لکیر کھینچی گئی کہ آبی گزر گاہوں سے باہر جاتے ہوئے دھیان رہے کہ اس سرخ نشان سے آگے نہیں جانا ہے۔

پاکستانی زراعت کے اعداد وشمار والے شماریاتی بلیٹن کو بار بار بغور پڑھا جاتا اور مجھے حکم ملتا کہ پاکستان میں مروجہ مربع اراضی کو دوبارہ سے معیاری ایکڑوں میں تبدیل کروں' کبھی پوچھا جاتا کہ زرعی لیبر فورس میں عورتوں کا تناسب کیا ہو گا یہ ایک ایسا بے جوڑ تناسب اور نامناسب سوال تھا کہ جس کا جواب خود عورتوں کے پاس بھی نہیں ہو گا سو میں بھلا کیا کہہ سکتا تھا بجز اس کے کہ فلموں کی حد تک تو عورتوں کو کھیتوں میں روٹی' دودھ اور لسی لاتے' لے جاتے دیکھا گیا ہے اور اکثر فصلوں کی کٹائی' چھڑائی' اور چنائی کا کام بھی خواتین کرتی رہتی ہیں لیکن میرے اس سوال نما جواب پر یہ لوگ کچھ آزردہ سے ہو جاتے کہ جس گھر اور جس ملک میں جوان گھبرو مرد ہی بے روزگار بیٹھے ہوں وہاں اس بات کی پرواہ کسے ہو گی کہ زرعی لیبر فورس میں عورتوں کے روزگار کا تناسب کیا ہے۔

پاکستانی لیبر منسٹری کی سالانہ رپورٹ کے مطابق بے روزگاروں کی کل

تعداد (20 لاکھ) کو ایک کروڑ روزگار سے پر کرنے کی کوشش نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ معیشت کے جس ڈھانچے میں بے روزگار افراد کی تعداد 20 لاکھ ہو اور وہاں ایک کروڑ روزگار مہیا ہوں تو سو فیصد ایمپلائمنٹ کے بعد بھی مزید 80 لاکھ روزگار افرادی قوت کے قحط کی نشان دہی کرتے تھے۔

ان اعداد و شمار کے سامنے ان ماہرین کی مہارت دم توڑتی نظر آتی۔

کیا مستقبل قریب میں پاکستان خوفناک افرادی قوت کا شکار ہو جائے گا؟ بے روزگاروں کا قحط پڑ جائے گا' جہاں ایک کروڑ جاب موجود ہوں اور وہاں کام کرنے والے صرف 20 لاکھ افراد میسر ہوں تو ان ماہرین کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے عین فطری تھے جنہیں محض گرم گرم کافی سے مزید گرم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

جس روز کے اخباروں میں یہ چیختی چنگھاڑتی سرخی لگائی گئی کہ ایک کروڑ افراد کو روز گار مہیا کر دیا گیا ہے انہی اخباروں میں نسبتاً ایک چھوٹی سرخی یہ بھی تھی کہ محنت اور سمندر پار پاکستانیوں کے وزیر با تدبیر جناب اعجاز الحق کی متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں سے پاکستانی کارکنوں کے لئے امارات میں مزید روزگار کے امکانات پر مذاکرات کامیاب ہو گئے ہیں اور عنقریب کئی ہزار پاکستانی کارکنوں کو امارات میں کام کرنے کے لئے ویزے جاری کئے جائیں گے۔ اس خبر پر ڈاکٹر امارتیاسن بہت جز بز ہوتے وہ بار بار کہتے کہ خبر کو غور سے پڑھا جائے کہ کیا وزیر محنت امارات سے پاکستانی کارکنوں کو واپس لانے کے لئے تو مذاکرات نہیں کر رہے چونکہ اب تو ان کی سب سے زیادہ ضرورت پاکستان کو ہی ہو گی۔ اس سوال کے جواب میں ہمیشہ کی خوش فہم اور سادہ دل ڈاکٹر محبوبہ زمان خان مزید آہستگی سے کہتیں کہ ممکن ہے وزیر محنت پانی کی تقسیم کے اس معاہدے کے عمل میں آنے سے پہلے اس طرح کے

مذاکرات کر رہے ہوں یوں یہ خجالت بھرا لمحہ اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتا جب بھی موقع ملتا مزید خجالت سے بچنے کی خاطر میں کوئی ایسا غیر متعلقہ یا غیر ضروری سوال کر دیتا جس سے سب کا دھیان کسی اور طرف کو چلا جاتا مگر یہ صورت حال دو چار لمحوں سے زیادہ دیر باقی نہ رہتی اور یہ لوگ پھر سے جھوٹ اور سچ کے بخیئے ادھیڑنے میں لگ جاتے۔

میں نے ایک ایسے ہی قدرے غیر متعلق سوال میں پوچھا کہ جیسا کہ امریکہ' آسٹریلیا' کینیڈا اور دوسرے کئی ملکوں میں زرعی لیبر فورس سکٹر رہی ہے اور صنعتی لیبر فورس میں تبدیل ہو رہی ہے تو یہی رجحان پاکستان میں بھی ہے بلکہ پاکستان میں تو لوگ زمینیں بیچ بیچ کر سول سروس میں اور پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہو رہے ہیں لہٰذا زرعی لیبر فورس میں ایسے INCENTIVES متعارف کرانے ضروری ہوں گے کہ لوگ زرعی شعبے سے صنعتی شعبے کی طرف نہ جائیں۔ میرے اس طویل سوالیہ تبصرے پر یو این ڈی پی کے بزٹ اولسن نے براہ راست تین سوال اٹھائے اول یہ کہ اے ایس آئی کیا ہوتا ہے اور لوگ اے ایس آئی کیوں بننا چاہتے ہیں؟ میں نے مختصر جواب دیا کہ اے ایس آئی' اسسٹنٹ سب انسپکٹر کا مخفف ہے اور اے ایس آئی بن جانے سے غلط کاروں کو پکڑنے میں آسانی رہتی ہے اور معاشرے کی خدمت بھی ہوتی رہتی ہے۔

برٹ اولسن کا دوسرا سوال یہ تھا کہ سول سروس اور پولیس میں آنے کا زمینوں کے بیچنے سے کیا تعلق ہے۔ اس سوال کا سچ اور اصل جواب تو وہی ہے جو ہم سب جانتے ہیں کہ اے ایس آئی بننے کے لئے جس کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے آخر وہ آئے کہاں سے جب تک کہ کچھ بیچا نہ جائے لیکن مسٹر اولسن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں متامل ہو گیا۔ سچ آڑے آگیا

کہ سچ کہنے سے مزید شرمساری کا اندیشہ لاحق ہے۔

مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میں جس معاشرے کا فرد' جس زمین کا حصہ اور جس ماحول کی سائیکی کا بوجھ اور ورثہ اٹھائے پھرتا ہوں وہاں پہ رائج اور قبول عام سچ دوسروں معاشروں اور افراد میں انتہائی نازیبا اور سنگین جرم ہے۔

ہمارا معاشرہ جھوٹ کی ترغیب اور سچ کو چھپانے کے رموز سکھاتا ہے جب کہ جن معاشروں کو ہم بد کردار اور برا کہتے ہیں یہ معاشرے فرد کو سچ بولنے پر مجبور کرتے ہیں اور جھوٹ کی اجتماعی مذمت کرتے ہیں۔ ہم میں برے کو برا اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جرات مفقود ہوتی جا رہی ہے۔

جب میرے جواب دینے کا دورانیہ بذات خود سوالیہ بن گیا تو مسٹر اولسن نے پھر سے سوال دہرایا کہ سول سروس اور پولیس سروس کا زمینوں کے بیچنے سے کیا تعلق ہے' میں نے عرض کیا کہ اس سے یکسوئی رہتی ہے یہ فکر نہیں رہتا کہ پیچھے زمینیں ہیں' پلٹ کر بھی جانا ہے اس طرح سے انسان پوری توجہ' وقت اور دھیان سے خدمات انجام دے سکتا ہے۔

برٹ اولسن کا تیسرا سوال خالص تیکنیکی نوعیت کا تھا وہ کہنے لگے کہ کسی بھی متوازن اور مثبت اکانومی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں 3 فیصد سے 4 فیصد تک لیبر فورس بے روزگار رہے اور اضافی روزگار کے لئے ہمیشہ دستیاب ہو اس سے جاب مارکیٹ اور سروس انڈسٹری پر مسابقت کا دباؤ برقرار رہتا ہے' نئے آنے والے ملازمین اپنے ساتھ نئے نئے آئیڈیاز' نئی ٹیکنالوجی اور کام کرنے کی بے پناہ قوت' لگن اور ضرورتیں ساتھ لاتے ہیں جس سے اداروں کے سٹیٹس کو' کو توڑنے میں مدد ملتی ہے اور ادارے فعال اور آجر پر امید رہتا ہے' میں نے جواباً" عرض کیا کہ اس آئیڈیل اکانومی پر اصرار نہ کیا جائے نہ کوئی رخنہ ڈالا جائے ہمارے ہاں انشاء اللہ تین چار فیصد بے روزگار تو کسی بھی

ہنگامی صورت حال کے لئے نکل ہی آئیں گے جیسا کہ پیشہ ور بے روزگار یہاں ہمارے ہاں امریکہ میں ہیں اسی طرح پاکستان میں بھی ہیں جو بحر حال بے روزگار ہی رہیں گے' بے روزگار ہی رہتے ہیں یوں بھی ہماری لیبر مارکیٹ میں ہمارے تیس لاکھ افغانی بھائی ہاتھ بٹانے (یا ہمارے مزدور کا پیٹ کاٹنے) کو ہمیشہ موجود رہیں گے کچھ بھی ہو جائے انشاء اللہ یہ ہمیں چھوڑ کر جائیں گے نہیں حتی کہ ایک اور ایم کیو ایم وجود میں آجائے۔

ابھی میری یہ غیر متعلقہ اور غیر ضروری وضاحت جاری ہی تھی کہ پروفیسر گیری بیکر اپنی نیند بھری جیسی دھیمی آواز میں پانامہ کینال منصوبے کا ذکر لے بیٹھے وہ کہنے لگے کہ اس صدی کے شروع میں پانامہ کینال پراجیکٹ سے ایک لاکھ افراد کو روزگار مہیا ہوا تھا اور اس پراجیکٹ کو اس بارے میں ایک مثال تصور کیا جاتا ہے اس کے علاوہ کوئی ایسا افادیت بھرا منصوبہ سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا کہ جس سے اس قدر بڑی تعداد میں روزگار کا فوارہ چھوٹا ہو۔

گیری بیکر بار بار اس بات کو دہراتے کہ وہ پاکستانی وزیراعظم کی سیاسی کامیابیوں سے نابلد ہیں وہ انہیں بالکل نہیں جانتے بلکہ انہوں نے پہلی بار ہی ان کا نام اس منصوبے اور ایک کروڑ روزگار کے حوالے سے ہی سنا ہے لیکن وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ وزیراعظم پاکستان سیاستدان اور حکمران خواہ جیسے بھی ہوں مگر وہ ایک بہت بڑے ماہر معاشیات ضرور ہیں اس قدر عظیم الشان معاہدے کے پس منظر میں انتہائی ماہر معیشت کار فرما ہے۔

یہ سارے ماہرین جس ایک نکتے پر متفق تھے اور جس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے وہ یہ تھا کہ اس سے پہلے انسانی تاریخ میں کوئی ایسا معاشی منصوبہ' کوئی ایسا معاہدہ عمل میں نہیں آیا کہ جس کی تکمیل سے دس ملین افراد کو روزگار مہیا کئے جانے کا امکان ہی وابستہ ہو۔

بیچ بیچ میں ڈاکٹر امارتیارسن اپنے اس اندیشے کا اظہار بھی کرتے جاتے کہ کہیں پاکستان افرادی قوت کے قحط کا شکار نہ ہو جائے اور اپنے اس اندیشے کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس پاکستانی وزارت محنت کے اعداد و شمار موجود تھے۔

روزگار میسر ہے مگر کام کرنے والے موجود نہیں ہیں چونکہ ہر وہ فرد جو کام کر سکتا ہے وہ پہلے ہی سے برسر روزگار ہے آجر ڈھونڈتے پھرتے ہیں' آوازیں لگاتے ہیں کہ آؤ اور روزگار لے لو مگر کوئی بے روزگار ہو تو سنی بھی جائے' کوئی حاجت مند ہو تو سن بھی لے۔

مسجد نبوی کے صحن میں مال وزر کے انبار لگے ہیں مغرب ہونے کو آئی نقارے پیٹنے اور صدائیں دینے والے تھک ہار کر واپس آگئے کہ کوئی حاجت مند' کوئی طلب گار آئے اور جس قدر چاہے لے لے مگر کوئی حاجت مند ہو تو آئے بھی۔ میاں صاحب نے عہد فاروقی کی یاد تازہ کر دی وہ اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں عدالت عظمٰی میں حاضری پر بھی انہوں نے ایسی ہی یاد تازہ کر دی تھی وہ اپنے بیشتر اقدامات اسلامی عہد اور اسلاف کی پیروی کے حوالے سے ہی کرتے ہیں مگر پھر بھی میاں نواز شریف کے اقدامات کی تاثیر اور نتائج کسی اور ہی عہد اور کسی دوسرے ہی اسلاف کی پیروی ثابت ہوتے ہیں۔

میاں نواز شریف کے ہاتھوں یہ معاشی معجزہ بہرحال ان ماہرین کے نزدیک اس روئے زمین پر پہلی ایسی مثال ہے کہ ایک ناامید انبوہ کثیر رات کو سویا تو بے روزگار تھا' صبح کو جاگا تو نصیب بھی جاگ گئے ہر فرد واحد نہ صرف برسر روزگار تھا بلکہ کمیاب بھی تھا آنا فانا اور راتوں رات اس قدر عظیم الشان معجزے کے کسی تخلیق کار سے یہ کرہ ارض آشنا نہیں تھی یہ ہمارے وزیراعظم کے حصے میں ہی آیا

پسِ افتاد

شکاگو یونیورسٹی کے سٹاف روم میں پیش آنے والے اس واقعہ کو کم وبیش دس برس گزر چکے ہیں۔ اس واقعے سے وابستہ ایک بات جو ہنوز تصفیہ طلب ہے' وہ یہ ہے کہ کیا واقعی یہ ماہرین اسی قدر بے خبرے تھے کہ وہ ایک سیدھے سادھے سیاسی بلف اور ہمارے ہاں کے حکمرانوں کی روایتی دروغ گوئی کو بھی نہ سمجھ سکے یا وہ رجائیت پسند اس قدر تھے کہ ہمارے نہری پانی کے معاہدے پر میاں صاحب کے دعوے کے مطابق واقعتاً کسی ممکنہ روزگار کے مواقع دیکھ رہے تھے یا وہ سب کچھ ان کے پروفیشنل ازم کا حصہ اور ٹریننگ کا اثر تھا کہ ان ماہرین نے نہ تو کھل کر یہ کہا کہ ہاں یہ بات سچ ہے' ممکن ہے' ایسا ہو سکتا ہے' ایسا ہی ہو گا' نہ یہ کہ' یہ بات ممکن نہیں ہے۔ یہ امید' اندیشے اور قیافے' لاعلمی' جہالت' کذب و ریا اور سراسر بلف بنیاد ہیں۔ حالانکہ سٹاف روم میں موجود ہر فرد یقینی طور پر یہ جان چکا تھا کہ یہ بات کسی لحاظ سے بھی ممکن العمل نہیں ہے۔ نہ تکنیکی حوالے سے' نہ خوش فہمی کے ناطے سے۔

ان ماہرین کی مرتب کردہ رپورٹ کی کاپی جو یو این ڈی پی کی وساطت سے حکومت پاکستان کو دی گئی' اس میں انتہائی محتاط زبان اور لب ولہجے میں اس معاہدے پر مزید تحقیق اور اعداد وشمار کو زیادہ احتیاط سے مرتب کرنے کی سفارش کی گئی۔ مزید یہ بھی کہا گیا کہ وزیراعظم پاکستان کا تخمینہ تکنیکی اعتبار سے قبل از وقت ہے حتیٰ کہ کچھ ابتدائی برسوں کے تجرباتی اعداد و شمار اس دعوے کی صداقت میں اور اسے ثابت کرنے کے لئے پیش کئے جاسکیں۔

یہ انتہائی محتاط تجزیہ جو کہ امریکن کارپوریٹ کمرشل کلچر کا آئینہ دار اور مشاورت کے معاوضے کے مارے ہوئے ان ماہرین کی مجبوری ہو سوٗ ہو مگر ہماری طرح کروڑوں عوام کی مجبوری ہر گز نہیں ہے۔ مجھ سے لاکھوں لاعلمے اسی وقت یہ بات جان گئے تھے کہ روزگار کے حوالے سے ایک کروڑ تو خیر انتہائی مبالغہ آمیز ٹارگٹ ہے اس معاہدے سے محض ایک ہزار روزگار بھی مہیا نہیں جاسکیں گے اور عوام اس طرح سوچنے میں حق بجانب اس وجہ سے ہیں کہ اگر حکمرانوں کے دعوؤں اور بیانات پر یقین کر لیا جاتا اور یہ سچے بھی ہوتے تو آج پاکستان کی معاشی اور اقتصادی حالت کم از کم جاپان جیسی ضرور ہوتی۔

عوام سے اس قدر جھوٹ بولے گئے ہیں بے سروپا وعدے اور بے تکے دعوے کئے گئے ہیں' ایسے ایسے خواب دکھائے گئے ہیں اور ایسی ایسی بشارتیں دی گئی ہیں کہ اگر ان کا ایک فیصد بھی سچ ہو جاتا' تب بھی ہم بہت بہتر' خوش حال اور آسودہ قوم ہوتے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اس ایک کروڑ روزگار کی مثال لے لیجئے۔ میاں صاحب کے دعوے کو دس برس گزر بھی چکے۔ ان برسوں میں، جس معاہدے سے ایک کروڑ روزگار کا معاشی جن برآمد ہونا تھا، وہاں سے ایک بے ضرر چڑیا بھی نہ نکل سکی۔

یوں تو ہمارے سارے حکمرانوں کا یہی خاصہ رہا ہے کہ دروغ گوئی' آئی چلائی' بلف اور بے شرمی سے تعمیر وترقی کے فرضی اعداد وشمار' نام نہاد ترقی اور تمنائی کامیابی کا ایک ایسا حصار کھینچ دو' ایسا طوفان اٹھا دو کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ ہیجان برپا کر دو' عوام کی مت اور خواص کا ضمیر مار دو لیکن اس باب میں جو امتیاز اور کامرانی میاں نواز شریف کے حصے میں آئی' اس کی دور دور تک کوئی مثال نہیں ملتی ہے اس میدان میں ان کا کوئی جوڑ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔اس میدان کے وہ مرد بلا خیز وبلا مقابلہ ہیں۔

میاں نواز شریف اپنے سارے اخلاص' جذباتیت' پاکستانیت اور بھاری مینڈیٹ کے باوجود بھی باقی حکمرانوں میں بلف ماسٹر کی مستند حیثیت رکھتے ہیں۔

جنرل جیلانی اور جنرل ضیاء الحق کی امامت میں اس سے سوا اور سیکھا بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس میں میاں صاحب کا شائد اس قدر قصور بھی نہ ہو کہ ان کو خلیفے ہی ایسے ملے تھے۔ نہری پانی کے جس معاہدے کے بطن سے ایک کروڑ روزگار پھوٹنے تھے وہاں ایسا سوتا پڑ گیا اور ہُو چھا گیا کہ ایک ہزار روز گار بھی پیدا نہ ہو سکے۔ نہری علاقوں سے دور دراز بنجر زمینوں پر جو لوگ پانی اور روزگار کے آنے کی خبر پر رقصاں ہو گئے تھے' ان کے پاؤں دھمالیں ڈالتے ڈالتے لہو لہان ہو گئے اور دس برس بھی گزر گئے مگر نہ پانی آیا' نہ روزگار' نہ زمین پر ہریالی' البتہ زخم ضرور ہرے ہو گئے۔

جس موٹر وے نے عوام کی تقدیر بدلنی تھی اور کروڑوں روز کے کمانے تھے' اسی موٹر کے چالو ہوتے ہی سرکاری خزانے میں خسارے کا ایک اور مستقل کھاتہ بنام موٹر وے کھول دیا گیا اور اب کھلا ہی رہے گا۔ شنید ہے کہ اس موٹر وے پر جس قدر آمدورفت کا تخمینہ اور ٹریفک کے دباؤ کا قیافہ لگایا گیا تھا اس قدر موٹر وہیکل پورے ملک میں بھی نہیں ہیں' بالکل اسی طرح کہ

جیسے ملک بھر میں اتنے بے روزگار نہیں تھے کہ جتنے روزگار پیدا کر دیئے گئے تھے' سو اب اس موٹر وے پر دوڑے تو دوڑے کون؟ دباؤ ہو تو کس کا ہو اور آمدورفت کا بار کون اٹھائے؟ موٹر وے پر دباؤ اور آمدورفت کے اس خلاء کو پولیس اور ڈاکوؤں نے اپنی کارگزاریوں سے بھر دیا نتیجتاً" موٹر وے ویرانی' وحشت' غیر محفوظیت اور دہشت کی زد میں آگئی' جو تھوڑی سی بچی تھی اس پر ٹول ٹیکس والے بٹھا دیئے گئے۔

جس قرض سے موٹر وے بنائی گئی اس قرض کو جس مد سے ادا کرنا تھا' وہ حسب معمول غلط تخمینے' ناکارہ قیافے' جعلی مہارت اور کمیشن کی زد میں آگئی اب موٹر وے ہے' عوام ہیں اور ہر روز کا بڑھتا ہوا شرح سود ہے۔ سود در سود کا سودا ہے' اور خسارے کا کھاتہ کھلا ہوا ہے۔

موٹر وے کی رسم افتتاح والے پتھر کے ساتھ ہی اگر ایک اور پتھر بھی ہر روز کے بڑھنے والے شرح سود اور قرض سے متعلق اعداد وشمار کا گاڑ دیا جائے تو اس موٹر وے پر سفر کرنے والے اپنی خوش بختی پر کیوں نہ نازاں ہوں اور حکومت کے کیسے کیسے احسان مند ہوں کہ بھلے ہماری نسلوں تک کو مقروض اور ہمارا فردا رہن رکھ دیا مگر ہمیں تو تیز رفتار "ہوٹے" اور موٹر وے کی موجیں لگ گئی ہیں۔

میاں صاحب کی کشکول توڑ و ہوائی کا بھی یہی حال ہوا بلکہ اس میں یہ خِفّت مزید ہوئی کہ عالمی سطح پر ہم سب کی نظروں میں آگئے ہیں۔ ہمیں ایسی قوم کے طور پر روشناس کرا دیا گیا ہے کہ جو کشکول بدست ہے۔ حالانکہ ہم سے زیادہ مقروض اور بھی ملک ہیں۔ اس سے پہلے ہماری حکومتیں خفیہ' ڈرتے ڈرتے اور اندر خانے قرضے لے لیتی تھیں۔ عوام کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی کہ یہ جو مال اڑایا جا رہا ہے یہ آیا کہاں سے ہے؟ عوام سود کے اس

غیر شرعی فعل سے دور دور رہتے تھے اور حکومتوں نے اس قبیح فعل کو انجام دینے والے خاص طرح کے کارندے پال رکھے تھے۔ اس قباحت کی انجام دہی کے لئے صدر ایوب خان کی نظر انتخاب محمد شعیب پر جا ٹھہری انہوں نے اس کار بد کو خاصی خوش اسلوبی سے نبھایا حتیٰ کہ وہ اسی مٹی کی طرف لوٹ گئے کہ جہاں سے ان کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ خدمات غلام اسحاق خان کے سپرد کر دی گئیں' اسحٰق خان نے اپنے مزاج کی افتاد اور ذہنی رجحان کی وجہ سے اس شعبے میں بہت ترقی کی اور مختلف حکومتوں کے لئے یکساں اخلاص سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گرانٹ رائٹنگ اور لون فزی بلیٹی رپورٹس تیار کرنے کے وہ بے تاج بادشاہ بن گئے۔ کم ازکم پورے ایشیاء میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ اپنی اس مہارت اور خود سپردگی کے وصف کی بدولت کئی حکومتوں کے فرنٹ مین بنے رہے۔ ایک طرف تو وہ غیر ملکوں اور ایجنسیوں سے قرضے کی عرض نیازتے وقت ایسا ملتجیانہ' فدویانہ اور حاجت مندانہ رویہ اختیار کر لیتے کہ قرض دینے والوں کو نہ کرنا مشکل ہو جاتا اور دوسری طرف سراسر خسارے کے بجٹ کو منافع بھرے کمبل میں لپیٹ کر پیش کر دیتے۔ ان کی اسی صلاحیت نے حکومتوں کی لوٹ مار اور ان کی معاشی ناکامیوں پر پردہ ڈالے رکھا اب نہ اسحاق خان ہیں' نہ کوئی پردے داری رہ گئی ہے قرض کا پہاڑ ہے اور اس کے نیچے دبے ہوئے مقروض عوام۔

غیر ملکی قرضوں کے بارے میں جو راز داری مروج تھی' اب کوئی راز نہیں رہی' شائد ہی کوئی ایسا ذی ہوش فرد ہو' جسے منظور شدہ اور ملنے والے قرضوں کا شیڈول تک زبانی یاد نہ ہو کہ کتنے بلین کب اور کہاں سے ملنے ہیں؟ جن قرضوں پر منت سماجت جاری ہوتی ہے' ان پر بھی سب کی نظر ہوتی

ہے۔ ادائیگی کے اعداد وشمار بھی سب کو ازبر ہیں کہ کونسی قسط، کتنے کی قسط، کب ادا کرنی ہو گی۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کونسا بنک، کونسا ادارہ اور کیا اثاثہ بیچ کر یہ قسط دینی ہے۔ اللہ کرے کہ بیچنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ موجود ہو۔ ورنہ یہ حکمران تو ایسے ہیں کہ اگر اور کچھ نہیں ہو گا تو ہمیں بھی بیچ دیں گے اور ملک بھی۔ عوامی تنفس کی ڈوری اب اسی کشکول سے بندھی ہے اگر کشکول ٹوٹا تو ڈوری بھی ٹوٹتی ہے

میاں صاحب کشکول تو خیر کیا توڑتے بلکہ ایسا مستقل انتظام کر دیا گیا ہے کہ سود در سود کی یہ لعنت نسل در نسل تک مسلط ہو گئی ہے۔ جو موجود ہیں ان کے ہونے کا جرم تو سمجھ میں آتا ہے مگر جو پیدا ہوں گے اور ہر لمحہ ہو رہے ہیں، وہ بھی ہزاروں ڈالر کے قرض کا بوجھ اٹھائے اور ہماری وراثت کا ناخوشگوار بوجھ اٹھائے اور نہ جانے مزید کیسے کیسے اور کون کون سے بوجھ اٹھائے پیدا ہو رہے ہیں۔ ؟

جو نسل اپنی آنے والی نسلوں کو خود حاصل کردہ ورثے سے کم منتقل کرتی ہے، اس نسل کا جرم نہ تاریخ معاف کرتی ہے، نہ ہی ان کی اپنی نسل ایسا نہ ہو کہ نادہندگی کے کٹہرے کے بعد ہم تاریخ کے کٹہرے میں بھی اپنی ہی نسل کی عائد کردہ فرد جرم پر شرمسار کھڑے ہوں۔

اس ملک مال غنیم میں کوئی نہ کوئی فرد، ادارہ اور ضابطہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے کہ جو یہ پوچھ سکے کہ بھاری مینڈیٹ کشکول توڑنے کے لئے دیا گیا تھا لیکن اسے گردنوں میں حائل اور ہاتھوں میں مستقل کر دیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا، یہ بدعہدی ہے، نازیبا ہے، جس شرط اور وعدے پر مینڈیٹ دیا گیا تھا، اس کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔

تاحال تو مینڈیٹ کو کشکول کلچر پروان چڑھانے کے لئے ہی استعمال کیا گیا

ہے' جو کہ انتہائی نامناسب اور اس غیر تحریری معاہدے کی سنگین خلاف ورزی ہے' جو مینڈیٹ دینے اور مینڈیٹ لینے والوں کے درمیان طے پایا تھا۔

ابھی عوام کشکول کے ٹوٹ جانے پر ہی بھنگڑے ڈال رہے تھے کہ تعلیمی پالیسی کا چاند چڑھ گیا۔ میاں صاحب کی تعلیمی پالیسی کے حوالے سے عوام کو بتایا گیا کہ آج سے آٹھ ہزار سکول سالانہ کھولے جائیں گے۔ شرح خواندگی آسمان کو چھونے لگے گی۔ اس بات کو دو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور حکومت کے وعدے کے مطابق ان دو سالوں میں اس تعلیمی پالیسی کے مطابق سولہ ہزار سکول کھولے جانے تھے' جو کہ بلاشبہ پرائمری سطح کی تعلیم کی سمت میں ایک مثبت اقدام ہوتا لیکن سو سکولوں کی منظوری کی پہلی ہی سمری جب حکومت کو پیش کی گئی تو خزانے میں نسبتاً اس غیر ضروری کام کے لئے رقم نہ ہونے کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی۔ تعلیمی پالیسی کی کامیابی پر ابھی طوفان تھما بھی نہیں تھا' عوام کے بھنگڑے اور فائرنگ جاری تھی کہ ایٹمی دھماکہ آن پہنچا۔ دھماکے کے بعد پیسے اور امید دونوں مک گئے۔

عوامی ترقی' خوش حالی اور پاکستان سے جذباتی حد تک اخلاص ظاہر کرنے والے وزیراعظم سے یہ ضرور پوچھا جانا چاہئے کہ ہماری اس سیاہ بختی کی وجہ کیا ہے کہ آپ کا ہر اقدام' ہر فیصلہ' معاہدہ' منصوبہ اور پالیسی خسارے میں' گھاٹے میں اور عوام کے خلاف ہی کیوں ثابت ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ حکم دیتے ہیں' اس کے مطابق عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم کے احکامات اور وعدے محض نمائشی اور دکھاوے کی حد تک ہی رہ گئے ہیں

مصاحبین کو عطا کئے گئے پلاٹ اور پرمٹ کے احکامات پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کی طرح ایسے احکامات پر بھی عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے جن سے عوام کے حقوق اور فائدے وابستہ ہوتے ہیں۔

عوام آج بھی اسی انتظار میں ہیں بلکہ ناامیدی میں ہیں کہ جس وی آئی پی کلچر کو نابود کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا' اس کا کیا بنا؟ اس بات پہ کب کی مبارک باد وصول کی جا چکی ہے کہ وی آئی پی لاؤنجز ختم کر دیئے جائیں گے وزیراعظم ہاؤس فروخت کر کے رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جائے گی۔ وزراء سے سرکاری رہائش گاہیں واپس لے لی جائیں گی' سادگی کا چلن عام کیا جائے گا' سرکاری دستر خوان مختصر اور کھانے والے مختصر ترین کر دیئے جائیں گے۔ سرکاری حکام عوامی ٹرانسپورٹ میں عوام کے شانہ بشانہ سفر کریں گے' غیر ملکی دوروں کو کڑی نظر میں رکھا جائے گا۔ قیمتی مگر سرکاری بیمار جانوں کا علاج معالجہ اندرون ملک ہی کیا جائے گا اور قومی وسائل کے زیاں کی ناکہ بندی کر دی جائے گی۔ پیسے پیسے پر نظر رکھی جائے گی' احتساب ہو گا' سادگی آجائے گی اسلام کا سب سے بڑا وصف یعنی سادگی اور برابری نمایاں ہو گی' عہد راشدین کا افتخار ابھرے گا اور سنت رسول اللہ ﷺ کو زندہ کیا جائے گا۔

حیرانی ہوتی ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہو سکا دکھاوے کی حد تک بھی ایک بات پوری نہ کی جا سکی

جن وی آئی پی لاؤنجز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی نوید تھی، وہاں نئے قالین بچھا دیئے گئے، فرنیچر بدلا دیا گیا، نئے پردے لٹکا دیئے گئے اور سیکورٹی سٹاف میں اضافہ کر دیا گیا۔ وزیر اعظم ہاؤس کی فروختگی بھی عمل میں نہ آسکی۔ کوئی وزیر' کوئی مشیر' کوئی حکام بھی کسی عوامی ٹرانسپورٹ سے برآمد نہ ہوسکے۔ جن وزراء کے پاس پہلے ایک سرکاری رہائش گاہ تھی' اب اس سے زیادہ ہیں کہ ایک اضافی رہائش گاہ مہمان خانے' خفیہ سودے طے کرنے' مجرے' مراقبے اور ثقافتی عذر مستی کے لئے بھی درکار تھی۔

اب متعلقہ وزارت کے اصل احکامات جن پر عمل درآمد ہونا ہو یہیں سے جاری ہوتے ہیں۔

راتوں رات اور دن دیہاڑے

جب معاشرے میں جھوٹ' دکھاوے اور منافقت کا بول بالا ہو' دور دورہ ہو اور اوج عروج ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس معاشرے کے بڑے آپریشن کا وقت آن پہنچا ہے آپریشن میں تاخیر مزید قباحتوں اور الجھنوں کو تو جنم دے سکتی ہے مگر مرض الموت میں مبتلا بسمل کو شفا نہیں دے سکتی اس بسمل کا علاج بسم اللہ پڑھ کے آپریشن کرنے سے ہی ہو سکتا ہے

جب دلوں میں چھپے ہوئے بھید بھاؤ' سیکرٹ ایجنڈا اور زبان سے ادا ہونے والے الفاظ آپس میں میل نہ کھاتے ہوں' ظاہر اور باطن میں یکسانیت نہ ہو اور قول اور فعل ایک دوسرے کی ضد ہوں' بھید بھرے دل کی بات کو زبان پر لانے میں تامل کیا جانے لگے تو افراد کی ایسی کیفیت انہیں منافقت اور دکھاوے کی پہلی سیڑھی پر ایستادہ کر دیتی ہے۔

منافقت کے کوڑھ کی افزائش میں یہی پہلا مرحلہ اور پہلی سیڑھی ہی سر کرنی دشوار ہوتی ہے اسے عبور کرتے ہی افراد' معاشرے' آبادیاں اور گروہ' ملک اور قومیں یوں بے دریغ اس سیڑھی پر چڑھتے ہیں بلکہ بھاگتے ہوئے

چڑھتے ہیں کہ پھر رکنے کی، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی نہ توفیق ہوتی ہے نہ مہلت۔ منافقین کے لئے مشیت ایزدی کی دو ہی صورتیں ہیں، اول ان کا نفاق راتوں رات اور دن دیہاڑے ترقی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کے اعمال میں ایسی افراط' ایسی افزائش بھر دیتے ہیں کہ مزید منافقت بھی کم پڑ جاتی ہے اور یوں مفاد' ہوس' لالچ' دروغ اور بدنیتی کی رسی اللہ کی رسی سے دراز اور مضبوط نظر آنے لگتی ہے۔

دوئم یہ کہ ایسے افراد' گروہوں اور معاشروں کا فی النار ہو جانا' مٹ جانا اور عبرت کی مثال بن جانا ہی مقدر ہے۔ صدائے عام بلند ہوتی ہے کہ آؤ اور اس رسی کو اپنی اپنی گردنوں میں ڈال لو۔ خلق خدا ٹوٹ کر پڑتی ہے انبوہ کثیر جمع ہو جاتا ہے' اکثریتی حصہ بے قابو ہو جاتا ہے کہ کسی بھی طرح اس کے ہاتھ یہ رسی آجائے بعد میں چاہے یہی رسی کھنچے جانے کے لئے مستعمل ہو یا گردنوں میں طوق لٹکانے کے کام آئے۔

مک مکا اور معاشرتی منافقت کا بدترین عروج اور سیاہ ترین پہلو وہ ہوتا ہے کہ جب دکھاوا، سودے بازی، منافقت اور تصنع گھر کی چار دیواری کے اندر قدم جمالے۔ انتہائی ذاتی اور گھریلو نوعیت کے معاملات اور فرد کا دوسرے فرد سے سماجی ناطہ منافقت کے رنگ میں ڈھل جائے۔ مک مکا کو فیصلہ کن قوت حاصل ہو جائے اور سارے کے سارے عمل' اعمال' لفظ' الفاظ اور لین دین سے بازاری گفتگو اور مفاداتی لہجے کا تعفن پھوٹنے لگے۔ معاشرتی صورت حال ایسی ہو جائے تو اول تو بہت نمایاں ہوتی ہے جو کہ بلاشبہ ہے اور دوسرا یہ کہ افراد ایک خاص حد سے زیادہ اسے چھپانے کا تردّد کرتے بھی نہیں کہ چھپانے سے مفادات پر زد پڑ سکتی ہے۔ ہماری زمینیں اور آبادیاں، محلے اور گلیاں، مک مکا اور منافقت کی اسی فصل سے زرخیز اور ہری

بھری ہیں۔

صبح سے شام تک قدم قدم پر ہمیں اسی معاشرتی بگاڑ کا سامنا اور اسی قباحت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے' معاملات اخلاص کے متقاضی ہوں یا سادہ' سنجیدہ ہوں کہ کمرشل' ذاتی نوعیت کے ہوں یا گھریلو مگر جب بھی طے کئے جا رہے ہوتے ہیں کہیں نہ کہیں سے منافقت اور مک مکا کی کالک در آتی ہے اور معاملات کو کالا ٹمیالا کر دیتی ہے' اب یہی چلن رائج' متوقع اور قابل قبول ہو گیا ہے کہ محض جھوٹ بولو ہی نہیں بلکہ مانو بھی' بد دیانت بنو ہی نہیں دوسروں کو بھی بناؤ اور یہی یقین رکھو کہ مخاطب بھی ایسا ہی ہو گا۔ (انشاء اللہ وہ آپ کی توقع سے بڑھ کر بددیانت نکلے گا) سارا دن ہیرا پھیری' وعدہ شکنی' مال ملاوٹ' چھینا جھپٹی' گوڈے گردن اور آئی چلائی کے کار زار سے گزر کر جب شام کو خانگی ریگ زار مقابل ہوتا ہے تو اسے نفاق کی نوعیت تو بدل جاتی ہے مگر اساس اور اہمیت نہیں۔

کچھ نفاق ایسے بھی ہیں کہ سدا ساتھ رہتے ہیں، ہم ان کے عادی ہو چکے ہیں، منتظر اور پر یقین رہتے ہیں کہ رونما ہوں گے، خائف ہوتے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے' جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہو گا حتی کہ ایسا ہی ہو کے رہتا ہے نہ کہنے والا کا اعتبار ہے نہ اس کے لفظوں پر یقین' سب جانتے ہیں کہ لفظی کارگزاری' کاغذی جذبے اور وقتی کاروائی کے پیچھے اصل کچھ اور ہی ہے جو ظاہر سے بالکل مختلف ہوتا ہے بالکل ایسے کہ جس طرح صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جو بات تواتر سے ہم سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "آپ ہمارے بھائی ہیں" لیکن چھری کے نیچے آنے والی پہلی گردن اسی بدنصیب بھائی کی ہوتی ہے۔ سوچا یہ جانا چاہئے کہ اگر اس بات میں منافقت کے سوا کوئی وزن ہے کسی اخلاص کا شائبہ ہے' ہمدردی کی رمق ہے یا کسی سچ کی ملاوٹ ہے تو

پھر ان بھائی بندوں اور بھائی چارے کی موجودگی میں بھی آپ تنہا، پژمردہ، پسماندہ، ہراساں، شکست آثار اور دفاعی پوزیشن میں کیوں ہیں؟ اور اگر اس دوطرفہ دعوئ میں بال برابر بھی اخلاص شامل ہے تو پھر آپ کے غنیم زیادہ اور خیر سگال کمیاب کیوں ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جو یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ آپ ہمارے بھائی ہیں یہی شخص خیر سگال سے زیادہ دشنام طراز ثابت ہوتا ہے جو خود کو آپ کا ہدی خواں قرار دے رہا ہے وہی تو خنجر بکف ہے' صرف آپ کے اٹھ کر جانے کی دیر ہے دو چار قدم دور ہونے کی ضرورت ہے افراد اور احباب کا وہی حلقہ جو لمحہ بھر پہلے آپ کا نیابتی اور مطلب برار تھا' جانثار تھا' غمگسار تھا اب آپ کو سنگ ملامت سے کچلنے میں مصروف ہے اٹھ کر جانے والے ہر فرد کے بارے میں باقی افراد کا یہی رویہ برقرار رہتا ہے حتی کہ جانے والا واپس آکر خود انہی بدخواہوں کا حصہ بن جاتا ہے۔

کہاں دیکھئے تھے

زیادہ دیر کی بات نہیں ہے کم وبیش سو سال پہلے تک عموماً ایشائی معاشروں میں انفرادی بقاء کا دارومدار فرد کے نسلی اور قبائلی ناطے سے جڑا ہوا تھا اگر فرد کا تعلق کسی بااثر گروہ' خاندان اور قبیلے سے ہے تو وہ محفوظ ہوتا اور اگر فرد کا پشت پناہ اور حوالہ لوٹ مار' رسہ گیری اور زبردستی کی صفات سے آراستہ ہوتا تو محفوظ ترین۔ قبائلی عصبیت معاشروں کو کمزور اور فرد کو طاقتور بناتی ہے اور جاگیردارانہ لعنت ریاست کو کمزور اور قبیلوں کو مضبوط کرتی ہے' بیشتر ایشائی معاشروں سے یہ لعنت ختم ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے مگر ہمارے ہاں جڑ پکڑ رہی ہے اور دونوں صورتیں مروج اور مضبوط ہیں۔

ہماری مراجعت زمانہ جاہلیت کی طرف اور منہ قبلے کی طرف ہے حالانکہ یہ دونوں صورتیں ایک دوسری کی ضد ہیں۔

ہمارے یہاں انفرادی طاقت نے ریاستی قوت کو زیر کر لیا ہے اور معاشرے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ طالع آزما' ناشکرا' حاسد اور لوٹ مار کا مارا ہوا یہ فرد اس قدر طاقتور ہے کہ قانون کی شہ رگ اس کے پنجے میں ہے یہ اپنی

مرضی کے قانون بنوا سکتا ہے' قوانین کو معطل کر سکتا ہے' بے گناہ کو پھانسی اور مجرم کی پھانسی سے بریت کرا سکتا ہے' قتل کروا سکتا ہے اور قتل ہونے سے روک سکتا ہے۔ ایسی بے پناہ طاقت کے حامل افراد کو سرعام سنگسار کئے بغیر معاشرتی سنوار کی ہر کوشش اکارت چلی جائے گی۔

دور جاہلیت اور عہد قانون شکنی کے اس علامتی عفریت نے ہمارے معاشرے اور فرد کو اپنی بقا کے لئے ایک بار پھر نسلی اور قبائلی طرز معاشرت کی طرف مراجعت پر مجبور کر رکھا ہے۔ ادارے کمزور ترین ہو چکے ہیں ملک اور معاشرے کا دیوالیہ نکل گیا ہے مگر افراد طاقتور ہیں انفرادی طور پر ہر تیسرا آدمی خوش حال، طرم خان، کم از کم نوابزادہ، عموماً صاحبزادہ، آل رسول میں سے، نجیب الطرفین، باریاب، دو دھاری تلوار اور بامشرف ہے کسی نہ کسی نسلی اور قبائلی لاحقے سے بندھا ہوا ہے' ہرل ہے' کھرل ہے' کسانہ ہے' وٹو ہے' سردار ہے' سرکی ہے' خان ہے' چانڈ کا ہے' مہمند ہے' شاہ جی ہے' مخدوم ہے' میر' مہر' مرزا اور مراٹھ ہے یہ الگ بات کہ نام کے امتیازی لاحقے کے باوجود رات گئے کوئی ڈاکہ مارنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے اور کوئی دن دیہاڑے ٹیکس چوری کی چالیں سوچ رہا ہے کوئی گھر کی چار دیواری میں خفیہ مجرے منعقد کر رہا ہے۔ کسی نے سمگلنگ کے مال کو مال مویشی اور عورتوں والے احاطے میں چھپا رکھا ہے اور کوئی بہنوں میں بٹنے والی وراثت کے بٹوارے کے خوف سے ان کی شادی نامردوں سے کرنے پر تلا ہوا ہے۔

یہ بڑا منطقی سوال ہے کہ جب ہمارا معاشرہ اس طرح کے سورماؤں اور طبقہ اشرافیہ سے بھرا پڑا ہے کہ گھر گھر میں سے ٹوانے' دولتانے' خوش بخت' چودہرانیاں' نیک پروینیں' صاحبزادیاں' کھر' کھرل' کھوکھر' کھوسے' رانا سنگھے' مخدومیئے' جالندھریے' خواجے' سجادہ نشین' مملوک' جتوئی' آفریدی' بندیال'

اور دو موہنے سانپ کی طرح خان دہشت خان برآمد ہوتے ہوں تو پھر یہ معاشرہ ناتواں کیوں ہے' افلاس زدہ اور الم انگیز کیوں ہے' لاچار' کسمپرس' دکھ وابستہ اور درد پیوستہ کیوں ہے' جب کہ ہر دوسرا آدمی یہاں شیر دل خان' گنڈاسہ بدست' کلاشن کوف بردار' اور کسی نہ کسی ڈی ایس پی کا رشتہ دار ہے' کسی سمگلر کا بھائی اور کسی فوجی کا بھائی بند ہے تو لوگ عدم تحفظ کا شکار کیوں ہیں' یہ تحفظ کا قحط کس حساب میں ہے؟

لاجیکل جواب اس سوال کا یہ ہے کہ ہمارا طبقہ اشرافیہ' اشرافیہ کم بلکہ ناسوریہ زیادہ ہے اور جب واضح حصہ ناسور ہو' زہرباد ہو تو پھر ہمارے جیسے معاشرے ہی وجود میں آتے ہیں۔ وہی کچھ کاٹا جا سکتا ہے جو بیجا گیا ہو۔

اس ناسور کو کاٹے بنا سدھار کی اٹکل پچو کوشش تو کی جا سکتی ہے مگر مرض کا حتمی علاج ناسور کا کاٹنا ہی ہوتا ہے جو بالاآخر کاٹنا ہی پڑے گا' بنا کاٹے کام چلے گا نہیں۔ ناسور کے بارے میں سب سے اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ اسے جس قدر جلد کاٹ کر پھینک دیا جائے صحت یابی کے امکان اسی قدر زیادہ ہوتے ہیں گو کہ اس ابتدائی سطح کے کم خرچ اور آسان نسخے کا وقت گزر چکا ہے اور ناسور اپنی ابتدائی مدافعت پر قابو بھی پا چکا ہے مگر بہرحال لاعلاج نہیں ہے۔

قدم قدم اور قریہ قریہ' صبح سے شام تک بے شمار مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں کہ جن سے ریاست کی کمزوری اور ابتری اور فرد کی قوت اور شہ زوری کا احساس ہوتا رہتا ہے اور یہ مانے بنا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے کی اساس الٹ چکی ہے اور معاشرے کی کسی بھی حتمی تعریف کی رو سے معاشرہ کو جس طرح ڈیفائن کیا جاتا ہے ہمارے ہاں یہ گنگا الٹی بہہ رہی ہے' جیسا کہ افراد سے معاشرہ بنتا ہے اور فرد معاشرے کو تخلیق کرتا ہے

یہاں معاشرے کو افراد نے آگے لگا رکھا ہے اور اپنے مفادات کی رسیوں سے باندھ رکھا ہے۔ ایک فرد واحد پورے معاشرے کو الٹنے پلٹنے پر قادر ہے۔ ہمارے ہاں علاقائی معاشرت فرد کے گرد گھومتی ہے اور بحیثیت مجموعی' معاشرہ اور ریاست افراد کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے۔

جس گلی میں چلتے وقت آپ ایک ہاتھ سے اپنی شلوار کے پائینچے اس ڈر سے اوپر اٹھا لیتے ہوں کہ زمین پر بہتا ہوا گندہ پانی آپ کے کپڑوں پر نشان نہ ڈال دے' ناپاک نہ کر دے اور جہاں اگلا قدم رکھنے سے پہلے یہ دیکھنا اور طے کرنا پڑے کہ کہاں رکھا جائے اسی گلی میں جب آپ کسی گھر میں داخل ہوتے ہیں تو باہر کی کلفت اور خستگی کو بھول جاتے ہیں چونکہ گھر کے اندرونی آثار باہر والے ماحول سے مختلف ہوتے ہیں۔ گھر میں کلر ٹی وی اور ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے گرم گرم چائے حاضر ہے امریکہ اور جاپان کی باتیں ہو رہی ہیں' کباب کھائے جا رہے ہیں' وی سی آر پر فزیکل فٹنس کی نیم برہنہ فلم چل رہی ہے' قالین بچھے ہوئے ہیں' لڑکیاں شاپنگ کے لئے اور لڑکے شام کی واک پر روانہ ہو رہے ہیں' رات کے کھانے کا مینو طے کیا جا رہا ہے' ریسٹورنٹ کے انتخاب پر تنازعہ اور بحث ہو رہی ہے۔ کپڑوں کے ڈیزائن' کار کے ماڈل' ہائی فریکوینسی کے سی ڈی پلیئر پر گفتگو ہو رہی ہے' فون بج رہے ہیں' فرمائشیں لکھوائی جا رہی ہیں' چائینیز' برگر' پزا' اور میکڈانلڈ فوڈ کی فرمائش کی جا رہی ہے اور گرین کارڈ کے حصول کی سکیمیں سوچی جا رہی ہیں' مگر گھر سے قدم نکالتے ہی افسردگی' بدحالی' گندگی' خستگی اور افلاس آپ کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

گھر چونکہ انفرادی اور ذاتی ملکیت کا اظہار کرتے ہیں سو وہ سجے سجائے' لدے پھندے اور مال و ملکیت سے بھرے ہوئے ہیں' گلی' سڑکیں' محلے'

بازار، فٹ پاتھ اور سائیڈ واک اجتماعی ملکیت سے منسوب ہیں اور ریاستی ملکیت کے زمرے میں آتے ہیں سو وہ خستہ حال، شکستہ، گندے اور وسائل کی کمی کا احساس دلاتے ہیں۔

مملکت خداداد کا مال وزر اور سازو سامان مملکت کے خزانوں سے نکل کر انفرادی ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے اور طاقتور فرد کے تسلط میں ہے سو درماندگی کی یہ تصویر اسی حقیقت کی عکاس ہے۔

کوئی بے شرمی سی بے شرمی ہے

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب جب یہ کہتے تھے کہ ہمارا ترکہ خوب تھا مگر نسل ناخوب نکلی تو شاہ صاحب یا تو بہت انکسار سے کام لیتے تھے یا نسل کی ناخوبی اس قدر نکھر کر ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہ صاحب جس نسل کو ناخوب قرار دیتے تھے ہمارے آج کے معیار سے وہ اس قدر ناخوب نہیں تھی' اگر شاہ جی آج حیات ہوتے تو نہ جانے اس موجودہ نسل کے بارے میں کیا کہتے اور اسے ناخوبی کے کون سے درجے میں شمار کرتے۔

گو کہ ہماری موجودہ نوجوان نسل کو ناخوبی کا دوش نہیں دیا جا سکتا مگر بات دوش دینے سے زیادہ اصلاح کی ہے اور اصلاح کرنے والا کوئی ہے نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس نسل کو دکھانے کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی اپنا پیدا کردہ' پاکستان ساختہ رول ماڈل نہیں ہے کہ رہنمائی' اصلاح' بڑائی' معیار اور بیعت کے لئے جس کی طرف دیکھا جاسکے جس کی زندہ مثال دی جاسکے۔ جن کی طرف دیکھا جاتا ہے وہ ناامید کر دیتے ہیں، اور جن کی مثال دی جاتی ہے وہی

بے مثال نکلتے ہیں۔ جس طرف بھی دیکھو گہرا اندھیرا ہے اور جہاں غور سے دیکھو وہیں زیادہ ہے۔

جو سرزمین اپنے عہد کے رول ماڈل خود پیدا کرنے پر قادر نہ ہو وہاں یہ کمی سری دیوی' شیر پنجاب سردار شوکت علی' دلیر سنگھ' مائیکل جیکسن اور مونیکا لیونسکی پوری کر دیتے ہیں جس نسل کا آئیڈیل اس ساخت کا ہو جائے تو اس کی ناخوبی کو ناپنے کے لئے مزید کسی اور پیمانے کی ضرورت نہیں رہتی ہے لیکن اس ناخوبی کی ذمہ داری بہر حال 'بہرخوب پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جب معاشرے میں احترام سے دیکھے جانے والوں اور قیادت کرنے والوں کی ہی دیانت سوالیہ اور نیت مشکوک ہو تو بددیانتی اور بدنیتی خطرے کے سارے سرخ نشان پار کر کے اپنے سپل وے سے بہنے لگتی ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو جائے تو پھر اس بہاؤ کے آگے کوئی بند مشکل سے ہی باندھا جا سکتا ہے' جس طرف بھی دیکھو منصب اور مال' نام اور نمود' عہدہ اور بدعہدی' ابتلاء اور عروج' احترام اور دشنام' لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ جسٹس ہوں یا جرنیل' جج ہوں یا علماء' مفتی ہوں یا موذن' امین ہوں یا نجیب' نادہندہ ہوں یا منتخب نمائندہ' سرکاری عمال ہوں یا اعلیٰ حکام' سیاستدان ہوں یا صحافی کہیں نہ کہیں سرخ رو ہیں، کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہوتا ہے۔کوئی بہ حالت جھپٹا مار اور کچھ بصورت رنگے ہاتھوں، مگر ملوث سبھی ہیں۔

جس کو زرعی اراضی نہ مل سکی وہ پلاٹیوں میں شامل ہے' جس کو مل کا لائسنس نہ ملا اس نے ایجنسی پرمٹ پر ہاتھ صاف کر دیا' جو ثقافتی وفد سے رہ گیا وہ عمرہ گروہ میں کھپ گیا' جس کو حق نمائندگی دے کر اسمبلی میں بھیجا اسی نے چنبہ ہاؤس کی چادریں اور تولیئے غائب کر لیئے' جس کو قرضہ نہ دیا اسے روٹ پرمٹ دے دیا' جو عصمت دری کے کیس سے بچ نکلا وہ سمگلنگ میں

دھر لیا گیا' پلاٹ لاہور میں حاصل کیا بیچا کراچی میں' منصب منصفی' لاحقہ چیف جسٹس وچوں پورے اور گانٹھ کے پکے' دورۂ برائے تبلیغ امریکہ اور نامحرم عورتوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر مولانا وعظ بدست۔ اعزاز صدر مجلس شوریٰ پلاٹ ایک کروڑ کا ہتھیایا نوے ہزار میں' عہدہ ایڈمرل نیت پراپرٹی ڈیلر' کام ایئرمارشل کا نظریات زیر زمین' مولانا بذات خود جنت کا طوطا تخم بے تاثیر اغواء برائے تاوان میں سزا یافتہ' رتبے کے وائس چانسلر جوڑ توڑ چھپائی والوں سے' کارکن تحریک پاکستان مولانا مجرّد پیشہ مخبری معاوضہ دس لاکھ نقد و یکمشت' سپہ سالار اسلامی افواج ملی بھگت صرف چودہ کروڑ روپے' والد صاحب قائد از سرنو انتخابات بیٹا مولانا ڈیزل' گھریلو تربیت مذہبی پیشہ جھوٹی گواہی' منہ پر لا الہ الا اللہ اندر اندر اور مال لگا اور سربراہ مملکت وضع قطع شرعی و شریفانہ اور خاتمہ بنیاد پرستی کی یقین دہانیاں اور امریکی سفیر کے ترلے۔

لوٹ مار اور نفسا نفسی کے اس گھمسان میں نہ منصب کا احترام رہا نہ منصب دار کا لحاظ۔ بے توقیروں نے ہر دو پہ کالک پھیر دی' ہمارے رول ماڈل' اعلیٰ حکام و اشرافیہ بدعنوانی کی علامت اور بددیانتی کے حوالے سے سوا اور کسی کام نہ آسکے۔ بدبختوں کی ایسی افراط لگی ہوئی ہے کہ سربراہ حکومت سے نائب پٹواری تک کسی پر بھی کوئی الزام لگا دیجئے' کلک کر کے فٹ بیٹھ جائے گا' ایسی موجیں لگی ہوئی ہیں کہ بند آنکھوں سے بھی ڈاکو پکڑے جا سکتے ہیں۔ ایسا اندھیرا پھیلا ہوا ہے کہ سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

جب ہماری حکومتیں اور حکمران امریکی و یورپی حکومتوں اور یہودیوں کو اسلامی بنیاد پرستی کی بیخ کنی کا یقین دلاتے ہیں تو حقیقتاً وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ جناب مائی باپ آپ نہ فکر کریں اسلامی روک تھام کی' ہم جو ہیں' ہم انشاء اللہ نمک حلال رہیں گے اور حق ادا کر دیں گے' ہم موجودہ ڈھکوسلے کو

ہی اسلام کے نام پر چلاتے رہیں گے' اسی غیر شرعی' غیر منطقی اور غیر اسلامی صورت حال کو جاری رکھنے میں جان لڑا دیں گے۔

ہمارے یہاں جو ہاتھ جمہوریت سے کیا گیا ہے اسی سلوک کا اگلا ٹارگٹ اسلام ہو گا۔ جو طبقہ اس ڈھکوسلے کو اسلام ماننے سے انکاری ہے اسے بنیاد پرست کا نام دے کر اس کے خلاف محاذ کھولے جا رہے ہیں منصوبہ یہ ہے کہ جس طرح موجودہ جمہوریت سے سب خوش ہیں اور بات بنی ہوئی ہے (آئی چلائی' دھاندلی اور چوری چکاری کے زور پر جو بات بنی ہوئی ہے عین ممکن ہے کہ اس میں آقا کا کرم اس قدر نہ ہو جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے) اگر اسی طرح کا اسلام بھی متعارف کرا دیا جائے۔ لچکیلا' من موہنا' بے ضرر اور سب کے کام آنے والا تو بات بن جائے' کام چل جائے سب کے سب دائرہ اسلام میں بھی رہیں اور مسائل بھی حل ہو جائیں۔

اسی طرح کے اسلام کے بارے میں سوچا جا رہا ہے کہ جیسا کہ جنرل صاحب چاہتے تھے' جنرل ضیاء الحق برانڈ کو ہی اسلامی نظام کا نام دے دیا جائے۔ موجودہ عین جمہوریت کی طرح عین اسلام بھی نافذ کر دیا جائے کہ جس میں سود کا کام بھی جاری رہے اور بانگیں بھی دی جاتی رہیں۔ سمگلنگ کے ہر پھیرے پر ختم شریف کی شیرینی بھی بٹتی رہے' شریعت بھی چلتی رہے اور خرد برد بھی لگی رہے، کمیشن اور رشوت پر زکوٰۃ نافذ کر کے اسلام کا بول بالا اور زکوٰۃ ٹیکس کی بنیاد وسیع کر دی جائے۔ لوٹ کھسوٹ، بدکاری، رشوت' بدعنوانی' سرقہ اور دوسری معاشرتی برائیوں کو عین اسلام کے تابع کر دیا جائے۔ ڈھکے چھپے' اندر خانہ' بلا تنقید' اوہلے اوہلے' سب خوش' سارے خوش حال اور سب کچھ اسلامی چھتری کے نیچے نیچے۔

جن لوگوں کو بنیاد پرستی موت کا گولہ نظر آتی ہے وہ اسلام کی اصل سے

لرزاں ہیں اور مصری قحبہ خانوں' مراکشی بیسواؤں اور دمشق کے رنڈی خانوں والا اسلام چاہتے ہیں کہ اذان بھی ہوتی رہے اور کیبرے بھی' ایک ہاتھ میں اللہ کی رسی اور دوسرے میں جام' ذرا دیر کو رکے' سجدہ کیا اور پھر ناچنے والیوں کی بلائیں لینے لگے۔ طواف بیت اللہ کا نظریں حجراسود پر ہاتھ احرام کی ڈب میں سچے موتیوں کی لڑیوں پر' جو گروہ ان قحبہ خانوں اور رنڈی گھروں کو بند کرنے کا کہتا ہے کہ اس غیر شرعی فعل کو ختم کیا جائے اس رقص اور رنگینی کو روکو اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ انہیں ہی بنیاد پرستوں کا نام دے دیا گیا ہے۔

ہمارے صدر صاحب اپنے بارے میں اس طرح کا تاثر دیتے ہیں کہ میری شرعی وضع قطع پر مت جاؤ بلکہ میرے ارادوں پر دھیان رکھو۔ اسلام کی اصل پھیلانے والوں کے خلاف میں بھی تمہارے ساتھ ہوں تمہارا ہی آدمی ہوں' مجھ پر اعتبار کرو۔ میں بھی بنیاد پرستوں کو سولی چڑھانے میں دریغ نہیں کروں گا بلکہ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔ کسے اس بات کا انتہائی قلق نہیں ہوا ہو گا کہ صدر محترم نے صدارت کا حلف اٹھاتے ہی جو پہلا کام کیا وہ امریکی' یورپی اور یہودی حکومتوں کو اسی امر کی یقین دہانی تھی۔

نہ تو کوئی یہودی بنیاد پرستی کی بات کرتا ہے نہ عیسائیت پرستی کے خلاف ہے سوائے اسلامی بنیاد پرستی کے ہر طرح کی پرستی چل رہی ہے' گوارا ہے' حالانکہ ڈر تو یہ پڑا ہوا ہے کہ اسلام کو بڑھنے سے تو روکا نہیں جا سکا (اب امریکہ میں بھی یہودی اور مسلمان برابر تعداد میں ہو چکے ہیں) لیکن اس کی اصل اور اثر کو تو کم کیا جا سکتا ہے درمیانے خاں ٹائپ کے بابو نما لوگ جو ترقی پسندی' ماڈریٹ ازم' فیشن' تنقید کی جھونک اور آزادانہ مخلوط میل جول پر پابندی کے ڈر سے بنیاد پرستی کے خلاف نعرہ زن ہیں عین ممکن ہے کہ وہ

اپنی بے دھیانی، جھونک، لاعلمی اور دو رخی کے ہاتوں اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہوں اور ان کے ہاتوں میں کھلونا بنے ہوئے ہوں۔

اگر دوسرے مذاہب کی بنیاد پرستی گوارا ہے تو آخر اسلامی بنیاد پرستی کیوں نہیں؟ اسلام کو پورے کا پورا اور اصلی حالت میں نافذ کر دینے میں ہرج ہی کیا ہے؟ اسلام کے سو فیصد نفاذ کے بارے میں ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ امریکہ ناراض ہو جائے گا یا یہودی اکھڑ جائیں گے، جو ناراض اور ناخوش ہوتا ہے اسے ہو جانے دیجیئے مگر اسلام کو پورے کا پورا ہی نافذ ہونا چاہیئے۔

اسلام سے چھیڑ خانی والی موجودہ صورت حال بڑی ہی مضحکہ خیز ہے اذان کا استعمال ٹی وی کی آواز کم کر دینے اور بیبیوں کا دوپٹہ سر پر کر لینے تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ اذان موسیقی کی آواز اور ناچ گانے کا شور کم کرنے کا سائرن نہیں ہے۔ اذان سے وہی کام لینا مناسب ہے جس کا حکم ہے اور اس حکم کی یاد دہانی کرانے والے اور اس کی تعمیل پر اصرار کرنے والوں کو بنیاد پرست کہہ کر قابل گردن زدنی قرار دینا اور ان کے قتل کے منصوبے باندھنا بڑی ہی ناروا بات ہے۔ اسلام پسندوں کا اسلام نفاذیوں سے یہ روّیہ سراسر غیروں والا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ ہماری زمین قحط زدہ سے زیادہ قہر زدہ ہو چکی ہے۔ قحط کمیابی کا حوالہ ہے مگر ناپیدگی کا نہیں، قحط شدید بھی ہو تو امکان بہرحال رہتا ہے۔ ہماری صورت حال قہر زدگی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور قہر کا ایسا طویل دورانیہ روگردانی سے جنم لیتا ہے اور روگردانی کی اجازت نہیں ہے اس بارے میں کھلی نشانی اور واضح حکم موجود ہے۔ سورۃ محمد میں ارشاد ربانی ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ○

اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر

دے گا پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے○

ایک راہ گم کردہ نسل منزل کی کھوج اور اپنی شناخت میں سرگرداں ہے کہ کس کی طرف دیکھے اور کدھر کو جائے' منزل نہ سہی کم از کم راستہ تو ملے مگر ہر راستے پر کوئی نہ کوئی بہروپیا' کوئی بازی گر' کوئی نقب زن مسلط ہے۔

کوفے کی حدود سے دور نکل جانے کی کوشش میں ساری رات چلتے ہیں صبح کو پتہ چلتا ہے کہ کوفہ پہلے سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ایک راہزن ہماری قیمت وصول کر کے دوسرے کے حوالے کر جاتا ہے اور دوسرا وہیں سے ہمیں چلانا شروع کرتا ہے جہاں سے پہلے والے نے سفر کا آغاز کیا تھا یوں ہماری محنت' امید' وقت اور صعوبت ضائع ہوتی جاتی ہے کہ ابھی تک تو سفر کی سمت اور راستے کا تعین بھی نہیں ہوا۔ ہم چونکہ اسلام کی آڑ میں اور قصداً" روگردان بنے ہوئے ہیں سو دوسرے روگردان معاشروں کی نسبت ہمارے لئے روگردانی کی رسی اس قدر طویل نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ بات کسی نہ کسی طرح بنی رہے چونکہ سب جانتے ہیں کہ بات کس طرح بنی ہوئی ہے۔

وقت ہم ضائع کر چکے ہیں اور اب بات وقت کی نہیں' مہلت کی ہے یوں بھی وقت کا ہونا مہلت کی ضمانت نہیں ہوتا ہے۔ مٹھ بھر رسی اور بے مہلت ساعت جو میسر ہے آخر اسے کتنا اور کب تک کھینچا جا سکے گا' کب تک کھینچیں گے؟ اللہ تعالیٰ کو پانی چڑھانے' کن فیکون کہنے اور دوسری قومیں پیدا کر دینے میں کبھی دیر لگی نہ تامل ہوا۔

اکیسویں صدی۔۔۔ ہمارا گھگو گھوڑا

یہ مشہور عالم ایڈلر رصد گاہ ہے۔ یہیں پر ڈیر بورن ٹیلی سکوپ نصب ہے' جس سے سیاروں' ستاروں اور خلائی تغیرپذیری کا مسلسل مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ مشہور اسٹرانومسٹ سکالر ایڈون ہبل نے اسی رصد گاہ میں اپنے مشاہدات مرتب کئے اور آئن سٹائن کو اپنے اس نظریے کا قائل کیا کہ خلاء اور کائنات مسلسل پھیل رہی ہے لیکن پھیلاؤ کا یہ اصول سیاروں پر منطبق نہیں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے آئن سٹائن اس نظریے کا شدید حامی تھا کہ کائنات تغیرپذیر نہیں بلکہ جامد ہے۔

اسی رصد گاہ میں علوم فلکیات کی بیش بہا لائبریری بھی موجود ہے' جہاں مشہور مسلمان ماہر فلکیات الرازی اور نصیرالدین طوسی سے لے کر شکاگو یونیورسٹی کے نوبل انعام یافتہ اسٹرانومر ڈاکٹر چندر شیکھر تک کا علمی مواد اور حوالہ موجود ہے۔ دنیا بھر کے کونے کونے سے اسٹرانومر' سائنسدان' محققین اور ماہرین اپنے اپنے نظریوں کی جانچ پڑتال اور چھان پھٹک کے لئے اسی رصد گاہ اور اسی لائبریری کا رخ کرتے ہیں۔

آج ایڈلر آڈیٹوریم میں ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ کانفرنس میں ناسا کے سائنسدان' ایڈلر کے ریسرچر' برطانیہ کی مشہور مارس جیالوجسٹ ڈیانا چلیس' ہارورڈ یونیورسٹی کے ٹیکسٹ ڈیزائنر اور شگاگو بورڈ آف ایجوکیشن کے افراد شامل ہیں' شگاگو بورڈ آف ایجوکیشن کے ارکان میں' میں بھی شامل ہوں۔

اکیسویں صدی میں ناسا کے پروگرام کے مطابق سن 2030 میں مارس کے سیارے پر انسانی آباد کاری کے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز سن 2018 سے کیا جائے گا۔ ایڈلر رصد گاہ نے ناسا کی وساطت سے فیصلہ کیا ہے کہ اکیسویں صدی کو مارس کی صدی کا نام دیا جائے اور اسے MARS MILLENNIUM کے نام سے منسوب کر دیا ہے کہ اسی صدی میں یہ محیرالعقل کارنامہ انجام دیا جائے گا کہ مارس کے سیارے پر پہلی انسانی کالونی وجود میں آئے گی۔ اس منصوبے میں مشکلات وناممکنات اپنی جگہ مگر عزم' یقین' تحقیق اور منصوبہ بندی اپنی جگہ۔

لگتا ہے کہ قرآن میں دی گئی بشارت کی تکمیل کا وقت قریب تر آگیا ہے اور انسان اب اس قابل اور اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ زمین کے کناروں سے نکلے اور مزید کائناتیں اور نئی دنیائیں تسخیر کر سکے۔

ناسا کے سائنسدان ڈاکٹر لیمارز مجوزہ مارس کالونی کی تفصیلات بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک بہت ہی مہنگا پراجیکٹ ہے۔ اس میں بڑی مشکلات درپیش ہیں۔ صرف ایک پونڈ وزن کو مارس تک پہنچانے میں پچاس ہزار امریکی ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں۔ ایک فرد کو مارس پر پہنچانے کا خرچ چالیس ملین ڈالر ہو گا' تابکاری اور دباؤ کی مدافعت والا سوٹ پانچ ملین ڈالر میں تیار ہو گا اور فنی طور پر غلطی کی گنجائش اعشاریہ صفر صفر بھی نہیں ہو گی۔

ڈاکٹر لیمارز مارس پر آبادکاری کے بارے میں حیران کر دینے والی معلومات

دیتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر زمین کے علاوہ کسی اور سیارے پر انسانی آباد کاری ممکن ہے تو وہ مارس ہی ہے۔ جہاں پر انسانی حیات کے تسلسل کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ زمین اور مارس پر پائی جانے والی جغرافیائی خصوصیات میں کئی عنصر مماثل ہیں۔

مارس کی سطح پر پائے جانے والا پانچ ہزار کلومیٹر لمبا غار نما گڑھا جس کی اطراف 30 کلو میٹر تک بلند ہیں ایک قدرتی بڑے ہال کمرے کی طرح ہے کہ جس کی چھت نہیں ہے۔ اگر پلاسٹک اور موٹے گلاس سے اس گڑھے کو ڈھانپ دیا جائے تو نہ صرف تابکاری کے اثرات سے محفوظ رہا جا سکے گا بلکہ اسی CONTROLLED ENVIRONMENT میں مارس میٹروپولیٹن بھی آباد ہو سکے گا۔ سورج سے حاصل کردہ توانائی اسی چھت کے ذریعے سولر انرجی میں تبدیل کی جا سکے گی، جس سے نہ صرف اس میٹرو پولیٹن کو گرم رکھا جائے گا بلکہ مزید مختلف کام بھی انجام دیئے جا سکیں گے۔

مارس کو سورج کے گرد اپنے مدار میں ایک گردش پوری کرنے کے لئے 669 دن درکار ہیں لہٰذا مارس پر طویل سال کی نسبت سے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

مارس پر پانی کی فراہمی کے بارے میں وہ کہنے لگے کہ مارس کے قطب شمالی اور قطب جنوبی پر زیر سطح منجمد پانی کے گہرے ذخائر کا اندازہ لگایا گیا ہے یہ ذخائر اس قدر بڑے ہیں کہ اگر یہ برف پگھل جائے تو مارس کا پورا سیارہ سو میٹر گہرے پانی کی جھیل میں تبدیل ہو جائے۔ آباد کاری کے لئے برف کی مطلوبہ مقدار کو پگھلا کر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ مجوزہ میٹروپولیٹن کے بیچوں بیچ ایک مصنوعی دریا بہایا جائے گا، جس کا پانی خود کار سولر ریفلیکٹرز سے گرم ہوا کرے گا اور اسی گرم پانی کے دریا سے منجمد علاقے کو گرم رکھا جایا کرے

گا۔

سپیس کرافٹ کی موجودہ رفتار کے حساب سے زمین سے مارس تک کے یک طرفہ سفر میں 240 دن لگیں گے' انیسویں صدی کے وسط میں نیویارک سے ٹیکساس تک کا ریل گاڑی کا سفر بھی 6 دنوں میں ہوتا تھا' اندازہ لگایا گیا ہے کہ سن 2033 تک 240 دن کے اس یکطرفہ سفر کی مدت کم ہو کر 82 روز بلکہ اس سے بھی کم رہ جائے گی۔

سائنسی نوعیت کی وضاحت سے یکایک ڈاکٹر لیمارز کا لہجہ مخصوص امریکی کمرشل ازم میں تبدیل ہو گیا۔ مارس پر آباد کاری کے ہوشربا اخراجات کے ضمن میں وہ کہنے لگے کہ شروع میں یہ سب کچھ مہنگا ہو گا مگر جونہی آباد کاری کا عمل شروع ہو گا' تو یہ منصوبہ اپنے اخراجات نہ صرف خود برداشت کرنے کے قابل ہو سکے گا بلکہ اضافی سرمائے کی صورت نکل آئے گی۔ مارس کی 40 ملین مربع کلومیٹر زمین کو اگر 5 ہزار ڈالر فی ایکڑ کے حساب سے بھی بیچا جائے تو مارس کی زمینی مالیت دو لاکھ بلین ڈالر کے لگ بھگ بنتی ہے۔ زمین سے 78 ملین کلومیٹر دور ہونے کی وجہ سے آج جس زمین کی مالیت صفر ہے' کل کو دوری کی یہی صفت زمین کی مالیت کا جواز بن جائے گی۔ مارس ٹریفک کی شرح کے ساتھ ساتھ مسابقہ بھی بڑھے گا۔ سن 2050 تک چالیس ملین ڈالر کرائے کی شرح کم ہو کر چار لاکھ کی سطح تک آجائے گی' دباؤ برداشت کرنے والا سوٹ کپڑوں کے عام سٹورز سے پانچ چھ ہزار ڈالر میں مل جایا کرے گا۔

سن 2030 میں جو لوگ مارس پر بھیجے جائیں گے وہ آج پرائمری سکولوں میں ہیں۔ لہٰذا سکولوں کی سطح پر مارس پر آباد کاری کی تعلیم کو عام کیا جائے' ناسا کے اس مجوزہ پروگرام کو نصابی مضمون کی طرح پڑھایا جائے۔ بچوں کو مارس اور نئی کالونی اور نئی آباد کاری کے مسائل سے روشناس کرا دیا جائے۔

اس سے ولولہ' شوق اور جاننے کی لگن پیدا ہو گی' نئے نئے نظریے سامنے آئیں گے۔ تحقیق میں اضافہ ہو گا۔

مسائل اور مسائل کا حل کرنے والے دونوں سامنے آجائیں گے۔ اس کانفرس کی غرض وغایت یہ ہے کہ سکولوں میں مارس کا یہ پروگرام پڑھانے کے لئے ایک ایسا عام فہم نصاب تیار کیا جائے' جس میں سائنسی و فنی باریکیوں سے قطع نظر مارس پر آباد کاری کے ایسے پہلو کو ابھارا جائے' جس سے اڈونچر' ولولہ خیزی' ان دیکھی دنیا کے سفر کا شوق' عزم' اور مارس پر آباد کاری کے ممکن العمل ہونے کا تاثر نمایاں ہو' آسان لگے اور شوق بڑھے۔

ڈاکٹر لیمارز کی بات قریب پندرہ منٹ جاری رہی اس کے بعد ایڈلر رصدگاہ کے صدر تشریف لائے انہوں نے بات کو مزید مختصر کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ خواتین وحضرات! ہم جس کام کو انجام دینے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ شکاگو بورڈ آف ایجوکیشن کو ذمہ داری تفویض کر دی گئی ہے کہ وہ اس نصاب کو لکھنے کا کام انجام دے۔ بورڈ کی ٹیکسٹ رائٹنگ ٹیم' جسے یہ کام کرنا ہے' ہم ان سے ہر ممکن تعاون کریں گے۔ ڈالروں کے علاوہ جو کچھ بھی ہمارے وسائل ہیں' وہ ان کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے قدرے افسردگی کے لہجے میں کہا کہ ہم جس قدر اہم پروگرام کی تکمیل کے لئے یہاں جمع ہیں' اسی قدر فنڈز کی کمی کا سامنا ہے۔ کل کے اجلاس میں فنڈز کی فراہمی پر غور کیا جائے گا اور آج کا اجلاس اب ختم ہو گیا ہے۔

یوں کانفرنس کا پہلا دن اختتام کو پہنچا۔ نہ لنچ' نہ عشائیہ' نہ چائے' نہ پانی' نہ تصویریں' نہ تقریریں' نہ مبارکبادیں' نہ استقبالیہ' نہ سپاس نامے' نہ جوابی حملے' نہ جملے بازی' نہ سوال اور نہ جواب۔

اگلے دن کا آغاز وہیں سے ہوا' جہاں کل اختتام ہوا تھا۔ صدر صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ شکاگو کے میئر کی جانب سے ایک لاکھ ڈالر اور ناسا نے دو لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا ہے۔ مزید ادارے بھی عطیات فراہم کرنے پر رضامند ہیں۔ لہٰذا اس قدر لاچارگی نہیں رہی ہے کہ جتنی کل تھی۔ سو میں مزید تاخیر کے بغیر کام کا آغاز کرنے کے لئے کانفرنس کے خاتمے کا اعلان کرتا ہوں۔ جانے سے پہلے ایک آخری بات یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت' ہمارے پیش نظر اس نصب العین سے کم کچھ اور ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اکیسویں صدی ہمارے لئے مارس کی تسخیر اوز آباد کاری کی صدی ہے۔ لہٰذا وہ سارے ابتدائی کام ختم کر لینے ہوں گے' جن کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

یوں ہم آڈیٹوریم سے ملحقہ کمرے میں مارس ملینیم پر نصاب لکھنے بیٹھ گئے مگر اکیسیوں صدی کے حوالے سے میرا دھیان یکایک ان سبز باغوں کی طرف چلا گیا جو ہمارے حکمران اور حکومتیں ہمیں اکیسوین صدی کے ناطے سے دکھاتی آ رہی ہیں۔

جی ٹی روڈ کا جو حصہ گوجر خان سے گزرتا ہے' آج یہاں ٹریفک معطل ہے' ڈھول' ڈھماکے' گولے' پٹاخے' دھول' مٹی اور آدمیوں سے اٹے ہوئے جی ٹی روڈ پر اس گہما گہمی کی وجہ ہماری وزیراعظم کے ہاتھوں حکومت کی سرپرستی میں قائم کئے جانے والے ایک کمپیوٹر سکول کا افتتاح ہے۔ وہ عوام کو للکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہمارے حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بہت کام کیا ہے۔ کئی جگہوں پر اسی طرح کے کمپیوٹر سکول کھولے جا رہے ہیں۔ اس طرح جب ہم یں صدی میں داخل ہوں گے تو ٹیکنالوجی میں خود کفیل اور سائنسی طور پر ترقی یافتہ قوم کے طور پر ہی داخل

ہوں گے۔

جس ادارے کے افتتاح پر ہم یک لخت ٹیکنالوجی میں خود کفیل ہونے والی قوم بننے والے ہیں' اس ادارے کا حال یہ ہے کہ کرایے کی ایک خستہ حال عمارت کے ایک سیلن زدہ ہال کمرے میں قریب بیس کمپیوٹر بڑی ترتیب اور قرینے سے میز پوشوں کے اوپر سجا دیئے گئے ہیں۔ یہ کمپیوٹر سرمایہ کاری کے ایک ادارے پکک اور نیشنل بنک آف پاکستان سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کمپیوٹر ایسے ہیں جو ان اداروں کے کام کے نہیں رہے اور انہیں جھاڑ جھنکار اور تہ خانوں سے نکال کر' جھاڑ پونچھ کر اور جوڑ جاڑ کر ان میز پوشوں پر رکھ دیا گیا ہے۔

جن صاحب کو اس ادارے کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے وہ بنک آفیسر ہیں اور زکوٰۃ کٹوتی فنڈ سے جعلی کھاتوں میں رقم کی منتقلی کے الزام میں معطلی پر ہیں۔ ان کی معطلی کا بہترین مصرف اس ادارے کی سربراہی کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔؟ بددیانتوں کو تعلیم میں اور بدنیتوں کو ٹیکنالوجی میں کھپا دینے کی روایت ہمارے ہاں بہت پرانی ہے اور اس کا عین منطقی نتیجہ بھی سب کے سامنے ہے۔

یوں تو محترمہ بے نظیر بھٹو ہارورڈ یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں اور اچھی طرح جانتی ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت ہمارا کیا حال ہو گا اور ہم کس طرح سے بلکہ کس منہ سے اس صدی میں داخل ہو رہے ہیں؟ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفالت کا مضمون اور مطلب بھی وہ خوب سمجھتی ہیں' لیکن اس کمپیوٹر سکول کا فیتہ کاٹتے ہی یا تو وہ کسی خوش فہمی کا شکار ہو گئیں یا ان پر دروغ گوئی کا حملہ ہو گیا۔ ورنہ جس معیار کے فنی ادارے کا انہوں نے افتتاح فرمایا ہے، اس کے بغیر بھی اکیسویں صدی میں ہمارا داخلہ

اسی قدر خود کفیل اور معزز ہو گا' جتنا کہ اس ادارے کے ہونے سے ہو سکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی تعلیم یافتگی کے سارے ہنر کو سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے میں ضائع کر دیا ہے۔ پاکستان سے ان کا رویہ ان کے اقتدار سے مشروط ہے۔ اقتدار کی خاطر وہ پاکستان کو زک پہنچانے سے بھی گریز نہیں کریں گی۔ ان کا یہ رویہ موروثی اور جانا پہچانا ہے۔

دو دفعہ کی وزیراعظم نے اس ملک کے بارے میں اپنا رویہ اس سوکن کا سا بنا لیا ہے' جو لمحہ لمحہ' لفظ لفظ اور بات بات کی شکایت اپنے شوہر سے اس امید پر کرتی رہتی ہے کہ یہ بے چارہ کبھی نہ کبھی تو تنگ آکر پہلی والی کا حقہ پانی بند کرے گا ہی۔ محترمہ کو اقتدار ملنے والا ہو یا ان سے چھن جانے والا ہو وہ قائد حزب اختلاف ہوں یا قائد ایوان انہوں نے امریکہ سے پاکستان کی شکایتیں لگا لگا کر اور امریکی دخل اندازی کو دعوتیں دے دے کر ملک اور قوم کو بہت بے وقار کیا ہے۔

بلاول کو بخار ہو یا بخت آور کو چھینک آجائے' وہ انتخابات جیت جائیں یا ہار جائیں۔ اقتدار سے باہر ہوں یا اندر' شکایت وہ امریکی حکومت سے ضرور کریں گی حالانکہ وہ خوب جانتی ہیں کہ ان کا اقتدار میں ہونا یا نہ ہونا' ہمارے گھر کا اور ملک کا خالص اندرونی معاملہ ہے۔ اس کا تصفیہ اسمبلی' عدالت' آئین اور رائے شماری کی روشنی میں ہی ہونا چاہئے' نہ کہ امریکی حکومت کی سفارش اور دخل اندازی کی بنیاد پر۔ پہلی بار جب آٹھویں ترمیم کے آئینی اختیارات استعمال کرنے کے لئے غلام اسحاق خان کے ہاتھ کھجلانے اور سر' سرسرانے لگا اور محترمہ معزول ہو گئیں تو پہلے رد عمل کے طور پر ان کا رخ لیاقت باغ' موچی دروازہ' دھوبی گھاٹ اور کرکری گراؤنڈ کی بجائے' امریکی سفیر کی رہائش گاہ کی طرف ہی تھا حالانکہ انہیں اپنی حکومت کے بارے میں عوام

کی حکومت ہونے کا اسی قدر گمان ہوتا ہے' جتنا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو یہ زعم لاحق تھا۔

یوں تو امریکی حکومت کے دست شفقت کی طلب ہمارے ہر ایک حکمران کو رہی ہے مگر محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے سر پر امریکی حکومت کا ہاتھ پھروانے کی خاطر پوری قوم کا سر' سرنگوں کر رکھا ہے۔ حقیقتاً" ہمیں اپنے معاملات میں امریکی مداخلت کی شکایت کرنی ہی نہیں چاہئے کہ امریکی مداخلت بذات خود اس قدر نہیں ہے' جتنی کہ مدعو کی جاتی ہے۔ سوڈان' کیوبا' الجزائر' ایران اور لیبیا کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر امریکی مداخلت کیوں نہ ہو کہ جب ہمارے حکمران وحکام امریکی وزارت خارجہ کے کلرکوں سے بھی جھک جھک کے اور سر خم کر کر کے ملیں' دو' دو دفعہ سلام کریں۔ انہیں دیکھ کر مسکرائیں اور مسکراتے ہی رہیں۔ تحفے دیں اور نذریں نیازیں' دوران مصافحہ ان کا ہاتھ دبائیں اور دیر تک تھامے رکھیں۔ دل اور دامن وا کر دیں اور سر تا پا خود سپرد ہو جائیں۔ انہیں پاکستان آنے کی دعوتیں دیں' سیر و تفریح اور قیام وطعام کے لالچ دیں' بال بچوں تک کے ٹکٹ آفر کریں' بچھ بچھ جائیں۔ شمالی اور مغربی علاقوں میں تفریحی مقامات کے البم پیش کریں کہ آؤ' ہمارے دوار آؤ تو سہی' انہیں رجھائیں' ان پر ڈورے ڈالیں کہ آکے دیکھو تو سہی' بس ایک بار آہی جاؤ نا۔

ملک اور قوم کی ایسی خوشامدانہ اور بے توقیر نمائندگی سے امریکی حکام کب تک دامن بچا سکتے ہیں اور امریکی مداخلت اور دخل اندازی آخر کب تک نہیں ہو گی اور کیوں نہیں ہو گی اور کیوں نہیں ہونی چاہئے؟

ملک کے اندورنی معاملات میں امریکی دخل اندازی کو دعوت دینے کی جو بدعت خان عبدالولی خان کے امریکی حکام کے نام خط سے 1970 سے شروع

ہوئی تھی' محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس برائی کو اپنے کلائمکس پر پہنچا دیا۔ وہ اپنی حکومت بنانے اور بچانے کے شوق میں ریاست کے وقار کو داؤ پہ لگانے کی بارہا مرتکب ہو چکی ہیں۔

احتساب بیورو میں ان کے خلاف جو سچے' جھوٹے بدعنوانی کے مقدمات چلتے رہتے ہیں اگر ان سب کی بجائے ان پر ایک مقدمہ غیر ملکی مداخلت مدعو کرنے اور ملک اور قوم کے وقار پر بٹہ لگانے کا کر دیا جائے تو قوی امید ہے کہ وہ اس سے جانبر نہیں ہو سکیں گی لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اگر ہمارے آئین' قانون' ضبط اور ضابطے میں قومی وقار اور مملکت کی بے حرمتی کے خلاف بھی کوئی شق موجود ہو' اصولا" ایسا ہونا تو ضرور چاہیئے کہ جو آئین ایک رسہ گیر' اٹھائی گیرے اور خائن منتخب نمائندے کو طرح طرح کے استحقاق عطا کرتا ہے' اسی آئین کو اپنی حرمت کے دفاع کا حق بھی ضرور ہونا چاہیئے۔

سفارتی محاذ پر آئے دن کی ہماری ناکامیوں کی جڑیں بہت گہری ہیں اس کی ان گنت وجوہات اور بے شمار گھپلے ہیں' لیکن قومی وقار سے بے گانگی اور ملک کی مٹی سے اخلاص میں کمی سب وجوہات پر حاوی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ ہندوستان کے وزیراعظم اپنے دورۂ امریکہ میں اپنے سفارتخانے کے پریس اتاشی کے گھر قیام کریں اور صدر امریکہ کے اس اصرار کو بھی خاطر میں نہ لائیں کہ وہ وہائٹ ہاؤس میں قیام کریں اور ہمارے وزیراعظم کے وفد میں شامل فوٹو گرافر کی نظر بھی سٹیٹ گیسٹ ہاؤس یا کم ازکم فائیو سٹار ہوٹل میں قیام پر لگی ہو تو امریکی خارجہ پالیسی سے یکساں نتائج اور توقعات کی امید' کم نظری اور کج فہمی تو ہو سکتی ہے مگر حقیقت اور انصاف نہیں۔

پاکستان دنیا بھر میں واحد ایسا ملک ہے کہ جس کے سیاستدانوں کی رحم کی درخواستیں' فریق مخالف کی زیادتیوں بھرے شکایت نامے' امریکی حکومت کے مفادات سے عہدوپیان کے تجدیدی اقرار نامے اور اپنی بے گناہی اور راست بازی کے حلفیہ مچلکے اور ضمانت نامے امریکی حکومت کے ایوانوں میں آئے روز وصول ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوا' نہ سننے میں آیا' نہ پڑھنے میں کہ کبھی اسرائیل' ہندوستان' ایران' جاپان یا لیبیا کی حکومتوں یا وہاں کے سیاستدانوں نے بھی کبھی اسی طرح کی عرض گزاری ہو کہ ہمیں اپنے ہی ہم وطنوں' اپنی ہی منتخب حکومت اور اپنے ہی لوگوں سے بچایا جائے۔ یہ انتہائی قبیح اور غیر فطری فعل ہمارے ہی سیاستدانوں کا وطیرہ اور چلن ہے

ہر جگہ مملکت کی حرمت اور قومی وقار اولیت رکھتا ہے اور ذاتی مفادات کہیں بعد میں آتے ہیں مگر ہمارے ہاں ذاتی مفادات کی خاطر ملک تقسیم کر دینے کی روایت موجود ہے' تو ایسے میں قومی وقار اور ہماری مٹی کی حرمت کا پاس ہو تو کیسے ہو؟ اس کا سوچ تو سوچے کون اور اس عہد کو نبھائے تو کون نبھائے؟ کیا یہ ہمارے موجودہ سیاستدان کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی طرح اسی ترکے کے علمبردار نہیں ہیں کہ جس ترکے میں ملک توڑنے' آئین توڑنے' ہماری معیشت کو قلاش کرنے اور ہمارا حلیہ بگاڑنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

حکمرانی کی روایتی رجائیت پسندی' اپنی جگہ' مگر دروغ گوئی' بلف اور عوام کو سبز باغ دکھانے' رائی جیسی کامیابی کو پہاڑ جیسی فتح میں بدل دینا اور عوام کو بیوقوف سمجھنے' بنانے اور رکھنے میں محترمہ کو کبھی تامل ہوا' نہ شرم آئی' نہ کسی جواب دہی کا خوف' نہ ضمیر پر کسی دباؤ کا شائبہ' نہ کہے کی لاج' نہ وعدے کا پاس، نہ عمل صالح، نہ اعمال اخلاص بھرے، نہ کسی دعویٰ کی ذمہ

داری اور نہ بیان وکلام میں صداقت۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اب ندامت، مذمت، مزاحمت، وضاحت اور عبرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ عوام ان کا قرض اتار چکے ہیں۔ انہوں نے ہی خود کو اہل ثابت نہیں کیا۔ کذاب اور بے عملے حکمرانوں سے اخلاص، عمل اور عقل دو ڑ دور ہی رہتی ہے۔

یہ ملتان کا نشتر ہسپتال ہے۔ یہاں دس بستروں کے ایک اضافی وارڈ کا افتتاح کرنے کے لئے ایک صوبائی وزیر تشریف لا رہے ہیں۔ چھڑکاؤ کیا جا چکا ہے، ہسپتال کے عملے، مریضوں اور ملاقاتیوں کو گھیر گھار کر سٹیج کے سامنے بٹھایا جا رہا ہے، سٹیج پر پانی کا گلاس اور گلدستہ رکھ دیئے گئے ہیں، جہاں وزیر صاحب نے کھڑے ہو کر تقریر کرنی ہے عین اس کے عقب میں بجلی کے دو پنکھے تیز آواز سے چل رہے ہیں، ہوا ایسی تیز ہے کہ میز پوش الٹ الٹ جاتا ہے کبھی گلاس گرتا ہے، کبھی گلدستہ۔

یکایک بھگدڑ سی مچی، قلفیوں، برف کے گولوں، خطائیوں، پیاز، خربوزوں اور رنگ برنگے شربت والی ریڑھیوں کے جھرمٹ میں سے وزیر صحت مند کی کار عین فیتہ کاٹنے والی جگہ کے سامنے لاکر روک دی گئی ہے، انہوں نے پلک جھپکنے میں فیتہ کاٹا اور مائیک پر لپکے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ملک بھر میں صحت کے مسائل حل کر دیئے ہیں، ہسپتال تعمیر کئے جا رہے ہیں اور انتہائی تیز رفتاری سے ایسے منصوبوں پر عمل شروع ہو چکا ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ملک بھر میں ہر شہری کو علاج معالجے کی بہترین سہولتیں حاصل ہوں گی۔

یہ وفاقی وزیر تعلیم ہیں گو کہ انہوں نے افتتاح تو اتنے نہیں کئے مگر پریس کانفرنسز بہت کیں۔ جسٹس رہ چکنے کے باوجود بھی الفاظ، اعداد وشمار اور لب

ولہجے پر قابو رکھنا انہیں مشکل ہو جاتا ہے حالانکہ جسٹس رہ چکنے کے ناطے سے انہیں تو مزید احتیاط کی ضرورت ہے کہ جب بھی باد مخالف چلی ہے' ہمارے ہاں کئی جسٹس صاحبان' جعلی تعلیمی ڈگریوں اور تاریخ پیدائش میں الٹ پھیر کے استرے سے شدید زخمی ہوئے ہیں۔

آج کی پریس کانفرنس میں وزیر تعلیم کا دعوی ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت پاکستان میں شرح خواندگی اسّی فیصد تک ہو چکی ہو گی۔ یعنی ناخواندہ خال خال رہ جائیں گے اور ڈھونڈنے پڑا کریں گے لیکن سچ یہ ہے کہ جس دن اکیسویں صدی کا پہلا سورج ہماری زمین پر طلوع ہو گا' اس روز ہماری شرح ناخواندگی ہمیشہ سے زیادہ ہو گی۔

یہ ایک صوبے کے وزیر اعلیٰ ہیں یہ لاہور کو لاہور نہیں رہنے دینا چاہتے بلکہ اسے پیرس بنا دینے پر بضد اور کمر بستہ ہیں۔ جب بھی آلودگی' کثافت' بارش اور گندے پانی کے تالاب' سڑکوں کے گڑھے' مکھی' مچھر' مٹی' دھول' گھٹا' دھوئیں اور تعفن سے لاہور میں سانس لینا مشکل اور چلنا دو بھر ہونے لگے تو یہ لاہور کو پیرس بنا دینے کا طنز کرتے ہیں لیکن تبدیلی کا یہ ناطہ اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی جڑا ہے۔ تان جیسی بھی ہو مگر ٹوٹتی یہیں ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے' اکیسویں صدی میں داخلے کے وقت' اکیسویں صدی کے آنے پر.......

موجودہ عشرے کے آغاز سے ہی ہمارے حکمران، وزیر، مشیر، نمائندے اور حکام اکیسویں صدی کے آنے کو بطور گھگو گھوڑا استعمال کر رہے ہیں۔ وہ عوام کے سامنے اکیسویں صدی کو جھنکنے کی طرح بجاتے رہے ہیں اور بدصوت راگ کی طرح الاپتے رہے ہیں۔

اب جبکہ اکیسویں صدی پچاس دن دور رہ گئی ہے تو دور دور بھی کہیں

ان وعدوں، دعوؤں اور یقین دہانیوں کی عشر عشیر تکمیل بھی نظر نہیں آتی ہے، جو اکیسویں صدی کے آنے سے وابستہ تھیں۔

دروغ گوئی' بلف اور خوش فہم قیافوں کی بات اور ہے مگر حقائق اور اصلیت یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کے سب سے گہرے پاتال اور گہری دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

نادہندگی اور ناخواندگی ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ افراط زر قابو سے بے قابو ہو چکا ہے۔ قرضوں کی بات نہ کیجئے اب تو قرضوں پر سود کی ادائیگی نے ہی معاشی شہ رگ کو دبوچ رکھا ہے۔ جتنے صنعتی یونٹ آج بند ہیں' کبھی بھی نہیں تھے۔ عوام جس قدر دل گرفتہ اور ناامید آج ہیں' خودکشی کی ہر روز کی خبریں اس طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ پیداوار' برآمدات' غیر ملکی سرمایہ کار و زرمبادلہ کے ذخائر خطرے کی ساری حدود سے بھی نیچے ہیں۔ جتنے افراد آج بے روز گار ہیں' پہلے کبھی نہیں تھے' جتنے بچوں پر آج سکولوں کے دروازے بند ہیں' اس سے پہلے سکولوں کا ایسا قحط نہیں تھا۔

ایک ویگن سے دو ویگنوں کی سواریاں برآمد ہو رہی ہیں۔ بسوں میں جتنے اندر اتنے ہی چھت پر اور چاروں طرف چمٹے ہوئے ہمیشہ سے سوا۔ قومی سلامتی اور داخلی استحکام آج جس قدر حساس ہے پہلے اس سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔

سکولوں کے معصوم بچے اور ذبح کئے جانے والے جانور بس کی چھت پر' جیب تراش' پولیس اہلکار اور نوجوان بس کے اندر' لاچارگی اور بے حسی کے یہ منظر پہلے یوں بر سرعام نہیں تھے۔

صحت عامہ کے مسائل ہمیشہ سے گھمبیر ہیں۔ اکیسویں صدی بھی پہلے اس قدر قریب نہیں تھی اور کسی دوسری حکومت کا مینڈیٹ بھی اس قدر

بھاری نہیں تھا' میاں صاحب کے پاس بھاری مینڈیٹ کا مان نبھانے کا یہ آخری موقع لگتا ہے' شاید یہی وجہ ہو کہ ان کے ذاتی اور خاندانی اثاثے غیر ملکوں میں پھیلتے جا رہے ہیں اور ان کے رویے سے بے رحمانہ لوٹ مار ظاہر ہونے لگی ہے۔

بوجھو تو جانیں

ہمارے ہاں معاشرتی برائیوں کو پروان چڑھانے میں اگر صحافت نے سب سے بڑا کردار ادا نہیں کیا تو کم ازکم بہت بڑا کردار ضرور ادا کیا ہے۔ صحافت سے قوم کی فکری رہنمائی کی جو عمومی توقع ہر معاشرہ میں مروج ہے ہمارے ہاں اس کے بالکل الٹ ہے یعنی قوم کی فکری رہنمائی کو صحافت سے محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تو جب پورا معاشرہ ہی رو بہ تنزل ہو تو زندگی کے ہر شعبے اور رگ وریشے میں کوڑھ سرایت کر جاتا ہے مگر قیمے کے سموسوں' چاٹ مصالحے اور کوکونٹ کریم پیسٹری پر بکنے والوں کی نسبتاً کچھ زیادہ ہی بڑی تعداد صحافت سے وابستہ ہو گئی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہماری زمین سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سونا اور یورینیم نکالنے کی نسبت ایک غیر جانبدار اور اپنے لفظوں میں' دھڑے' کے بغیر کسی صحافی کو ڈھونڈ نکالنا زیادہ مشکل ہے حالانکہ جانبداری اور دھڑے بندی صحافت کی صریحاً موت ہے جو ہمارے ہاں یقیناً کبھی کی واقع ہو چکی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔

مرداروں کو تو بذات خود رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں کب'

کہاں اور کیسے دفنایا جائے گا۔ مردار خواہ صحافت کا ہی کیوں نہ ہو کسی بھی فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہے۔

سو جب فکری رہنمائی کے سوتے سے ہی فکر اور رہنمائی کی بجائے بوسیدہ لاشے والا تعفن پھوٹتا ہو تو فکری رہنمائی کا موجودہ معیار ہی میسر آسکتا تھا جو کہ نہ صرف میسر بھی ہے بلکہ راس بھی آگیا ہے۔

چوروں کا چوروں کو تحفظ دینے کی روایت کو جس قدر صحافت نے نبھایا اور پروان چڑھایا اس قدر ساتھ تو ڈاکوؤں نے ڈاکوؤں کا بھی نہیں دیا ہو گا۔ اخبار چاہے کوئی سا بھی پھرول لیجئے سب سے زیادہ یقینی تاثر یہی ابھرتا ہے کہ چوروں اور بدعنوانوں کے سب سے بڑے پشت پناہ صحافت کے ادارے میں ہی چھپے بیٹھے ہیں ان پشت پناہوں میں کچھ اعلانیہ ہیں' کچھ خفیہ ہیں' کچھ کچھ بالکل خفیہ ہیں اور کوئی کوئی خفیہ کے بھی ہیں کیا یہ سچ نہیں ہے کہ روزانہ اس طرح کی خبریں اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں کہ:

- اغوا برائے تاوان کی فلانی واردات میں ایک ایم این اے کا ہاتھ بھی ہے۔
- کراچی ائرپورٹ پر پکڑی جانے والی منشیات کی سمگلنگ میں جرنیل' اعلیٰ حکومتی عہدیدار اور ایک مشہور سیاستدان شامل ہیں۔
- پلاٹوں کی ناجائز الاٹمنٹ میں دو سابق وزراء اعلیٰ سرفہرست ہیں
- غیر ملکی تعلیمی وظائف ایک وفاقی سیکریٹری نے اپنے ہی دوستوں اور خاندان کے بچوں میں بانٹ دیئے۔

- پیرس ایئر پورٹ پر ایک پاکستانی سفارتکار کے سامان سے ہیروئن برآمد کرلی گئی۔
- پڑوسی ملک کو آٹے کی سمگلنگ کرتے ہوئے ایم پی اے رنگے ہاتھوں دھر لئے گئے۔
- بڑی مچھلیوں کی فہرست میں سندھ کے بارسوخ وڈیرے بھی شامل ہیں۔
- اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں منعقد ہونے والے خفیہ مجرے میں ایک مشہور سیاستدان کی صاحبزادی نے مجرالوٹ لیا۔
- مانٹریال بھیجے جانے والے پاکستانی ڈپلومیٹک بیگج سے چرس کی برآمدگی۔
- ایک وفاقی وزیر کے زیر انتظام چلنے والے عقوبت خانے سے ایک یرغمالی کا فرار اور انکشافات۔
- آبرو ریزی کے فلاں واقعے میں علاقے کا امام مسجد' ایم پی اے تھانیدار اور زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین چاروں شامل ہیں۔
- سیاسی وڈیروں کی نجی جیلوں کا انکشاف۔
- ایک مشہور سیاستدان کے بریف کیس سے کروڑوں روپے کی برآمدگی جنہیں وہ ہارس ٹریڈنگ میں استعمال کرنے جا رہے تھے۔
- ایک مشہور گانے والی کی گورنمنٹ ہاؤس مری میں خفیہ اور قابل اعتراض آمدورفت۔

یہ خبریں جو ہم روزانہ پڑھتے رہتے ہیں ان میں اچھنبے کی بات یہ نہیں ہے کہ وفاقی سیکریٹری، وزراء، جرنیل، سفارتکار، امام مسجد، مجرے کرنے والیاں

یا زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین اس قدر سنگین جرائم میں ملوث ہیں، جرائم ہر معاشرے میں ہوتے ہیں اور بلا لحاظ منصب کسی سے بھی سرزد ہوسکتے ہیں لیکن حیران کر دینے والی بات اس طرح کی خبروں میں یہ ہوتی ہے کہ مذکورہ خبر کو ایک بار پڑھیئے چاہے بار بار' پوری خبر میں مجرم کا نام نظر نہیں آتا نہ ہی براہ راست مجرم کی نامزدگی کی جاتی ہے۔ مجرم کی شناخت کو عوام کی بصیرت تجربے اور قیافہ شناسی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ بوجھو تو جانیں۔ سنگین جرائم میں ملوث لوگوں سے اس قدر مربیانہ رویہ ہماری ہی صحافت کا حصہ اور طرہ امتیاز ہے اور اس کی وجہ سودے بازی اور مک مکا کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کے اس ذہنی آزمائش کے پروگرام کو بند کیا جائے۔

مندرجہ بالا خبروں میں قباحت یہ ہے کہ یہ جاننے کی شدید خواہش کے باوجود بھی کہ وہ ایم این اے اور جرنیل' وفاقی وزراء اور وڈیرے' سفارتکار اور سیکریٹری کون ہیں۔ ان بددیانت' خائن' راشی' سمگلروں اور لیٹروں کے نام کیا ہیں۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ جرم کس شخص سے سرزد ہوئے اور بات آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب مصدقہ اور باوثوق ذرائع سے اس طرح کی خبریں اخباروں کے دفتر تک پہنچتی ہیں تو کیا ان میں مجرموں کے نام موجود نہیں ہوتے یا کسی مصلحت کے تحت اشاعتی مرحلے پر یہ نام قصداً حذف کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر بنیادی خبر میں کسی کا نام لیئے بغیر اس طرح کے الزام عائد کئے گئے ہیں تو اس طرح کی خبر کو شائع کرنا جو کہ نام کے بناء ادھوری اور غیر معتبر ہے' پیشہ ورانہ اور ذمہ دارانہ صحافت نہیں ہے اور اگر خبر میں مجرم کا نام موجود تھا اور اسے قصداً حذف کر دیا گیا ہے تو یہ نہ صرف زیادہ غیر پیشہ ورانہ عمل ہے بلکہ یہ مجرموں کو تحفظ دینے اور ان کے جرم میں شریک ہونے کے

مترادف ہے۔ اس طرح کی خبروں کو بغیر نام کے شائع کرنا' خبر کی اہمیت اور جرم کی شدت کو کم کرنے کے برابر ہے۔ ہمارا تو المیہ ہی یہ ہے کہ مجرموں کو تحفظ دینے کے لئے حکومت' پولیس' انٹی کرپشن کا محکمہ' انتظامیہ' منتخب نمائندے اور جانے کون کون سے ادارے اور افراد سرگرم عمل رہتے ہیں' صحافت کو اپنا دامن اس آلودگی سے بچائے رکھنا چاہیئے تھا۔

عوام کو اس اذیت اور ذہنی کوفت سے نجات دی جائے کہ وہ خود، قیافہ شناسی اور دور اندیشی کے زور پر مجرموں کو ان کے عہدے، مرتبے اور منصب سے پہچان لے۔ چوروں کا نام کھل کر نہ بتانے میں آخر کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ اس میں کیا حکمت حائل ہے اور یہ کس طرح جائز ہے کہ جن کا مال اور ملک لوٹا گیا ہو' ان سے ہی چوروں کے نام مخفی رکھے جائیں۔

یہ کس قدر افسوس' بے حسی اور ظلم کی بات ہے کہ چوروں کے بارے میں ہمارا رویہ ایسا خاکسارانہ ہو کہ ہم ان کی صاف صاف نشان دہی تک نہ کریں۔ احتساب تو بہت دور کی بات ہے۔

یہ طرز عمل بدلا جانا چاہیئے۔ لیٹروں' بدمعاشوں اور راشیوں کی تو کوئی تکریم وتوقیر ہوتی ہی نہیں ہے اگر اس پر حرف آتا ہے تو آجانے دیجئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طرح کی خبروں میں متعلقہ مجرموں کے نام صاف' واضع اور بغیر کسی اشاروں کناروں کے شائع ہونا ضروری ہیں۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔

اول یہ کہ ہمیں اپنے قومی لیٹروں کی پہچان ہو گی' ہم ان کو بوقت واردات شناخت کر سکیں گے اور ان پر معاشرتی دباؤ قائم ہو گا۔ دوسرا یہ کہ یہ ہمیں ایک ہی بار لوٹ سکیں گے بار بار نہیں۔ ان مجرموں کے نام صیغہ راز میں رہ جانے سے گنتی کے یہی لوگ بار بار ڈستے ہیں اور بچ نکلتے ہیں۔ چونکہ

کسی پر بھی انگلی رکھ کر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی وزیر ہے جو راشی ہے یہ وہی ایم این اے ہے جو خائن ہے یہ وہی جرنیل ہے جو سمگلر ہے اور یہ وہی سفارتکار ہے جو مخبر ہے۔

صحافت کو یہ مرّبیانہ رویہ اور مجرموں کو غیر ضروری تحفظ دینے کا طرز عمل زیب ہی نہیں دیتا۔

ان مجرموں کی نشان دہی نہ ہونے سے ہم بہت خسارے میں رہے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لئے یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ 1980ء کے عشرے میں بھارت کے ایک سابق سیکرٹری دفاع مسٹروی پی لانگر نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی' پاکستان سے جنگ اور بنگلہ دیش کے قیام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے چند پاکستانی سیاستدانوں کی ہندوستانی حکومت سے خفیہ خط وکتابت بھی شائع کر دی تھی جس میں ہمارے محترم اور معتبر سیاستدانوں نے ہندوستانی حکومت پر زور دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو آزادی دلا کر بنگلہ دیش کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ہمارے ہاں تبصرے' ادارے' اظہار خیال اور چہ میگوئیاں تو بہت ہوئیں مگر پردہ پوشی اور روایت کو قائم رکھا گیا اور ان ضمیر فروشوں اور وطن دشمن سیاستدانوں کے نام بہرحال صیغہ راز میں ہی رہے جنھوں نے وطن توڑنے کی سازش میں دشمنوں کا ساتھ دیا تھا نقصان اس پردہ داری کا یہ ہوا کہ مکروہ اور مردہ ضمیر سیاستدانوں کے اس گروہ میں سے کچھ سیاستدان آج بھی ہمارے منتخب نمائندے ہیں' محب وطن ہیں اور باعزت ہیں' اگر اس وقت ہندوستانی حکومت سے خفیہ خط وکتابت کے حوالے سے ان سیاستدانوں کے ناموں کا انکشاف کر دیا جاتا تو عین ممکن ہے کہ عوام انہیں دوبارہ اسمبلیوں میں بھیجنے کی بجائے جہنم کی طرف روانہ کر دیتے۔

کم و بیش ہر ملک میں اخبار اداروں کی اور صحافت ستون کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ہمارے ہاں اداروں کے ستونوں کو زمین بوس ہونے میں دیر ہی کس قدر لگتی ہے جونہی وزیراعظم کے کسی غیر ملکی دورے کا اعلان ہوتا ہے ان بے ستدن اداروں میں ایسی بھگدڑ مچ جاتی ہے کہ نہ یہ نظر آتا ہے کہ کس کے پاؤں پر کس کا پاؤں آگیا یا پاؤں تلے کیا کیا روندا گیا حکومتی وفد میں شامل ہوجانے کے لئے نظریہ' اصول' آبرو' عزت نفس' اور ایمان جو کچھ بھی رہ گیا ہو بیچ دینے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ سرکاری وفد میں شامل جس صحافی کے ضمیر اور قلم کی حرمت کو مفت کے ٹکٹ' ڈیلی الاؤنس' شوفر لیمو زین' تحفے تحائف' فائیو سٹار ہوٹل اور انواع واقسام کے وافر کھانوں کے بوجھ سے دبا دیا گیا ہے اس فروخت شدہ لٹے پٹے صحافی سے ایمان دارانہ یا کم ازکم غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کی توقع رکھنا کم عقلی' کج وخوش فہمی تو ہو سکتی ہے مگر فہم اور فراست نہیں۔

کیا یہی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے وزیراعظم کی صدر امریکہ سے ملاقات خواہ 20 منٹ کی ہو یا سرے سے صدر امریکہ ملنے سے ہی انکار کر دیں اور چاہے ملاقات کے لئے اس طرح کی پیشگی شرائط عائد کر دیں کہ میں صدر امریکہ' وزیراعظم پاکستان سے صرف اسی وقت مل سکتا ہوں کہ اگر وہ اس بات کا وعدہ کریں' ضمانت دیں' گواہ لائیں اور یقین دہانی کا مناسب بندوبست کریں کہ وہ رمزی یوسف اور اسامہ بن لادن کو ہمارے حوالے کر دیں گے' امریکی دہشت گردی کے آڑے نہیں آئیں گے' مذہبی بنیاد پرستی اور مذہب پرستوں کا بیج مارنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے' مگر اس اہانت آمیزی کے باوجود بھی دورہ بہت کامیاب ٹھہرایا جاتا ہے۔

ہمارے حکمرانوں کے غیر ملکی دورے اگر اسی قدر کامیاب ہوتے ہیں جیسا

کہ انہیں ثابت کیا جاتا ہے تو پھر مشکل کے ہر مرحلے پر ہماری سفارتی ناکامیوں اور غیر ملکی تنقید اور دباؤ کا کیا جواز ہے۔ بات کشمیر میں رائے شماری سے متعلق ہو یا اسے سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں شامل کرانا ہو' مسئلہ F-16 طیاروں کی ڈوبی ہوئی رقم کا ہو یا کارگل میں ہماری کرکری سے متعلق ہو' پاکستان ہمیشہ تنہا رہ جاتا ہے۔ امریکہ کی مستقل مخالفت و مخاصمت کے علاوہ بھی کبھی ہم چین کی حمایت سے محروم رہ جاتے ہیں کبھی ایران کی' کبھی برطانیہ ہمیں نیچے لگا لیتا ہے کبھی جاپان ہماری قرضے کی زور پر جاری تنفس کو روکنے میں لگ جاتا ہے کبھی انڈیا ہماری شہ رگ پر دباؤ بڑھا دیتا ہے۔

اگر کامیاب دوروں کا معیار' اثرات اور حاصل یہی کچھ ہے تو ایسے دوروں پر مٹی ڈال دینا اور ان سے توبہ کر لینی چاہیئے کہ نہ صرف کروڑوں کا زرمبادلہ بچے گا بلکہ قوم وفد میں شامل ارکان کی گری ہوئی لالچ بھری حرکتوں سے پیدا ہونے والی شرمندگی سے بھی محفوظ رہے گی۔ ہمارے حکمرانوں کے سو فیصد کامیاب دوروں کی اصلیت حکومتی وفد میں شامل صحافیوں کے زور قلم اور اس سرمایہ کاری کے محاصل کے بجز کچھ بھی نہیں ہے جو ان صحافیوں پر حکومت وقت نے کی ہوتی ہے۔

جن ملکوں میں صحافت کا ننگ ہمارے ہاں کی طرح جاری و عریاں نہیں ہے صحافی تو وہاں کے بھی حکومتی وفد کے ساتھ غیر ملکی دوروں پر جاتے رہتے ہیں مگر ان کا کرایہ' الاؤنس طعام و قیام اور دیگر اخراجات اخبار خود برداشت کرتا ہے حتی کہ انہیں حکومتی ارکان سے فاصلے پر رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی رائے اور مشاہدہ حکومتی ارکان کے موقف سے متاثر نہ ہو سکے اور وہ سچ بات کو غیر جانبدارانہ طور پر رپورٹ کر سکیں لیکن جہاں صورت حال ایسی ہو کہ کھانا کھا لینے کے بعد بھی صحافی حضرات ریسٹورنٹ میں اس امید اور انتظار میں

بیٹھے رہیں کہ کوئی نہ کوئی آئے' کوئی سفارتخانے کا کارندہ' کوئی حکومت کا نمائندہ اور کھانے کا بل ادا کرے اور انہیں چھڑا کر لے جائے تو ایسے میں رپورٹنگ پر متعلقین کے لاکھ زود ہضم ہونے کے باوجود بھی آنکھ کی شرم، کچھ لحاظ داری کوئی مال محتاجی اور اگلے دورے کی اُمید کا بار آہی جاتا ہے۔

روزانہ لاکھوں کے اخبار سے' کروڑوں اشتہارات سے اور اربوں دوسرے ہتھکنڈوں سے کمانے والے ہمارے اخبارات حکومتی وفد میں شامل اپنے ایک صحافی کے اخراجات بھی اٹھانے پر تیار نہیں ہوتے تو ایسے میں بالکل ایسی ہی غیر جانبداری اور فکری رہنمائی کا چاند چڑھ سکتا ہے جیسا کہ چڑھا ہوا ہے۔

قوم کی فکری رہنمائی کا زعم لاحق اور کوڑھ مبتلا ان اداروں کا حال یہ ہے کہ کسی اخباری ادارے کے پاس نہ کوئی اپنا ریسرچ سیل ہے نہ ڈیٹا بنک' نہ کوئی تحقیقاتی میکانزم ہے نہ اپنے معیشت دان نہ ماہرین' نہ سوشیالوجی اور اقتصادیات کی الف بے جاننے والے' نہ اسلامیات کی الف لام میم' سارے کا سارا کام مضمون باندھ اور مخبروں سے چلایا جا رہا ہے۔ کسی بھی تیکنیکی نوعیت کے کالم کے لیے نہ کوئی شعبہ جاتی ماہر موجود ہے نہ کوئی محقق' میاں صاحب نے اگر فرمادیا کہ سندھ طاس کے نہری پانی کے صوبوں کے مابین تصفیے سے ایک کروڑ روزگار پیدا ہوں گے تو ہونگے کسی اخبار نے اس جاہلانہ مفروضے پر اپنے طور پر کسی تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اعداد وشمار' حسابی فارمولے' زمین کی مقدار اور بے روزگاری کی شرح کا تناسب نکالنے اور تجزیہ کرنے سے میاں صاحب کے گمان بھرے اعداد وشمار جھوٹے ثابت کئے جا سکتے ہیں، انہیں دروغ گو ٹھہرایا جاسکتا ہے اور عوام کو بلاوجہ کی خوش فہمی کے عذاب سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

ہمارے ہاں اخبارات تحقیقی اساس' تجزیاتی تنقید اور واقعاتی حقائق سے عاری وعاجز ہیں۔

صاحب علم ہونے' نفس مضمون پر دسترس' جانکاری اور موضوع سے آگاہ لکھنے والے کی تحریر اور طرز عمل میں جو گہرائی' پختگی' بے ساختگی' قوت استدلال اور فطری بے خوفی ہوتی ہے اس کے مقابلے میں سموسوں اور پیسٹریوں کے زور پر باندھے گئے مضامین یکساں نتائج پیدا نہیں کر سکتے شاید یہی وجہ ہے کہ علم کو سب سے موثر طاقت اور صاحب علم کو سب سے طاقتور مانا گیا ہے۔

فکری رہنمائی کے دعویداروں میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ سراسر خسارے کے سودے مثلاً موٹر وے کا شماریاتی تجزیہ کر کے حکومت کے منافع بھرے دعووں کا بھانڈا پھوڑ سکیں یا اپنا گھر جیسی بے سروپا سکیم' پیلی ٹیکسی' پیلے ٹریکٹر' کالا دھن اور نوجوانوں کے لئے قرضہ جاتی ہیر پھیر کا ملمع اتار سکیں۔

موٹی کھال کا یہ طبقہ ایک ایسی بھیڑ چال کا شکار ہے کہ جہاں سب چلتا ہے سب اچھا ہے۔ جب تک اس طبقے کے مفادات محفوظ ہیں مارشل لا بھی گوارا اور منتخب حکومتوں کی برطرفی بھی' چیف جسٹس کی بے حرمتی بھی اور چیف آف آرمی سٹاف کی جبری سبکدوشی بھی' صدر مملکت پر الزام تراشی بھی اور عدالتوں پر سنگ زنی بھی۔ جب تک سرکاری عشائیوں کے دعوت نامے' حکومتی وفد میں شمولیت اور نظریہ صحافی پلاٹ زندہ ہے سب کچھ اچھا' بے عیب اور گوارا ہے۔

لاعلمی' غیر پیشہ ورانہ اپروچ اور لالچ نے حق بات کہنے کا حوصلہ سلب کر رکھا ہے احتیاط اور خود حفاظتی کا یہ عالم ہے کہ جو ادارے عوام کی منتخب کردہ

حکومت کے خلاف مڈ نائٹ جیکالز جیسے قبیح آپریشن' آئی جے آئی کی غیر فطری پیدائش اور مہران بنک کا کروڑوں روپیہ غیر قانونی کاموں میں خرچ کر دینے کے سزاوار ہوں انہیں حساس اداروں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ جس طرح کی خدمات ان اداروں نے انجام دی ہیں سچ تو یہ ہے کہ انہیں حساس اداروں کی بجائے بے حس ادارے کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

میاں نواز شریف وزیراعظم پاکستان میں کوئی اور وصف ہو یا نہ ہو مگر ان کی اس صلاحیت کا ایک عالم معترف ہے کہ میاں صاحب بکاؤ مال' بدعنوان اور نادہندہ کو طاقتور میگنٹ کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں اور مرغی کی طرح اپنے پروں میں اپنے سایہ عافیت میں چھپا لیتے ہیں۔ میاں صاحب کو سکریپ میں چونکہ ہر طرح کا مال خریدنے کی عادت اور تجربہ ہے جو سیاست میں بھی ان کے بہت کام آیا جونہی وہ وزیر اعلی پنجاب مقرر ہوئے انہوں نے ہر طرح کے سیاسی سکریپ میں سرمایہ کاری شروع کر دی۔ ان کے صوابدیدی فنڈ سے مستفیض ہونے والے بکاؤ مال کا ہراول دستہ صحافتی ہی تھا گو کہ صحافت میں میاں صاحب کی سرمایہ کاری اربوں کی ہے مگر پردے داری اور آنکھ کی شرم بھی آخر کوئی چیز ہے۔

میاں صاحب کو اسلامی اقدار اور تجارتی اصولوں کا بڑا پکا پایا گیا ہے وہ اس طرح دیتے ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہونے دیتے کہ کس کو کیا دیا' کیا دیں گے' کس کو کتنے میں خریدا اور کتنے میں بیچیں گے۔ آٹے میں نمک سے بھی کچھ کم اس بکاؤ دستے کے کچھ نام اپنی غلطی اور آپس کی ہی جو تم پیزار سے باہر آگئے اس میں میاں صاحب کو دوش نہیں دیا جا سکتا۔ آبروئے صحافت کے قلمی مجاہدین کو میاں صاحب کی طرف سے پہلی قسط کی ادائیگی کب اور کتنے کی ہوئی درج ذیل ہے۔

چیک کے اجراء کی تاریخ	چیک نمبر	نام صحافی	رقم
۸۶-۹-۹۲	۸۷۴۵۱۷	صدر فیڈرل یونین آف جرنلسٹس لاہور	۱۰۰۰۰۰ روپے
۸۶-۱۰-۵	۸۷۴۵۲-	مصباح الحق- چیف رپورٹر پی پی آئی' لاہور	۲۰۰۰۰ روپے
۸۷-۳-۴	۸۹۳۶۰۱	اطہر مسعود روزنامہ جنگ لاہور	۲۲۳۸۰۰ روپے
۸۷-۵-۲۴	۸۹۹۵۰۹	صدر گجرات پریس کلب	۵۰۰۰۰ روپے
۸۷-۵-۵	۸۹۹۵۸۹	فضل الرحمن نعیم- صحافی	۱۰۰۰۰ روپے
۸۷-۶-۴	۹۱۰۷۰۳	منظور احمد رحمت- ایڈیٹر ہفت روزہ مدینہ بہاولپور	۱۵۰۰۰ روپے
۸۷-۵-۱۷	۸۹۹۵۹۶	اے آر گیلانی- صحافی جنگ	۱۵۰۰۰ روپے
۸۷-۶-۱۳	۹۱۰۷۱۰	شاہد فیروز پوری	۲۰۰۰۰ روپے
۸۷-۷-۱۸	۹۳۱۹۴۲	جاوید نذیر' چیف رپورٹر دی نیشن	۷۵۰۰۰ روپے
۸۷-۸-۵	۹۳۱۹۲۶	طارق وارثی- ایڈیٹر نوائے وقت	۱۲۵۰۰۰ روپے
۸۷-۹-۱	۹۳۱۹۲۹	سعادت فیاض- رپورٹر مشرق	۱۰۰۰۰۰ روپے
۸۷-۸-۵	۹۳۲۹۲۶	شجاع الرحمن' ایڈیٹر ہلال احمر	۱۵۰۰۰ روپے
۸۷-۹-۲۶	۹۲۲۰۶۸	ضیاء الاسلام انصاری' چیف ایڈیٹر مشرق	۱۰۰۰۰۰ روپے
۸۷-۱۰-۵	۹۴۶۹۶۹	افتخار احمد' سٹار رپورٹر جنگ	۱۵۰۰۰۰ روپے
۸۷-۱۰-۱۰	۹۴۶۲۷۷	مرزا نعیم اختر' جرنلسٹ بہاولپور	۱۰۰۰۰ روپے
۸۶-۹-۲۹	۸۷۴۵۱۷	صدر فیڈرل یونین آف جرنلسٹس لاہور	۱۰۰۰۰۰ روپے

چیک کے اجراء کی تاریخ	چیک نمبر	نام صحافی	رقم
۴-۱-۸۸	۹۵۸۶۹۴	نذیر حق ڈپٹی ایڈیٹر مشرق	۵۰۰۰۰ روپے
۲۴-۱-۸۸	۹۵۸۶۹۲	وقار انبالوی کالمسٹ نوائے وقت	۳۰۰۰۰ روپے
۳۰-۳-۸۸	۹۷۷۵۵۰	اطہر مسعود ڈپٹی ایڈیٹر جنگ	۳۰۰۰۰ روپے
۳-۴-۸۸	۹۸۶۲۰۲	ضیاء الاسلام ایڈیٹر مشرق	۵۰۰۰۰ روپے
۳۰-۳-۸۸	۹۷۷۵۵۳	رانا محمد صدیق' اٹک	۱۰۰۰۰ روپے
۲۵-۴-۸۸	۹۸۹۳۰۳	سرور حجاز ایڈیٹر ماہنامہ روداد	۳۰۰۰۰ روپے
۲-۷-۸۸	۰۰۷۸۳۴	سید ممتاز گیلانی' سب ایڈیٹر انچارج نوائے وقت	۲۵۰۰۰ روپے
۲۰-۷-۸۸	۰۱۴۱۸۴	اطہر مسعود چیف نیوز ایڈیٹر جنگ	۲۵۰۰۰ روپے
۲۰-۷-۸۸	۰۱۴۱۸۵	نذیر ناجی' کالم رائٹر نوائے وقت	۴۰۰۰۰ روپے
۵-۹-۸۸	۰۱۵۴۴۱	محمد منیر سیڈپی راین نوائے وقت	۵۰۰۰۰ روپے
۱۶-۳-۸۹	۰۳۰۲۱۶	رفیق احمد شادی فری لانسر	۲۰۰۰۰ روپے
۶-۴-۲۹	۰۴۳۱۰۵	ایس اے منور جرنلسٹ	۱۰۰۰۰۰ روپے
۸-۴-۸۹	۰۲۳۱۰۶	مسٹر روحانی ایڈیٹر ڈیلی سنگ میل' ملتان	۱۰۰۰۰۰ روپے
۲۲-۴-۸۹	۰۴۳۱۱۸	پرویز بشیر رپورٹر ڈیلی جنگ لاہور	۲۰۰۰۰ روپے
۱۵-۵-۸۹	۰۴۹۲۳۳	سید فیض قادری' سب ایڈیٹر	۲۰۰۰۰ روپے
۵-۵-۸۹	۰۴۳۹۸۱	قمر النساء' جرنلسٹ ملتان	۲۰۰۰۰ روپے
۲۱-۲-۸۹	۰۳۰۲۱۵	ثریا ریاض W/O ریاض ملک جرنلسٹ آف پاکستان ٹائمز	۵۰۰۰۰ روپے
۲۷-۷-۸۹	۰۶۸۸۵۲	جاوید نثار C/O سیکرٹری انفارمیشن اینڈ کلچر لاہور	۳۰۰۰۰ روپے

چیک کے اجراء کی تاریخ	چیک نمبر	نام صحافی	رقم
۸۹-۶-۷	۵۵۸۱۸	طاہر رانا' C/O سٹاف رپورٹر جنگ لاہور	۲۰۰۰۰ روپے
۸۹-۸-۳	۰۶۸۸۵۳	جاوید نذیر' سیکرٹری انفارمیشن	۲۵۰۰۰ روپے

(مجاہد حسین: کون بڑا بد عنوان' صفحہ 214 تا 216)

کچھ احتساب اس کا بھی.......

احتسابی نعرے کو جس قدر عوامی حمایت حاصل ہے اس کی تکمیل اسی قدر مشکل بلکہ ناممکن بنا دی گئی ہے۔ اب تک احتساب کے جتنے نعرے لگ چکے ہیں' دعوے کئے جا چکے ہیں اور یقین دہانیاں کرائی گئی ہیں سب کا نتیجہ صفر ہی نکلا ہے اور اس سے مختلف نتائج نکلیں گے بھی نہیں حتیٰ کہ صورت حال میں بنیادی تبدیلی وقوع پذیر ہو۔

یوں تو جنرل ضیاالحق مرحوم سے پہلے بھی احتساب کا ڈول ڈالا جاتا رہا ہے مگر احتساب کو باقاعدہ پروگرام' ایجنڈے اور ضرورت کی موجودہ مزاحیہ شکل جنرل ضیاء الحق سے ہی میسر آئی۔ ان سے پہلے احتساب کے دباؤ اور نتائج کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی روایت ایسی مضبوط اور مروج نہیں تھی۔ سیاسی' مفاداتی اور یکطرفہ احتساب کی جو تھیوری جنرل صاحب نے متعارف کرائی اور اس پر عمل پیرا ہوئے' اس سے احتساب کے ننگ نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے احتسابی عمل اور ٹریفک چالان کی حیثیت ایک جیسی ہو کر رہ گئی۔

جنرل ضیاء الحق نے انتخابی نعروں میں احتساب کے نعرے کا اضافہ کرنے کی راہ سجھائی' اس سے بچنے کے طریقے سکھائے' پیروکاروں کو احتسابی مزاحمت کی تربیت دی' احتساب کو یک طرفگی کے ننگ سے آلودہ کیا اور مخالفین کے بیخ مار ہتھیار کے طور پر پروان چڑھایا۔ احتساب کی نڈھال بکری کو کوئی 1985 سے ذبح کرنے پر بضد ہے اور کوئی 1977 سے۔ ہر کوئی اس کا اطلاق ایسے دورانیئے پر کرنا چاہتا ہے کہ جہاں وہ خود محفوظ اور مصاحبین مامون رہ سکیں۔ ایسے عزائم بذات خود احتساب کی زد میں اور توہین احتساب کے مترادف ہیں۔

آخر غیر مشروط' بلا امتیاز مدت اور سب کا احتساب کیوں نہیں؟ اس میں قباحت ہی کیا ہے؟

لیکن قباحت ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کے غیر جانبدارانہ اور شفاف احتساب سے اس غیر تحریری معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے' جو ڈاکوؤں کے درمیان موجود ہے۔ جہاں باریاں بندھی ہوں' علاقے صیقل' وارداتیئے متصل اور حلقے بٹے ہوئے ہوں' وہاں ایسا ہی احتساب کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ ہو رہا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو نااہل قرار دلوانے اور بددیانت ثابت کرنے کے لئے سینیٹر سیف الرحمان کے سامنے مہران بنک سیکنڈل بھی موجود تھا۔ اگر سینیٹر صاحب سوئٹزرلینڈ' آسٹریلیا' انگلینڈ اور دبئی سے محترمہ کے خلاف ثبوت لا سکتے ہیں جو کہ نسبتاً مشکل' مہنگا اور شک میں ڈالنے والا کام تھا تو اس کی بجائے مہران بنک سیکنڈل سے بھی یہی کام لیا جا سکتا تھا مگر اس میں کچھ ایسے نام بھی آتے ہیں جن کے افشاء سے سینیٹر اور چیرمین احتساب بیورو فقط سیف الرحمان رہ جائیں گے۔ اس میں سب برابر کے شریک ہیں سب کی سانجھے داری ہے' اربوں کا ہیر پھیر ہے راز داری ہے بیچ بچاؤ ہے'

پاسداری ہے' وعدے وعید ہیں' سب نے مرنا بھی تو ہے۔ آخر باریاں جو بندھی ہوئی ہیں۔ دونوں طرف کے علمبردار چھری کے نیچے آسکتے ہیں۔

محترمہ کے سوئس بنک اکاؤنٹ کا کھوج لگانا اور ثابت کرنا مہران بنک کی لوٹ مار کے سیدھے سادھے کیس سے کہیں مشکل تھا لیکن مہران بنک سکینڈل کو سادہ ہونے کے باوجود نیشنل سیکورٹی' سرکاری راز کے افشا اور ملکی سلامتی کی رسی سے لٹکا دیا گیا ہے اور ایسا ہی لٹکا رہے گا' حتیٰ کہ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ بن جائے۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوٹ مار اور چوری چکاری کو بھی قومی سلامتی اور سرکاری راز کے پردے میں چھپایا جا سکتا ہے بددیانتی کے معاملات کا نیشنل سیکورٹی سے کوئی ناطہ ہونا چاہئے' نہ بدنیتی کا سرکاری رازوں سے' لگتا ہے کہ نیشنل سیکورٹی اور سرکاری راز تو سب پر عیاں ہی ہیں' پردہ داری تو صرف لوٹ مار کی مقصود ہے' ورنہ سینیٹر صاحب مہران بنک سیکنڈل کے تر نوالے کی بجائے سوئس اکاؤنٹس والے لوہے کے چنے نہ چباتے۔

احتساب کے تار تار دامن پر ایک بڑا بدنما دھبہ احتسابی ترجیحات کا بھی ہے۔ دوسروں کا احتساب کرنے کی جب بھی ضرورت پیش آتی ہے' احتساب کا دائرہ کار اپنی اپنی ضرورت اور ترجیحات تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ آپ کس کس کا احتساب چاہتے ہیں اور کس بات کا احتساب مقصود ہے؟ عموماً" احتساب کی گھوڑی کو مالی خرد برد' نقد کمیشن اور ناجائز ٹھیکوں کی بھول بھلیوں میں دوڑایا جاتا ہے۔ بھاگتے رہنے سے ادھر گھوڑی کا سانس اکھڑنا شروع ہوتا ہے' ادھر متعلقین اپنی بے گناہی اور بریت پر بھنگڑے ڈال رہے ہوتے ہیں حالانکہ مملکت خداداد کو کئی گنا زیادہ نقصان تو ان بداعمالیوں سے ہوا ہے' جن کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔

احتساب کے دائرے میں بدنیتی' نااہلی' اقربا پروری اور نیت کے کوڑھ کو شامل کئے بنا احتساب ادھورا' مخولیہ اور بے مقصد رہے گا۔

ہر متعلقہ فرد اور مشتبہ افراد کا مکمل احتساب ہو اور ہر طرح کا ہو' طرح طرح سے ٹھونک بجا کر پرکھ لینا ضروری ہے کہ جسم جذامی ہے یا غیر جذامی اور کس حد تک کوڑھ اثر ہو چکا ہے۔

یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ جس شخص کی درج کرائی گئی ایف آئی آر کی بنیاد پر ایک منتخب وزیر اعظم تو پھانسی چڑھ جائے مگر اس شکایت کنندہ سے یہ کوئی نہ پوچھے کہ اسلام آباد کے مہنگے علاقوں میں اس نے کتنے پلاٹ حاصل کئے اور اسی گردن زدنی وزیراعظم سے مزید کیا کیا فائدے اٹھائے؟ انصاف اور احتساب کا خون تو اسی وقت ہو جاتا ہے' جب احتسابی فہرستیں تیار کی جا رہی ہوتی ہیں کہ کسے بچایا جائے اور کسے نہ بچایا جائے ؟

احتساب کو صوابدید کی بجائے اصول سے وابستہ کیا جانا چاہئے۔

مہران بنک سکینڈل کے جس کیس میں یونس حبیب سزا کاٹ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسی کیس میں ان کے معاونین اور بندربانٹ میں ملوث دوسرے حضرات محفوظ' معتبر اور سربلند ہیں۔

یہ احتساب نہیں بلکہ ابہام ہے اور بچانے کا اہتمام ہے۔ یہ احتساب کے پردے میں ان لوگوں کو بچانے کا اہتمام ہے' جو ریاست اور معاشرے کے خلاف جرائم کر چکے ہیں۔ ثبوت موجود ہے' پائی پائی اور لفظ لفظ ثابت کیا جا سکتا ہے مگر کوئی نہ کوئی مصلحت' بدنیتی اور مجبوری ہے کہ آڑے آجاتی ہے۔

مصلحت' بدنیتی اور مجبوری کی فضا میں سودے بازی تو ہو سکتی ہے مگر احتساب نہیں کیا جا سکتا۔

احتساب کے لئے جس طرح کے غیر جانبدار اور خود فیصلہ کار مضبوط

ادارے' دیانتدار محتسبوں' آخرت میں جواب دہی کے خوف سے لرزاں' کسی دباؤ میں دبنے سے انکاری اور باوضو رہنے والے سربراہ کی ضرورت ہے جو کہ ہمیں میسر ہی نہیں ہے۔ ہمارا احتسابی سربراہ تو بجائے خود احتساب کی زد میں اب آیا کہ آیا' ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ احتساب کی باگ ڈور ہی جب ایسے ہاتھوں میں ہو تو اس طرح کے احتساب سے متنازعہ' تفریحی اور مخولیا نتائج کے سوا حاصل بھی کیا ہو سکتا ہے۔

وطن عزیز کو سب سے بڑا نقصان ان نااہلوں سے ہوا ہے' جنہوں نے سفارش' رسوخ' دھاندلی اور سیاسی دباؤ کی بنیاد پر ایسے کلیدی عہدے حاصل کر لئے جو DECISION MAKING اور پالیسی سازی کے متقاضی تھے۔ ایک نااہل' غیر پیشہ ور اور دھاندلی کے زور پر کسی ادارے پر براجمان سربراہ سے یہ توقع ہی متعلقہ ادارے کی موت کے مترادف ہوتی ہے کہ وہ فیصلے کرے' پالیسی بنائے' ضابطے پروموٹ کرے۔ سفارشی صلاحیتوں کے حامل افراد تو خود اپنی قیادت نہیں کر سکتے' وہ بھلا کسی ادارے کو چلانے کا بار کیسے اٹھا سکتے تھے' اس کا منطقی نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔

ان غیر مستحق اور نااہلوں نے جو بھی غیر پیشہ ورانہ فیصلے کئے' طبقاتی اور مفاداتی پالیسیز بنائیں' ادارے کی ساکھ کو تباہ اور معیار کو غیر معیاری کیا' اس کے باوجود یہ حضرات وی آئی پی کہلائے اور اگلی صفوں میں بٹھائے گئے' انہیں مہمان خصوصی کی کرسی اور صاحب صدر کے منصب سے نوازا گیا۔ ہزاروں دست بستہ اور لب سلے لوگوں پر انہیں شرف تقریر بخشا گیا' مراعات دی گئیں۔ انہیں دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے اور ان کے ارشادات پر تالیاں بجاتے' سر جھکاتے اور شرف باریابی کی امید میں گھنٹوں کھڑے رہنے والے کبھی بد دل نہ ہوتے۔ ان ناکاموں اور سیاہ روؤں کو سرکاری عشائیے کھلائے

جاتے، استقبالی قطاروں میں آگے آگے کھڑا کیا جاتا، گورنر ہاؤس کے ثقافتی شو میں انہیں نیم برہنہ غیر ملکی گانے والیوں کے ساتھ بٹھایا جاتا، غیر ملکی وفود سے ان کے تعارف کرائے جاتے۔ ان کی اہلیت، علمیت اور تدبر کے حوالے دیئے جاتے، انہیں غیر ملکوں میں بھیجا جاتا، مطالعاتی دورے اور ریفریشر کورسز کرائے جاتے، روزانہ الاؤنس دیا جاتا، ناز نخرے اٹھائے جائے اور ملامت بھرے کارناموں پر بھی ان کی تحسین کی جاتی۔

سرکاری گاڑی، شوفر، رہائش گاہیں، فون، الانونسز، عملہ، عمرے، خدمت گار، ریسٹ ہاؤسز، خدام، قالین، غالیچے، گلدستے، خانسامے، فرسٹ کلاس میں ہوائی سفر، دعوت نامے، ضیافتیں، دم پخت بکرے، غیر ملکوں میں علاج، کسٹم فری گاڑیاں، کم نرخوں پر پلاٹ، تحفے، نذر، نیاز اور نذرانے، عیدی اور سلامیاں ایک نحیف ونزار معیشت اور شکستہ حال مبتلاؤں سے مزید کیا وصولا جا سکتا تھا، جو ان سفارشیوں، نااہلوں اور بددیانتوں نے وصول نہیں کر لیا۔

ان سب مراعات اور فائدوں کے بدلے میں اس بے حس، نااہل بے ضمیرے نے قوم کو کیا دیا۔ بدترین اور خسارے والی پالیسی، معیار گراؤ اور ابتری پھیلاؤ ضابطے؟

کیا اس فرد سے یہ پوچھا جانا عین منطقی نہیں ہے کہ جس کام کی تکمیل سے یہ ساری مراعات، عزت افزائی، خوش آمدید اور شکم سامانیاں وابستہ تھیں، جب وہ ہی نہ کیا جا سکا تو یہ سب فائدے کس حساب میں؟ کس کے کھاتے میں؟ اس کی توضیح کیسے کرو گے؟ اسے کیسے حلال قرار دو گے؟ اسی طرح ان افراد سے بھی یہ پوچھا جانا ضروری ہے، لاجیکل ہے کہ جو سرکاری وسائل، ریاستی اداروں اور کلیدی عہدوں پر غول در غول حملہ آور ہوئے، انہیں برباد کیا اور ملیا میٹ کر کے روپوش ہو گئے۔

نااہلی کے احتساب کے لپیٹے میں کم وبیش سبھی کو لپیٹا جا سکتا ہے۔ واپڈا' ریلوے' پنجاب یونیورسٹی' اربن ٹرانسپورٹ' سٹیل ملز' گھی کارپوریشن' پی آئی اے، سی بی آر، شپنگ کارپوریشن، ایل ڈی اے، سی ڈی اے، کے ڈی اے، اوقاف، سیڈ کارپوریشن، مچھلیاں پالو، سبزیاں اگاؤ، خواندگی بڑھاؤ اور انسداد بے رحمی حیوانات۔ غرض یہ کہ کونسا ادارہ ان کے سربراہوں کے ہاتھوں معاشی ناسور نہیں بن گیا۔ کونسا زخم ہے جو رستا نہیں ہے۔ معاشرے کے بدن پر کونسا گھاؤ ہے جو گہرا نہیں ہے' ہرا نہیں ہے۔

حقیقتاً" یہی وہ نااہل لوگ ہیں جو ہماری تعلیمی' معاشی اور معاشرتی بدحالی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ موجودہ ابتری اور افلاس کی بنیاد میں انہی لوگوں کی مرتب کردہ ناکام پالیسیز کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ جس نے نصف صدی گزرنے پر بھی کسی سسٹم' طریق کار اور ضابطے کو پاؤں نہیں جمانے دیئے بلکہ ایک ایسے کمرشل کلچر اور ایڈ ہاک ازم کو فروغ دیا کہ جس سے لوٹ کھسوٹ' مارا ماری' مک مکا' کمیشن' حصہ داری' پتی اور فیصد کے کوڑھ نے فروغ پایا' پاؤں پسارے حتیٰ کہ جما لیئے۔

لاکھوں من گندم ہر سال کھلیانوں اور حکومتی ذخیروں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ غیر ملکی وظائف طلباء میں بانٹے جانے کی بجائے ایکسپائر ہو جاتے ہیں۔ جہاں پانی کی بوند بوند کو لوگ ترستے ہوں' وہیں کروڑوں کیوسک فٹ پانی سمندر کی نذر ہو جاتا ہے۔ محکمہ تعلیم سے ایک پرائمری سکول منظور کروا لینا' امریکی شہریت کے حصول سے زیادہ مشکل ہے' جس موٹر وے کا افتتاحی فیتہ کاٹا جا رہا ہوتا ہے' اسی کی مرمت کے ٹینڈر بھی طلب کئے جا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی پراجیکٹ وقت مقررہ پر پورا نہیں ہوتا۔ سرکاری عمرہ گزاروں کی فلائٹ کے علاوہ کوئی جہاز وقت پر روانہ نہیں ہوتا' مغرب کے بعد ٹرین کے

ڈبوں میں مسافر اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں' ایک سٹیشن پر ریلوے کا عملہ بلب لگاتا ہے اگلے سٹیشن والا عملہ اتار لیتا ہے۔ مسافر دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کسی بھی منصوبے کی پیداوار اور آمدنی کا جو ہدف مقرر کیا جاتا ہے کبھی پورا نہیں ہوتا۔ امتحانات متاخر' ٹیسٹنگ میٹریل غیر یقینی اور نتائج حیران کن۔ کیا واقعی یہ مسائل ایسے ہی لاینحل اور لا علاج ہیں کہ ان کو سلجھانے کے لئے کسی خصوصی اوتار' کسی امام مہدی کی ضرورت ہے یا صرف کچھ ایسے دیانتدار اور اہل لوگوں کی' جو ایسی پالیسیز وضع کر سکیں کہ جن کے اطلاق سے عوام سکھ کا سانس لے سکیں ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو' وہ دھوپ میں لمبی قطاروں میں دن نہ گزار دیا کریں۔ ان کا معیار زندگی بھی بہتر ہو سکے' ان کے معصوم بچوں کو بسوں کی چھت سے اتار کر اندر بٹھایا جا سکے۔

جن حضرات نے ان معمولی نوعیت کے مسائل کے حل کو بھی قومی نوعیت کے لاحل مسائل میں بدل دیا ہے کیا ان کا احتساب نہیں ہونا چاہیئے؟

جو تعلیمی پالیسی کے ذمہ دار تھے اور ماہرین تعلیم کہلاتے تھے انہوں نے ہی تعلیم کا ستیاناس کر دیا جنہوں نے معاشی اور اقتصادی منصوبہ بندی کا بیڑہ اٹھایا یہ بیڑہ انہوں نے ہی غرق کیا' انہی افراد نے مملکت کی معاشی بیخ کنی کر دی۔ یہی حال صحت عامہ' انڈسٹریز' کامرس' مواصلات اور دوسرے شعبوں میں ہے' بلکہ زیادہ سچ تو یہ ہے کہ ہر ایک شعبے میں ہے۔

مملکت کے طول وعرض میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایک ایسا مائی کا لال سرخ رو' کامیاب وکامران پالیسی ماسٹر نہیں مل سکتا' جو گردن اٹھا کر چل جس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا جا سکے جس کی شہادت دی جا سکے کہ اس شخص نے حق ادا اور نمک حلال کر دیا۔ جو مراعات' منصب اور فائدے اسے حاصل تھے' اس کے معاوضے میں اس فرد جوانمرد نے اپنے محکمے' اپنے شعبے میں اپنی

محنت‘ ذہانت‘ قابلیت‘ علمیت‘ تدبر اور دیانت کے زور پر ایسی کامیاب پالیسی بنائی‘ ایسی کارکردگی دکھائی اور ایسی اصلاحات کیں کہ جس سے ملک اور قوم کو فائدہ ہوا‘ ترقی ہوئی‘ پیداوار بڑھی‘ یافت میں اضافہ ہوا‘ دن پھر گئے اور کوڑھ سالی جاتی رہی۔ ادارہ مضبوط اور معیشت صحت مند ہوئی‘ ضابطے پروان چڑھے‘ شخصی صوابدید کو پھانسی دے دی گئی اجتماعی فیصلہ سازی کا بول بالا ہوا اور کامیابی ناپنے کی اکائی مقرر ہوئی۔

قیاس اغلب ہے کہ مالی بدعنوانیوں کے احتساب سے بچتے رہنے والے گھاگ نااہلی کے احتساب کے نیچے ضرور آجائیں گے۔

نااہلی کے احتساب کی بسم اللہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی شروع کی جا سکتی ہے آج کی پنجاب یونیورسٹی پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ نااہلی کا جرم سر چڑھ کے بولے گا۔ وہاں کے سربراہوں کی صلاحیت‘ پیشہ ورانہ قابلیت‘ تعلیمی مہارت اور تعلیمی شعبے میں ان کی کامیابیاں‘ سرفرازیاں اور پھرتیاں عیاں ہو جائیں گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ان کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ جھوٹ مٹ جائے گا اور جھوٹ نے مٹنا ہی ہوتا ہے۔ حق اور حق ذات نے ہی رہ جانا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں سچ یہ ہے کہ اس کا جو بھی سربراہ جس روز رخصت ہوا‘ وہ اس تعلیمی ادارے کو مزید خستہ حالی میں چھوڑ کر رخصت ہوا نسبتاً اس روز سیاہ کے‘ کہ جس دن اس نے اس ادارے کا چارج سنبھالا تھا‘ اس پر قبضہ کیا تھا۔ ہر جانے والا جاتے ہوئے معاملات کو پیچیدہ‘ معیار کو بد ترین‘ ادارے کی ساکھ کو سوالیہ‘ ڈگریز کو مشکوک‘ طلباء کی علمیت کو مشتبہ‘ یونیورسٹی کو مقروض‘ عمارتوں کو شکستہ‘ ہوسٹلز کو اسلحہ خانے‘ امتحانات کو متاخر‘ نتائج کو غیر یقینی‘ طلباء کو مزید فرسٹریٹ‘ والدین کو ناامید‘ امتحان پاس کرنے والوں کی شرح مزید کم اور داخلے

کا طلب گار ہجوم زیادہ' میرٹ مفقود اور پرچی حاضر کا چلن عام بلکہ سرعام کر کے رخصت ہوا۔

دل کو ریزہ ریزہ کر دینے والی اس قدر بڑی ناکامیوں کے باعث افراد کو دل موہ لینے والی ایسی ایسی ریاستی مراعات کہ جو اسی شہر میں سکھ اور مغل شہزادوں کو بھی حاصل نہیں تھیں اس قدر بڑی ناکامیوں کے عوض ایسی فراخدل مراعات کا نہ کوئی جواز ہے نہ منصب اور نتائج کا آپس میں جوڑ' احتساب کے سمے ان ماہرین سے بھی پوچھ لیا جائے کہ جو فائدے تمہیں حاصل تھے اس کے عوض تم نے قوم کو کیا دیا۔ محض ایک مزید خستہ حال جان بہ لب فریاد کناں ادارہ۔

یہ بھی پوچھ لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ وہ انتظامی قابلیت جس کا شہرہ تھا، وہ علمی مہارت جس کا دعوٰی تھا، وہ پیشہ ورانہ مہارت جس کا ڈنکا بج رہا تھا، وہ شدید محنت، اخلاص، تدبیر، انہاک اور جن مثبت نتائج کی توقع باندھی گئی تھی آخر ان سب کا اطلاق کیوں نہ ہو سکا؟ نتائج کیوں نظر نہیں آتے۔ کیا وہ سب کچھ دکھاوا تھا؟ واہمہ تھا' ملمع تھا' مسمریزم تھا یا جو کچھ نظر آتا ہے یہی اصلیت' سچ اور اٹل ہے۔

سچ کو جاننے' ماننے اور تسلیم کئے بنا ہمارا کام چلے گا نہیں۔ نااہل اور غاصب منصب داروں کے کڑے احتساب اور کرکری سے آنے والے بڑے نااہلوں کا راستہ رکے گا حوصلہ شکنی ہو گا اور بیج مرے گا۔

مغویہ نیک پروین

پنجاب اسمبلی کے سیکرٹری کا اغوا ہماری قومی تاریخ کا ایک ایسا المناک، سنگین اور عبرت آموز واقعہ ہے کہ جس نے ایک طرف تو مقتدر، زور آوروں اور قانون کو بے بس کر دینے والوں کا شدید احساس دلایا اور دوسری طرف آئین، قانون، انصاف اور جمہوریت کا گریبان تار تار اور منہ لال کر دیا۔ دن دیہاڑے اور جیتے جاگتے ایک کلیدی سرکاری عہدے دار کا یوں اغوا ہو جانا اور ایک مخصوص مدت تک لاپتہ رہنا ہمارے قانونی نظام، عدالتی ڈھانچے اور انصاف پر عمل درآمد کرانے والے اداروں اور بے بس عوام کے منہ پر ایک ایسے طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کا نشان گہرا، انمٹ اور دیر پا ہے۔

نیک پروین کے اغوا کے اس ڈرامے سے چوروں کی سینہ زوری، بے شرمی اور نیت آشکارا ہو گئی، ریاست اور قوم کو کھلا چیلنج موصول ہو گیا کہ ایک طبقہ بہرحال ایسا ہے کہ جو ہر طرح کے قانون سے بالاتر ہے۔ کچھ افراد ایسے ہیں کہ جن پر کوئی قانون نافذ نہیں ہوتا ہے۔

عدلیہ' انصاف' اداروں اور قانون کی بے بسی کا جس قدر اظہار اس واقعہ سے ہوا اسے عوامی اور قومی سطح پر انتہائی سنجیدگی سے محسوس کیا گیا۔

جن معاشروں میں قانون شکنی کا رجحان فروغ پذیر ہو وہاں اشرافیہ کے ایسے واقعات جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اغواء کیوں ہوا' کیسے ہوا اور کس نے کرایا' اغوا کرنے اور کرانے والوں کے گریبانوں تک کوئی ہاتھ نہ پہنچ سکا' کوئی انگلی نہ اٹھی' نہ انہیں کسی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑا' نہ کوئی فرد جرم عائد ہوئی' نہ سوال' نہ جواب' نہ حساب' نہ کتاب' عدالتیں بے بس' منصف لب بستہ' عوام تالیاں مار' قانون نافذ کرنے والے شریک جرم اور فرد جرم عائد کرنے والے شریک کار' پوچھ گچھ ہو تو کس سے ہو' جانچ پڑتال' سچ اور جھوٹ کرے تو کرے کون۔؟

جہاں مغوّی خود ہی پیش پیش ہو' رضا کارانہ ہو' اغوا کنندہ ہی اغوا کار ہو' مال منہ بند اور غیرت مبّرا ہو' عزت نفس' حمیت اور اپنے منصب کا خود ہی وقار کش ہو تو اس کے اغوا کو روکتا بھی کون' نیک پروین کے اغوا میں ہمیشہ سے زبردستی کم اور رضامندی زیادہ ہوتی ہے۔

سیکریٹری پنجاب اسمبلی حبیب اللہ گورایا چاہتے تو اپنے اغوا میں خود بھی رکاوٹ ڈال سکتے تھے۔ کسی وقت بھی باریاب ہو سکتے تھے۔ منظر عام پر آسکتے تھے حق کو الم نشرح اور انصاف کا بول بالا کر سکتے تھے۔ مگر مک مکا کے مارے ہوئے اور مفادات کے ڈسے ہوئے عہدیداروں پر جب بھی آزمائش کی گھڑی اور سرخ رو ہونے کی ساعت آئی تو یہ لوگ منہ کے بل اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھوں میں گرے' جیسے ناپاک' نجس اور موٹی گردن والے جانور بھاگتے ہوئے اپنے راستے میں آنے والے گڑھوں کو دیکھ نہیں سکتے اور ان میں گرتے رہتے ہیں۔

اس اغوا کم اور ڈرامائی' دھاندلی اور بے شرمی زیادہ کے واقعہ نے قانون کی لاقانونیت اور انصاف کا بودا پن ظاہر کر دیا' اغوا برائے تاوان کے مجرموں نے زور پکڑا ان کی ہمت بندھ گئی اور باچھیں کھل گئیں' اپنے بھائی بندوں کو سرکاری' حکومتی اور اعلیٰ و اشرافیہ قومی حلقوں میں یوں سرگرم عمل دیکھ کر انہیں اپنے کمتر درجے کے جرائم پر شرمساری ہونے لگی انہیں اندازہ ہو گیا کہ اصل جرم اغوا کرنا نہیں ہے بلکہ قانون کی کلائی مروڑنے کی صلاحیت کا نہ ہونا زیادہ بڑا جرم ہے' بلکہ اصل جرم ہے۔

یہ کیسے ممکن ہوا' کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اتنے بڑے سرکاری عہدے دار کا یوں اغوا ہو جائے یا وہ قومی تاریخ کے انتہائی حساس لمحے میں خود روپوش ہو جائے اور آج تک اس انتہائی اہم واقعہ اور سنگین جرم پر پردہ ہی پڑا رہے اس اہم سرکاری عہدے دار کو سچ بولنے پر مجبور نہ کیا جا سکے اس سے یہ پوچھنے والا ہی کوئی نہ ہو کہ سنجیدہ فرائض منصبی میں اس ڈرامائی کارگزاری کی گنجائش ہی کہاں تھی آلہ کار بننے اور اس قدر اعلیٰ کارکردگی دکھانے کا اختیار کس ضابطے اور کس قاعدے قانون سے حاصل کیا گیا۔

قوموں کی تاریخ میں کچھ واقعات بظاہر اس قدر اہم اور سنگین نظر نہیں آتے ہیں مگر ان کے اثرات دیرپا اور شدید ہوتے ہیں' سیکرٹری صاحب کے اغوا کے اس واقع نے نہ صرف متعلقہ افراد کے منہ پر ایسی کالک مل دی ہے کہ جسے دھو دیئے جانے کی ہر کوشش مزید گہرا کر دیتی ہے بلکہ اس واقعے نے اشرافیہ کے گھناؤنے سیاسی داؤ پیچ' منہ مہارت اور جرائم پسند طینت کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔

تابوت میں پہلی اور آخری کیل

ہماری قومی تاریخ میں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ' مک مکا' مصالحت مجرموں اور سازشیوں کی پردہ پوشی اور عوام کی بے حسی کے تابوت میں پہلی اور آخری کیل کی طرح مضبوطی سے گڑی ہوئی ہے۔ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کا مخفی رکھا جانا ہماری تاریخ کا ایک ایسا بدنما حوالہ' بے حسی کی علامت اور تاریک ترین پہلو ہے کہ اقوام عالم میں اور قوموں کی تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی ہے۔

ریاست' قوم اور وطن کی مٹی کے خلاف کئے گئے جرم' بدعہدی اور سازش سے بڑا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ ملک کوئی بھی ہو' قوم کیسی بھی ہو' ریاست کے خلاف جرائم پر ہر جگہ اور ہمیشہ سے سنگین سزائیں مقرر ہیں۔ انسانی ترقی، ذہنی آزادی، بنیادی حقوق، جمہوریت اور آزادی افکار کے رولے نے بھی صدیوں پرانی اس تعزیر پر بال برابر فرق نہیں ڈالا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے۔ ہمارے ہاں حکومت کے خلاف سازش پر تو سزائیں مقرر ہیں، راولپنڈی سازش کیس اٹک سازش اور فلانا سازش

کیس، سازشوں کے ان واقعات کی بڑی سرگرمی سے تفتیش ہوتی ہے، مقدمے چلائے جاتے ہیں، سزائیں دی جاتی ہیں مگر ملک یتیم، مال غنیم کے مصداق مملکت پاکستان کے خلاف جرائم اور سازشوں پر نہ کسی کو سزا ملتی ہے اور نہ مقدمہ قائم کیا جاتا ہے بلکہ اندر ہی اندر مک مکا اور پردہ پوشی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ ریاست کے خلاف جرائم اور سازشوں پر پردہ تان دیا جاتا ہے۔ مقتدر طبقے صورت حال سے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ وہ غداروں اور سازشیوں کو تحفظ دے کر اور اپنی پناہ میں لے کر اپنے آپ کو محفوظ اور اپنے اقتدار کو محفوظ ترین سمجھنے لگتے ہیں۔ اصول بقائے باہمی اور امریکی اصطلاح میں YOU WATCH MY BACK, I WATCH YOURS کے فارمولے پر کاربند ہو جاتے ہیں۔ آج میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں تاکہ کل کو مجھے بھی چھوڑا جا سکے۔ میں نے تمہیں تحفظ دیا تاکہ کل مجھے بھی تحفظ مل سکے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ مجھ پر بھی آنکھیں بند رکھی جائیں۔ میں نے تمہارے جرائم سب سے چھپائے، تم بھی ایسے ہی کرنا۔

آدھا ملک جاتا رہا بلکہ اکثریتی حصہ جدا ہو گیا۔ ملک توڑنے والے چہرے اور ہاتھ سب نے دیکھے، سب جانتے ہیں مگر بقائے باہمی اور اصول تحفظ کے تحت کسی ایک فرد واحد کو ایک لمحے کی بھی سزا نہیں دی جا سکی۔ آخر کیوں؟

یوں تو ہمارے ملک میں بڑی بڑی تنظیمیں قائم ہیں، فورم بنے ہوئے ہیں۔ انسانی حقوق کے چیمپئن حق تلفیوں کی کھوج میں غیر ملکی سفارتخانوں سے مال اور ڈنر دونوں کھا جاتے ہیں، وکلاء کی بار کونسلز ہیں۔ خود بہ خود نوٹس لے لینے والے صاحب ضمیر منصف موجود ہیں۔ زنخوں اور کنجریوں کے تحفظ کی انجمن موجود ہے، سوداگروں اور آڑھتیوں کے حقوق کے لئے پلیٹ

فارم بنے ہوئے ہیں' بلیک مارکیٹ میں کرنسی کا کاروبار کرنے والوں کی کرنسی ڈیلرز ایسوسی ایشن ہے۔ پلاٹ اور فلیٹ کے نام پر رقم ہتھیانے والے فراڈیوں کی سوسائٹی قائم ہے اور سب سے بڑھ کر جوشیلے' منہ زور اور محب وطن عوام ہیں' جو ہر دو چار سال بعد محض اپنے جلوسوں کے زور پر حکومت بدلنے پر قادر ہیں' اپنے مطالبے منوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بجز تحفظ ریاست' شرف مملکت اور حرمت پاکستان یہاں کونسی انجمن کونسی سوسائٹی اور کونسا گھپلا موجود نہیں ہے۔ ؟

یہ بات یا تو انتہائی بے حسی کی ہے یا شدید حیرانی کی کہ کبھی کوئی ایسا جلوس نکلا نہ کوئی ایسی موثر آواز اٹھی جو حکومتوں کو یہ رپورٹ شائع کرنے پر مجبور کر سکتی خود بہ خود نوٹس لے لینے والے منصف لب بستہ اور وکلاء کی بار کونسلز خاموش۔ اس بارے میں نہ کبھی طلباء نے ہڑتال کی' نہ اساتذہ نے واک آوٹ کیا' نہ کسی اسمبلی کو یہ توفیق ہوئی کہ کوئی قرار داد پیش اور پاس کرے بلکہ اس بارے میں پس وپیش ہی ہوتی رہی ہے۔ قومی یا انفرادی سطح پر ایک بھی ایسی موثر آواز سنائی نہ دی' جو اس بات کا سنجیدگی سے مطالبہ کرتی کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت تک پہیہ جام اور ٹریفک معطل رہے گی۔ کاروبار نہیں ہونے دیں گے۔ قلم چھوڑ اور ہاتھ باندھ دیئے جائیں گے۔

طرح طرح کی تنظیموں اور موثر آوازوں میں کوئی نہ کوئی آواز مملکت پاکستان کے حق میں اور مفاد میں بھی ہونی چاہیئے تھی۔ کسی نہ کسی کو سنجیدگی سے وطن توڑنے والے سازشیوں کو بے نقاب کرنے کا نعرۂ حق بلند کرنا چاہیئے تھا۔

جو ملک اس قدر لبرل ہو کہ وہاں ہیجڑوں اور ناچنے والیوں سے لے کر

سمگلروں تک کے حقوق محفوظ ہوں' اسی ملک میں ریاست اپنے ہونے کے شرف سے شرمندہ' توڑ دیئے جانے سے لہولہان اور اپنی بے ثباتی پہ نوحہ کناں اور آزردہ ہو تو یہ بڑا ناقابل معافی جرم اور ناقابل تلافی المیہ ہے۔

آخر ہم یہ کیوں نہیں جاننا چاہتے کہ ملک توڑنے میں کون کون شریک تھا اور اگر واقعی یہ جاننا چاہتے ہیں تو پھر بھلا کونسی حکومت' کونسا طبقہ اور کس کا مارشل لاء اس انکشاف کی راہ میں مزاحم ہو سکتا ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے اخفا میں حکومتوں کے مفادات سے زیادہ ہماری اپنی بے حسی اور لاپروائی شامل ہے۔

حمودالرحمن کمیشن رپورٹ کو مسلسل مخفی رکھنے سے قوم اور معاشرے پر طرح طرح کے منفی اثرات مرتب ہوئے اور منقش ہو گئے ہمارے ملک کو درپیش موجودہ داخلی استحکام اور قومی سلامتی کے مسائل کی بنیادوں میں اس رپورٹ کو دبائے رکھنے کی بدنیتی اور اس کی سزا بھی شامل ہے۔ اگر شروع ہی میں اس رپورٹ میں نامزد قومی مجرموں کو سنگین سزائیں دے دی جاتیں تو آج اسلام آباد میں غیروں کے لہجے میں گفتگو کرنے والے وطن دشمن بالشتیئے اور علیحدگی پسند سنپولیئے یوں سرعام اپنے ہی ملک کے خلاف ریلیاں نہ نکال رہے ہوتے' زبانیں دراز نہ کرتے اور لہجے قابو میں رکھتے۔

اس رپورٹ کی اشاعت نہ ہونے سے نہ صرف سیاسی طالع آزما مستفید ہوئے بلکہ فوجی مہم جوؤں کے بھی حوصلے بڑھے' جن گردنوں کو کھنچے جانے کا خطرہ لاحق تھا' رپورٹ کی اشاعت رکتے ہی وہی گردنیں الف ایستادہ ہو گئیں اور جن گردنوں کو کھینچا گیا' وہ اس افتاد سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ ریاست کے خلاف شدید نوعیت کے قومی مجرموں کی پردہ پوشی سے وطن دشمن اور علیحدگی پسند عناصر کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور ان حلقوں میں کم ازکم تین مختلف

قسم کے منفی اثرات شدت سے مرتب ہوئے۔

1۔ جس ملک میں ریاست کے دشمنوں اور وطن توڑ دینے والے مجرموں تک کا مواخذہ مفقود ہو' وہاں نسبتاً چھوٹے موٹے جرائم جو فرد اور معاشرے کے خلاف ہوں جیسے بنک لوٹو' کمیشن لو' خرد برد' بم پھینک دو' تخریب کاری' دہشت گردی اور اغواء برائے تاوان کے مجرموں کو بھلا کیا سزا دی جا سکتی ہے؟ یہ بھی کوئی جرم ہیں' واقعی ریاست کے خلاف جرائم کے مقابلے میں دیگر جرائم معمولی نوعیت کے ہیں اور جبکہ ملک کا جغرافیہ بدل دینے والوں کو کچھ بھی نہیں کہا جا سکا' بلکہ ان کی پردہ پوشی کی گئی' تحفظ دیا گیا اور مراعات بڑھا دی گئیں' تو ان معمولی جرائم میں ملوث افراد کو کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیا سزا دی جا سکتی ہے؟ اور حقیقتاً" ہو بھی ایسا ہی رہا ہے۔

پہلا پتھر مارنے والے کے لئے باوضو رہنے والے کی شرط آج بھی عائد ہے' ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب ہمیں مستقلاً" باوضو رہنے والا میسر نہیں ہے۔ سو سنگسار کرے تو کون کرے اور پتھر مارے تو مارے کون؟

2۔ ریاست پر حکومت کو ترجیح' تصرف اور اولیت حاصل ہے۔ حکومت بچانے اور بنانے کے لئے جغرافیہ بدلا جا سکتا ہے' سرحدیں توڑی جا سکتی ہیں' آئین میں ترمیم کی جا سکتی ہے' منسوخ کیا جا سکتا ہے لیکن حکومت کے خلاف اونچا سانس لینے کی' تنقیدی رویے کی اور سچ کہنے کی روایت نہیں ہے اور جو ایسا کرے گا اس کی مٹی پلید ہو سکتی ہے' اسے بھینسوں کی چوری

میں ملوث کیا جا سکتا ہے' سرکاری ٹریکٹرز کے ناجائز استعمال کا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اہل و عیال تھانے میں اور آبرو داؤ پہ لگ سکتی ہے۔ پچھلے عشرے کے انکم ٹیکس گوشواروں کی دوبارہ پڑتال شروع کی جا سکتی ہے' تعلیمی اسناد کو جعلی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پانی کی سپلائی لائن اور بجلی کا کنکشن کاٹا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ریاست کے خلاف جرائم پر تو حکومت وقت سے مک مکا اور مصالحت کی گنجائش موجود ہے لیکن حکومت کے خلاف اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

3۔ ریاست کے خلاف سب کے سب ایک' متحدہ اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایستادہ ہیں۔ اس بارے میں سب بھائی بھائی ہیں سبھی بھائی بند ہیں۔ اس ضمن میں دائیں بائیں' سویلین' فوجی' نیم فوجی' نیم پاگل' جسمانی معذور' عقل کے اندھے' دماغ کے کوڑھی' سرطان سوچ' چلتر' اسلام پسند' اسلامیئے' اشرافیئے' قطب لاٹ' طوطا گروپ' انقلابیئے' جاگیرمار اور صنعت اجاڑ کی کوئی قید نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے ریاست کے خلاف مصافحے اور معانقے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

جب بھی ریاست' قوم اور نظریے کے خلاف گٹھ جوڑ کا وقت آتا ہے۔ بڑے بڑے مخالفین شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پہ نفرین اور تبرّے بھیجنے والوں میں ریاست کے خلاف مفادات پر تحفظ کی قدر مشترک ہے

حمود الرحمٰن کمیشن کے کھٹ راگ کا اہتمام تو بھٹو صاحب نے کر لیا لیکن جوں جوں کمیشن کا دائرہ کار بڑھتا گیا اور مجرموں کی نشان دہی ہوتی گئی ذوالفقار علی

بھٹو پریشان ہوتے گئے کہ وہ کس کس کو بچائیں گے اور اگر سب کو رپورٹ کے گلوٹین تلے آجانے دیں تو پھر انہیں کون بچائے گا۔ وہ اول الذکر کے وہم میں مبتلا رہے اور آخر الذکر کے گمان میں مارے گئے۔

جیسا کہ بھٹو صاحب کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہ فوج کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ وہ جرنیلوں کی نااہلی' جاہ پسندی اور سازشوں سے باخبر تھے تو اس مفروضے کے پیش نظر بھی انہیں اس رپورٹ کو ضرور مشتہر کر دینا چاہئے تھا' نہ کہ وہ اس پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کس کو بچا رہے تھے۔ کس کو تحفظ دے رہے تھے۔ کس کی پردہ داری مقصود تھی۔ ؟

افواج پاکستان کی .... نہیں

جرنیلوں کی .... نہیں

سیاستدانوں کی .... نہیں

بیوروکریسی کی .... نہیں

عمومی طور پر وہ ان سب حلقوں کے خلاف وقتاً فوقتاً صف آرا رہے اور اپنے مزاج کی اُفتاد کے سبب بھی کسی کو بے آبرو کرنے اور مخالفین کے کپڑے اتارنے میں انہوں نے کبھی تامل نہ کیا۔

ہمارے حکمرانوں کی مجرموں کو تحفظ دینے کی روایتی مجبوری کے سوا بظاہر بھٹو صاحب کی کوئی اور ایسی مجبوری نہیں تھی کہ وہ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کی اشاعت کے آڑے آجاتے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بعد جنرل ضیاء الحق کا اندھیرا پھیلا۔ یہ دونوں افراد ہر طرح سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک اسلام پسند اور اسلامیہ' دوسرا انقلاب پسند اور انقلابیہ لیکن دونوں جعلی اور اپنے اپنے آدرشوں میں غیر پختہ' نظریوں سے غیر مخلص اور نظریات کے شیر۔ ایک کا حلقہ نیابت افواج پاکستان

اور زکوۃ کمیٹیاں دوسرے کا ٹارگٹ جرنیل اور مولوی ملوانے۔ ایک تحمل مزاج سازشی' دوسرا تھڑ دلا جذباتی' ایک کے پیٹ میں داڑھی اور دوسرا مونچھوں سے بھی بے نیاز' حتیٰ کہ ایک کی موت دوسرے کی زندگی' لیکن اس شدید تضاد کے باوجود دونوں میں ایک قدر مشترک ضرور تھی یعنی حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ

یہ تحقیق ضرور ہونی چاہئے کہ آخر اس رپورٹ میں ایسی کونسی بات ہے کہ جو ہر ایک کے لئے یکساں اکسیر کا کام دیتی ہے۔ بھٹو صاحب رپورٹ کو مخفی رکھ کر جن عناصر کی پشت پناہی کر رہے تھے' جنرل ضیاالحق نے بھی ہو بہو ویسا ہی کیا بلکہ زیادہ سرگرمی سے اور بے شرمی سے کیا جب دو افراد بالکل مختلف نظریوں کے حامل' مختلف طبقوں کے نمائندے اور مختلف سوچ رکھتے ہوں تو ان کے پشت پناہ ایک ہی کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب جس طبقے اور جن عناصر کی گردن حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کی آری سے بچانا چاہتے تھے یہی حلقے اور عناصر جنرل ضیاء الحق کی بھی مجبوری اور مونچھ کا بال ثابت ہوئے۔ آخر جنرل صاحب کو کس کی پردہ داری مقصود تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی .... نہیں

سیاستدانوں کی .... نہیں

شکست خوردہ جرنیلوں کی .... نہیں

جنرل ضیاء الحق ان سب کے خلاف برسرپیکار تھے لیکن رپورٹ شائع نہ ہونے دینے کی مجبوری ان کی بھی وہی تھی' جو ذوالفقار علی بھٹو کی تھی

قومی مجرموں سے مک مکا' مصالحت' پردہ پوشی اور تحفظ دینے کی روایت سے اِنحراف کا حوصلہ جنرل صاحب میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ یوں تو وہ جرأت مند آدمی اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے انہوں نے سینکڑوں قتل

ناموں پر مسکراتے ہوئے دستخط کئے۔ جمی کارٹر پر پھبتیاں کسیں' سائیکل مظاہرہ کیا امریکہ سے مال بٹورا۔ آئین کے پرخچے اور جیالوں کی کھال ادھیڑ دی' افغانی ابتلا کے دوران وہاں سے بھاگ کر جان بچانے والے افغانی لیڈروں کو اسلام آباد میں کئی کئی کنال کے بنگلے عطا فرمائے لیکن حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ میں نامزد مجرموں کے سامنے وہ بھی سرنگوں رویہ ہی اپنائے رہے۔

مجرمانہ مفادات کے تحفظ اور تحفظاتی مفادات کے لئے بھٹو صاحب اور جنرل ضیاالحق کی خدمات یکساں اور گراں قدر ہیں۔ دونوں نے ان عناصر کی سرپرستی کی کہ جنہیں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں قابل گردن زدنی ٹھہرایا گیا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کے بعد قومی مجرموں کے لئے محترمہ بے نظیر بھٹو بھی ان کی ان داتا ثابت ہوئیں حالانکہ محترمہ بے نظیر بھٹو' جنرل ضیاء الحق کی مخالفت میں بھٹو صاحب سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں اور طرز عمل میں بھی قطعی مختلف تھیں۔ یوں تو محترمہ کو جنرل صاحب کے ڈراؤنے خواب آتے اور وہ سوتے سوتے ہڑ بڑا کر کھڑی ہو جاتیں۔ جنرل ضیاء الحق سے نفرت' انتقام اور دشمنی کے جذبات کو وہ کبھی نہ چھپا سکیں لیکن حمودالرحمن کمیشن رپورٹ پر سانپ بن کر بیٹھے رہنے میں وہ اپنے پیش رو سے ذرا بھی مختلف نہیں تھیں۔ اس شدید مخالفت اور مخاصمت' جو محترمہ اور جنرل صاحب کے درمیان موجود تھی' کے باوجود یہ بڑی دلچسپ اور حیران کن بات ہے کہ رپورٹ کے اخفا میں دونوں ایک دوسرے کے ہم نفس' ہم خیال اور اندر سے ایک ثابت ہوئے۔

اب یہی حال میاں محمد نواز شریف کا ہے۔ انہیں یوں تو محترمہ کی ہر پالیسی سے اختلاف ہے۔ وہ ہر اس چیز کے خلاف ہیں کہ جسے محترمہ کی آشیر

باد حاصل تھی' بجز حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو دبائے رکھنے کے۔

یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک دوسرے کے شدید مخالف حکمرانوں کا رویہ اس رپورٹ کے بارے میں یکساں ہے۔ سب کے سب اس رپورٹ کو مخفی رکھنے میں سرگرم ہیں۔ سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ آخر وہ کون ہیں کہ جن کے مفادات اور جن کے تحفظ میں سب شریک ہیں اور ایک دوسرے کے شریک کار ہیں۔ سب اندر سے ایک ہیں' بچائے جانے والے اور بچانے والے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے' ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی جرم کی دو مختلف صورتیں ہیں ان میں ہمارے رہنما ہیں' مومنین ہیں' ہمارے ان داتا ہیں اور ہمارے لیڈر ہیں۔

وطن توڑنے والوں سے درگزر کرنے والے
ریاست کے خلاف جرائم پر چپ رہنے والے
مجرموں کی سرپرستی کرنے والے
بقائے باہمی پر آمادہ وکاربند

YOU WATCH MY BACK, I WATCH YOURS

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اب محض سقوط مشرقی پاکستان اور علیحدگی کی سازش کی رپورٹ ہی نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس رپورٹ سے اب ایک اور بڑی سازش بھی وابستہ ہو گئی ہے' جو کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے ذمہ دار عناصر کے مکروہ چہروں کو جاننے سے بھی زیادہ اہم بن چکی ہے۔

ہماری طرح عوام کی اکثریت اب اس سازش در سازش کو جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے کہ جس سازش کے تحت اس رپورٹ کو دبائے رکھا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو چھپائے رکھنے میں کس ئ کے کیا مقاصد اور کیا کیا مفادات تھے ؟ رپورٹ کو دبائے رکھنے میں کس نے کیا کردار ادا کیا اور اسے مخفی رکھنے

میں کون کس قدر مجرم ہے؟ کس کس کی پردہ داری مقصود تھی اور یہ پردہ رکھنے کی کس نے کیا قیمت لی؟ کون کتنے میں بکا اور کس کے ہاتھوں بکا؟ کیا کیا فائدے اٹھائے گئے اور عوام کے خلاف اس راز داری کی کالک سے کس کا چہرہ اور کس کس کے ہاتھ لتھڑے ہوئے ہیں۔

ان بدنما چہروں اور کالے ہاتھوں کو جاننا بھی اسی قدر ضروری ہو گیا ہے کہ جس قدر سانحہ مشرقی پاکستان کے اصل سازشی مجرموں کو جاننا ضروری ہے۔

جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کا حقائق نامہ افسانوی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے' یہ سارا المیہ ایسی بے ضرر کہانی کی طرح ختم ہوتا جا رہا ہے کہ جس کے ہونے نہ ہونے' جاننے نہ جاننے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کی بھی اس میں دلچسپی نہیں ہے' حالانکہ فرق پڑتا ہے۔

اپنی ہی تاریخ سے منہ موڑے رکھنے والی قوموں اور المیوں پر آنکھیں موندے رکھنے والوں کو کبھی کسی نے معاف نہیں کیا۔ ہمیں بھی نہیں کیا جائے گا۔

حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کے بارے میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں' حقائق کم اور قیاس قیافے زیادہ' یہ ایسا دل آزار موضوع اور ایسی سیاہ بخت رپورٹ ہے کہ اس سے کچھ بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو بھی اس رپورٹ میں پرویا جا سکتا ہے' چونکہ نہ کوئی اس کی تردید کرنے والا ہے' نہ تصدیق' کوئی ذمہ دار ہے اور نہ ہی کوئی ذمہ داری سے مبّرا' بے حسی اور لاچارگی کی سی کیفیت ہے کہ رپورٹ کا موضوع جس قدر سنجیدہ' حساس اور قومی نوعیت کا ہے' اس پر اسی قدر بے حسی' غیرذمہ داری

اور ذاتی صوابدید کی کالک مل دی گئی ہے۔

کیا ذوالفقار علی بھٹو' جنرل ضیاء الحق' محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو آئینی' قانونی اور اخلاقی طور پر واقعی کوئی ایسا اختیار حاصل تھا کہ جس کی وجہ سے ان سربراہوں نے اس رپورٹ کو اشاعت سے روکے رکھا اور اگر نہیں تھا تو اس بارے میں کوئی داد فریاد' کوئی چارہ گوئی' کوئی حیلہ حجت' کوئی رٹ پٹیشن' کوئی اٹ کھڑکا' کوئی ہلا گلا کبھی بھی کچھ نہ ہوا حالانکہ ہونا چاہیئے تھا۔

جرائم میں ملّوث مجرموں کو تحفظ دینے کی پلیدگی کو قومی سلامتی و مفادات اور پرسنل جج منٹ کی چادر سے ڈھانپنا بذات خود سنگین جرم ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے بارے میں کئی تضادات کے باوجود السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی اشاعت بتاریخ 23 اکتوبر 1988ء جسے بعد میں لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی نے اپنی کتاب بھٹو' ضیاء اور میں' میں بھی نقل کیا اور اس رپورٹ کے بارے میں اپنی کارگزاری بھی لکھی۔ حمودالرحمٰن رپورٹ کے بارے میں یہ دونوں حوالے باقی تمام قیافوں اور افواہوں سے قدرے مستند اور قرین قیاس ہونے کے باوجود حرف بہ حرف سچ نہیں ہیں کیونکہ ان دونوں حوالوں میں جن ملزموں کو نامزد کیا گیا ہے' وہ سب کے سب ہماری آرمی کے جرنیل ہیں۔ حالانکہ پاکستان توڑنے کے گناہ میں جرنیلوں کے علاوہ سویلین' سیاستدان' بیورو کریسی' عوام کے منتخب نمائندے اور جانے کون کون شامل ہے؟ صرف جرنیلوں پر یہ سارا بوجھ ڈال دینا انصاف نہیں ہے۔

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نے اپنی اس مذکورہ اشاعت میں لکھا ہے کہ

"16 سال تک حکومت پاکستان 1971ء کی جنگ میں شکست کے اصلی

اسباب کی اپنی قوم سے پردہ پوشی کرتی رہی۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اس کی اشاعت سے ملک وقوم کا ڈھانچہ چکنا چور ہو جائے گا۔ ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مقیم واشنگٹن جے این پریمو نے ایک ایسی رپورٹ کا انکشاف کیا ہے' جسے ذوالفقار علی بھٹو نے تیار کرایا تھا' جس میں یہ دکھلا گیا ہے کہ ایک بداخلاق فوجی قیادت نے کس طرح پاکستانی قوم کے ساتھ دغا کی۔

حمودالرحمٰن کمیشن نے 283 افراد کی شہادتیں قلم بند کیں' جن میں سے بیشتر اعلیٰ فوجی افسر اور رہا ہونے والے جنگی قیدی تھے۔ کمیشن نے اپنی ابتدائی رپورٹ جولائی 1972ء میں اور حتمی رپورٹ نومبر 1974ء میں پیش کی۔ بھٹو صاحب نے اس کا مطالعہ کرتے ہی حکم دیا کہ اس رپورٹ کی تمام نقول ضائع کر دی جائیں۔ تاہم انہوں نے اس کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لی' جو اطلاعات کے مطابق انہوں نے اپنے بستر میں گدے کے نیچے چھپا دی تھی۔ 1978ء میں جب ضیاء کے آدمیوں نے المرتضیٰ کی تلاشی لی تو انہیں ان کے بستر کے نیچے سے رپورٹ کی اکلوتی نقل مل گئی۔

اس رپورٹ میں فوجی کمانڈروں کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی گئی تھی۔ ان میں سے چند تو جنرل ضیاء کے حواریوں میں شامل ہو گئے تھے۔ کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ افواج پاکستان کے کمانڈروں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں نے خود اپنے ہی عوام کو دھوکے دیئے۔ اس رپورٹ کی ایک عکسی نقل پوشیدہ طور پر پاکستان سے باہر لائی گئی۔

کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ایوب خان سے زبردستی اقتدار چھیننے اور 1970ء کے انتخابات میں بدعنوانی کے جرم میں اس وقت کے صدر یحییٰ خان' جنرل عبدالحمید خان' لیفٹیننٹ جنرل ایس جی پیرزادہ' لیفٹیننٹ جنرل گل حسن' میجر جنرل عمر اور جنرل مٹھا کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

کمیشن کی سفارشات میں شامل تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے۔ کے نیازی' میجر جنرل ایم رحیم خان' میجر جنرل محمد جمشید' بریگیڈیئر جی ایم باقر صدیقی' بریگیڈیئر محمد حیات' بریگیڈیئر محمد اسلم نیازی سب کا کورٹ مارشل کیا جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی درج تھا کہ جنرل یحییٰ خان' جنرل عبدالحمید خان اور میجر جنرل خداداد خان کے خلاف بداخلاقی' شراب نوشی اور بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کے الزامات کی باقاعدہ تفتیش کی جائے۔ کیوں کہ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اخلاق سے گری ہوئی حرکتوں کی وجہ سے ان میں قوت فیصلہ کی کمی' بزدلی' اور پیشہ ورانہ نااہلیت پیدا ہو گئی تھی۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے کے نیازی اور دیگر افسران کے خلاف اس الزام کی تفتیش کی جائے کہ وہ ملکی دفاع کی منصوبہ بندی کرنے کے بجائے' دولت سمیٹنے' جائیدادیں لوٹنے اور خواتین کے ساتھ بدکاری کرنے میں مصروف رہے۔

رپورٹ میں یہ دِلخراش واقعہ بھی درج ہے کہ 12 دسمبر کی رات میں مقبول پور کے محاذ پرجب فوجوں پر ہندوستانی توپیں گولے برسا رہی تھیں بریگیڈیئر ہدایت اللہ چند اخلاق باختہ خواتین کے ساتھ اپنے بنکر میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔

ایک اور قابل مذمت حرکت کے خلاف آج تک کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک جنرل صاحب' چند نرسیں' اور اپنے اے ڈی سی کو بے یارومددگار چھوڑ کر ہیلی کاپٹر میں تنہا بھاگ آئے۔ بعد میں دشمن نے نرسوں کو گرفتار کر کے ان کے ساتھ بداخلاقی کی اور اے ڈی سی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پاکستانی فوج کے متعدد افسروں کے سر ندامت سے جھک گئے جب اسی جنرل کو جنرل ضیاء نے دفاع کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ یہ

جنرل جس کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا جنرل ضیاء کی براہ راست ماتحتی میں فوج کی تمام سطحوں پر سیاہ وسفید کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ فوج کے بہت سے افسروں کی یہ رائے تھی کہ کم ازکم چار سینئر جرنیلوں (جنرل اقبال' جنرل سوار' جنرل رحیم الدین اور جنرل عارف) کو اس ضمن میں مزاحمت کرنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ سب خاموش رہے کہ کہیں جنرل ضیاء ناراض نہ ہو جائیں۔

رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ 16 ڈویژن کے جی او سی میجر جنرل نذر حسین شاہ' 9 ڈویژن کے جی او سی میجر جنرل ایم ایچ انصاری' مشرقی کمان کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر باقر صدیقی کی شہادتوں کے مطابق سات سینئر افسروں نے لوٹ مار سے اپنے ہاتھ خوب رنگے۔ انہوں نے سراج گنج کے سرکاری خزانہ یعنی نیشنل بنک سے مبلغ ایک کروڑ 35 لاکھ روپے کی رقم ہضم کرلی۔

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر بھٹو صاحب نے اس رپورٹ پر عملدر آمد کیوں نہ کیا؟

یہ معلوم نہیں کہ اس کے بارے میں جنرل ٹکا خان کا علم کتنا تھا؟ وہ مارچ 1972ء سے لے کر 29 فروری 1976 تک فوج کے سربراہ رہے۔ جنگی قیدیوں کے تمام معاملات پر انہوں نے ہی فیصلے دیئے۔ وہ افسر جو جنگی قیدی بنا لئے گئے تھے' ان کی رپورٹیں میرے ہی ذریعہ سے COAS تک پہنچی تھیں۔ طریق کار یہ تھا کہ رپورٹس ایڈجوٹنٹ جنرل' میجر جنرل اے قریشی تیار کرتے اور اس وقت کے ملٹری سیکرٹری یعنی میری سفارشات کے ساتھ CO AS کی خدمت میں پیش کی جاتیں۔ ایڈ جوٹنٹ جنرل میجر جنرل قریشی اس سلسلے میں کتنا جانتے ہیں۔ ان رپورٹوں میں چند مجرم افسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے جان بوجھ کر کتنی تبدیلیاں کی گئیں؟ میں اس مرحلے پر کچھ نہ کہنا ہی

بہتر خیال کرتا ہوں۔ میں نے فوج کے اقتدار سنبھالتے ہی 1977ء سے اس رپورٹ کی اشاعت پر اصرار شروع کر دیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ امر باعث ندامت ہے کہ جنرل ضیاء نے اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کی اس کی اشاعت بھی نہیں کی۔ ہماری فکری دیانت کا یہ تقاضا ہے کہ اس رپورٹ کو آج بھی شائع کر دیا جائے۔ خیال تھا کہ محترمہ بے نظیر صاحبہ وزیراعظم کے طور پر ایسا کر دیں گی مگر وہ بھی ہوس اقتدار میں مات کھا گئیں۔

فوج کے اقتدار میں آنے کے بعد احتساب کے سوال نے پھر سر اٹھایا۔

اسے ایک ایسے اجلاس میں زیر بحث لایا گیا جس میں تمام کور کمانڈر' مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر شریک ہوئے۔ اس میں چند تجاویز بھی تیار کی گئیں۔ میں نے اپنی ملازمت کی پوری مدت میں احتساب کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ میں نے 1971ء کی جنگ میں خراب کارکردگی کی بنا پر متعدد افسروں اور جوانوں کا کورٹ مارشل بھی کرایا تھا۔ میں نے 1965ء میں بھی اعلیٰ افسروں کو اسی طرح تجویزیں دی تھیں جن پر عمل بھی ہوا۔ میں نے ایم ایل اے سے کہا کہ احتساب ہمیں اپنے گھر سے شروع کرنا چاہیئے۔ بقول ضیاء ہمارا حلقہ انتخاب یعنی فوج سے اس کا آغاز ہونا چاہیئے۔

ہر جنگ کے دوران ان ماتحت کمانڈروں کے خلاف ہم نے سخت رویہ اپنایا تھا جن کی چوکیاں دشمن کے قبضے میں چلی گئیں یا جنہوں نے بزدلی دکھلائی تھی۔ یہاں تو ملک کا پورا مشرقی بازو دشمن نے کاٹ دیا تھا اور ہم اسی کے ذمہ دار افسروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ جنرل یحییٰ خان پر صرف اسی ایک جرم میں مقدمہ چلایا جائے کہ پاکستان بری فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے وہ مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کر سکے۔

وہ بتائیں وہ مجرم ہیں یا نہیں۔ جنرل ضیاء نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور کہا کہ بہت اچھا خیال ہے کورٹ مارشل ہونا ہی چاہئے۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کورٹ مارشل کا صدر کون ہو گا۔ کیا کوئی چار ستاروں والا جنرل ہو گا۔ اس کا جواب نفی میں تھا کیونکہ تینوں مسلح افواج کے سربراہ اور چیئرمین آف دی جوائنٹ چیف آف سٹاف کے علاوہ اور کوئی چار ستاروں والا جنرل نہیں تھا۔ اس لئے کیا کسی لیفٹیننٹ جنرل کو کورٹ مارشل کا صدر بنا دیا جائے؟ آخر طویل بحث مباحثے کے بعد طے کیا گیا کہ جنرل یحییٰ کے کورٹ مارشل کا صدر کوئی میجر جنرل ہونا چاہئے۔ جنرل ضیاء نے کہا کہ میں خود کسی کو نامزد نہیں کروں گا۔ کوئی اس کام کی لئے رضاکارانہ طور پر آگے بڑھے۔ میجر جنرل فضل حق نے حامی بھری۔ جنرل ضیاء نے کہا کہ وہ چیف آف سٹاف میجر جنرل کے ایم عارف سے کہیں گے کہ وہ کورٹ مارشل کے لئے ضروری احکامات صادر کر دیں۔ لیکن دن گزرتے گئے اور کوئی احکامات جاری نہیں ہوئے۔ میں نے ضیاء صاحب سے پوچھا تو پتہ چلا کہ جنرل فضل حق اپنی بات سے پھر گئے ہیں میں نے کہا کہ کیا میں کورٹ مارشل کی صدارت کر لوں ؟ انہوں نے کہا اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ انہوں نے احکامات صادر کرنے کا وعدہ تو کر لیا مگر کوئی حکم جاری نہ ہوا۔ یہ جنرل ضیاء کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی تجویز کو رد نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ یہی کہتے کہ "یہ بہت عمدہ خیال ہے" لیکن جس کام کو وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ یہ جنرل ضیاء کی ایک ناقابل معافی حرکت تھی، جو فوج کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

کاش جنرل ضیاء نے وہ حکم جاری کر دیا ہوتا۔ یہ ملک کے لئے بہت مفید ہوتا۔ یہ درست ہے کہ جنرل یحییٰ انتقال کر چکے ہیں لیکن ان کی غیر موجودگی

میں بھی مقدمہ چلانے سے بہت سے مجرم بے نقاب ہو سکتے ہیں۔
(بھٹو ضیاء اور میں: فیض علی چشتی صفحہ 240 تا 243)

سرجی ہتھ ہولا

اس وقت اور آج کے دن تک امریکہ کی مختلف جیلوں میں ایک گورنر' ایک سینیٹر' تین کانگریس کے ممبر' اکیس جج' ایک سو بارہ اعلی وفاقی اہلکار' دو سو سے زائد ڈیوٹی مجسٹریٹ اور سینکڑوں پولیس آفیسرز مختلف المعیاد سزائیں کاٹ رہے ہیں لیکن جرائم ان سب کے کم وبیش یکساں ہیں اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال' اختیارات کا ناجائز فائدہ' رشوت' مالی فائدے اور حد سے تجاوز۔ یہی صورت حال کینیڈا' آسٹریلیا' جاپان اور کم وبیش ہراس مہذب ملک میں موجود ہے کہ جہاں رشوت شجر ممنوعہ ہے اور سرکاری حکام اور اہلکاروں پر اعتماد کیا جاتا ہے' پولیس' عدلیہ اور منتخب نمائندوں کی حد تجاوز پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے انہیں حقیقتاً" عوام کا خدمت گار اور محافظ سمجھا جاتا ہے۔ پورے معاشرے کا ان لوگوں پر اعتماد قائم ہے لیکن اس کے باوجود انسانی فطرت کی کجی عریاں ہو' ہو جاتی ہے جن لوگوں کو دیانتدار سمجھا جاتا ہے بد دیانت نکلتے ہیں' جن پر اعتماد کیا گیا انہوں نے ہی اعتماد توڑ دیا اور جن کے فرائض منصبی میں ذمہ داری کلید تھی وہی غیر ذمہ دار بن جاتے ہیں' اب

جب کہ ہماری صورت حال یہ ہے کہ ہمیں نہ تو اپنے منتخب نمائندوں پر گمان ہے کہ وہ بد دیانت نہیں ہوں گے نہ ہی سرکاری حکام' اہلکاروں' پولیس' عدلیہ اور انتظامیہ پر کوئی اعتبار کرتا ہے پورا معاشرہ اس یقین اور رائے پر یک آواز اور متفق ہے کہ یہ بد دیانت' راشی' خائن اور بکاؤ مال ہیں اور سچ بھی یہی ہے' بالکل ایسا ہی ہے' حقیقتاً یہ بڑے بد دیانت طبقے ہیں۔

جس طرح ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا نہیں ملے گا کہ جو راشی' بدنیت اور حرام خور نہ ہو اسی طرح ہماری جیلوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ملے گا جو پولیس' انتظامیہ' عدلیہ کا کارندہ ہو' منتخب نمائندہ ہو' سرکاری عمال ہو' اہلکار ہو۔ سوال یہ ہے کہ نہ تو ہم ان لوگوں کو دیانتدار سمجھتے ہیں نہ یہ دیانتدار ہیں یہ لوگ رشوت لیتے ہیں' فائدے اٹھاتے ہیں' لوٹ مار کرتے ہیں پکڑے بھی جاتے ہیں مگر یہ لوگ جیلوں میں نظر نہیں آتے آخر اپنے جرائم پر پکڑے جانے کے باوجود ان پر جیلیں اور سزائیں ممنوع کیوں ہیں۔ یہ لوگ کہاں چلے جاتے ہیں' جیلیں ان کے وجود سے کیوں رونق افروز نہیں ہیں جبکہ آئے دن یہ ہوتا رہتا ہے کہ تھانیدار ڈاکہ مارتے ہوئے شناخت کر لیا گیا اور ممبر صوبائی اسمبلی مع منشیات کے سرحد پار کرتے ہوئے دھر لیا گیا۔ جج صاحب کی جیب سے رشوت میں دیئے جانے والے نشان زدہ نوٹ برآمد ہو گئے' کسی ایرانی سرکس کے مسخروں سے مشابہہ چیف جسٹس کا نام بھی پلاٹ حاصل کرے والوں میں شامل ہے۔ ایڈمرل صاحب نیوی کی اراضی اور مال ملکیت ہضم کر گئے۔ ایئر مارشل جہازوں کے سودے میں کمیشن لے اڑے اور مہران بنک کے مہربانوں میں جرنیل بھی شامل ہیں' لیکن انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کسی جیل میں بند نہیں ہے کوئی بھی شرمندہ نہیں ہے کسی پر کوئی مقدمہ چلا نہ ضابطے کا نفاذ ہوا نہ کسی قانون کا اطلاق' جبکہ ان کے

سینکڑوں ہزاروں ہم منصب یکساں جرائم کی پاداش میں دنیا بھر کی جیلیں آباد کئے ہوئے ہیں اور وجہ اس کی ایک ہی ہے' بڑی منطقی' سمجھ میں آنے والی' ناقابل تردید' مروج اور مصفا کہ ہمارے ڈاکوؤں کو معطل کر دیا جاتا ہے' معطل ہو جاتے ہیں چونکہ ہمارے ہاں معطلی کا ننگ عام' اکثر' ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔

ہمارے ہاں چوروں نے دوسرے چوروں کو تحفظ دینے کے ایسے ایسے قانونی ڈھونگ اور حرام حیلے رچا رکھے ہیں کہ جس سے مجرموں کی پشت پناہی اور سرپرستی بھی ہوتی رہے اور ہاتھ بھی میلے نہ ہوں' حرف بھی نہ آئے' کسی کو شک ہو نہ شبہ پڑے۔ پس پردہ رہنے' پناہ دینے اور مجرموں کی سرپرستی کی خواہش اور مجبوری نے ہتھ ہولا رکھنے کے کوڑھ کو پروان چڑھایا اور ہوتے ہوتے اب ہاتھ اس قدر ہولا ہو گیا ہے کہ جس نے پولیس مقابلے کے نام پر دو چار قتل کر دیئے وہ بھی معطل اور جس نے کروڑوں کمیشن لے لی وہ بھی معطل' جس نے ریاست کی سرکاری اراضی اونے پونے بیچ دی وہ بھی معطل اور جو عقوبت خانے چلا رہا ہے وہ بھی معطل' حقیقتاً معطلی کی تعزیر اور معطلی کا معیار یہ ہے کہ جب راشیوں اور ڈاکوؤں کو معطلی کا مژدہ سنایا جاتا ہے تو فرط مسرت سے ان کے خائن چہرے دمکنے لگتے ہیں اور بے ضمیر لہجہ خوشی سے بے قابو ہو جاتا ہے ان کے دل معطل کرنے والے کے تشکر سے لبریز ہو جاتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جس جرم کی سزا طویل قید' املاک کی ضبطی اور بڑی رسوائی ہو اور اس سزا کے بدلے میں محض معطلی سے کام چل جائے تو کون ایسا ناشکرا ہو گا کہ جو خوشی سے چھالیں نہ مارنے لگے' داتا صاحب کے مزار پر چادر نہ چڑھائے، نذر نہ نیازے، دیگیں نہ پکوائے اور بری امام پر دھمال نہ ڈالے، مجرے نہ کرائے، عمرہ نہ کرے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی

سے نہ تھام لے۔

ہمارے ہاں معطلی اس بے ضرر ضابطے کی طرح ہے کہ جس کا بہرحال نتیجہ بچ جانا ہو۔ جسے معطل کیا گیا سمجھو وہ بچ گیا اسے بچا لیا گیا' جسے سبکدوش کیا گیا اس کی آبرو رہ گئی' رکھ لی گئی اور جسے محکمانہ کارروائی کی سیج سے گزارا گیا وہی باعزت ٹھہرا اور باعث عزت ٹھہرایا گیا۔

ہمارے معاشرے میں مروج ہتھ ہولا رکھنے کا دوسرا نام مک مکا' مصالحت اور معطلی ہے۔

جہاں کئی کئی قانون' ایک سے زیادہ نظام اور دہرے معیار رائج ہوں وہاں ایسے ہی ہوتا ہے کہ جنہیں بچایا جانا مقصود ہو ان کے لئے ہمیشہ گنجائش نکال لی جاتی ہے' اگر دینی مدرسوں کے طالب ڈاکہ مارتے ہوئے دھر لئے جائیں تو دہشت گرد' بڑے مجرم اور لمبی سزائیں اور اگر تھانیدار اور منتخب نمائندوں کے اہل وعیال اسی طرح کے ڈاکے میں رنگے ہاتھوں ہاتھ آجائیں تو محض معطل' جن جرائم پر ایڈمرل صاحب کو سبکدوش کیا گیا کئی مہاتڑ انہی جرائم پر لمبی سزائیں بھگت رہے ہیں۔ سرکاری حج وفد کے ارکان آب زم زم کے پیپوں میں زیور اور گھڑیاں سمگل کریں تو پردہ پوشی اور معطلی اور دبئی کے جیرے ویلڈر کی کلائی پر دو گھڑیوں کے ہونے سے سمگلنگ میں گرفتاری۔ یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ مملکت میں دو یکساں سمگلروں پر یکساں جرائم کی سزائیں مختلف ہوں۔

جب پولیس کے اہلکار' آن ڈیوٹی مجسٹریٹ کی زیر نگرانی مسافروں کو لوٹیں' بسوں پر ڈاکے ماریں اور واپڈا کے اہلکار مہنگے اور امپورٹڈ جنریٹرز سستے داموں بیچتے ہوئے پکڑے جائیں اور سوئی گیس کا عملہ گیس کے میٹر اسی کمپنی کو واپس فروخت کرنے لگے جس سے خریدے گئے تھے اور محکمہ اوقاف کے

کارندے داتا دربار پر نذر' نذرانے اور چڑھاوے والی پلاؤ کی دیگیں اندرون شہر کے ہوٹلوں میں فروخت کرتے ہوئے شناخت کر لئے جائیں اور رات گئے دارلامان کے چار چھپیرے ضلعی انتظامیہ کی کاروں کی آمد ورفت غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تو ایسی صورت حال میں معطلی سے زیادہ ہولا ہتھ رکھا ہی نہیں جا سکتا ہے' ممکن ہی نہیں ہے۔

سیدھی سادھی چوری چکاری' خرد برد' بردہ فروشی' آبرو ریزی اور لوٹ مار کے جرائم کو معطلی کی ڈھیلی ڈھالی چادر سے ڈھانپ دینا بڑی فراخدلی کی بات ہے یہ الگ بات کہ معطلی کی گنجائش تھی بھی یا نہیں لیکن معطل کرنے والا خوب جانتا ہے کہ اس کی فراخدلی اور گنجائش نکالنے کی سعی رائیگاں نہیں جائے گی اور اس نے معطلی کے جال میں جس گندی مچھلی کو پھانس لیا ہے اس کا تعفن ہی اس کے لئے صندل' اکسیر اور آب حیات کا کام دے گا۔

معطل کرنے والا معطل ہونے والے سے اپنے اس احسان کی پائی پائی وصول کرے گا۔

مک مکا کے گھمسان کارن عرصہ معطلی میں ہی پڑتا ہے۔ اس دورانیئے میں معطل ہونے والے کے اعصاب پر عدالتی کاروائی کا ننگ' جیل کی ہیبت اور سزا کا خوف چھایا رہتا ہے۔ یوں مک مکا پر ہونے والے مذاکرات کے دوران معطل کرنے والا معطل ہونے والے پر اس حد تک دباؤ بڑھاتا رہتا ہے کہ جس حد تک معطل ہونے والے نے مال بنایا ہے جس لمحے بھی مال کے بٹوارے کا کوئی بھی قابل قبول فادمولا فریقین کے درمیان طے پا جاتا ہے' ضمانتیں تسلیم کر لی جاتی ہیں اور شخصی ضامنوں کو ملوث کر لیا جاتا ہے اسی لمحے معطل ہونے والے کی بریت کا مژدہ سنا دیا جاتا ہے۔

تمام گناہ معاف' ملزم بے قصور' معطلی منسوخ' سرنگوں سربلند' بلّے

بلّے' چل سو چل۔

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
پاکستان کا مطلب کیا
مک مکا' مک مکا یا اللہ یا رسول معطلیہ بھی بے قصور

چوری کے مال سے حصہ وصول ہوتے ہی معطل کرنے والے صاحب عمرے کے لئے چل پڑتے ہیں اور بحال ہونے والا اپنی اسی جگہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے معطل ہوا تھا' زیادہ دیدہ دلیری سے زیادہ ڈھٹائی سے مزید بے شرمی سے آ براجمان ہوتا ہے کہ مزید مال بنا سکے۔

جھاکا اترے اہل کار کی لوٹ مار کی زد سے اللہ دشمن کو بھی محفوظ رکھے اگر معطلی کی قباحت کو شماریات کے آئینے میں دیکھیں تو بڑے دلچسپ انکشافات سامنے آتے ہیں معطل ہونے والوں کی بڑی اکثریت پچاسی فیصد سے زائد معطلنیے عرصہ چھ ماہ کے اندر اندر ہی بحال ہو کر دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر آ موجود ہوتے ہیں قریب دس فیصد کا تبادلہ دوسرے علاقوں اور دفتروں میں کر دیا جاتا ہے اور پانچ فیصد بحال ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے دراصل یہ پانچ فیصد وہ حضرات ہیں کہ جنہوں نے اس قدر مال بنا لیا ہوتا ہے کہ مزید مال بنانے پر بنے ہوئے مال کے خرچ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بحال نہ ہونے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ نسبتاً چھوٹے عہدیداروں کی بحالی کی شرح بڑے عہدیداروں کی شرح بحالی سے کئی گنا زیادہ ہے پولیس کے ملازمین' سرکاری امام' محکمہ مال کے اہلکار' واپڈا' محکمہ انہار' اساتذہ اور انکم ٹیکس کے ملازمین کی شرح بحالی زیادہ ہے' تھانیدار کی بحالی جس قدر یقینی ہے

اسی قدر ایڈمرل کی سبکدوشی حتمی ہے' نائب تحصیلدار بحال ہو کر بہت جلد دوبارہ لوٹ مار میں مصروف ہو جائے گا مگر ایئر مارشل' آئی جی' ممبر ریونیو' ایم ڈی مہران بنک' چیئرمین سٹیل ملز کی واپسی ناممکن ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی واپسی سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے' پردہ نشینوں کے نام سامنے آسکتے ہیں' اندر کی بات باہر آسکتی ہے' تنازعہ بڑھ سکتا ہے' جوتیوں میں دال بٹ سکتی ہے' تو تو میں میں ہو سکتی ہے' بندر بانٹ کا فارمولا منظر عام پر آسکتا ہے' سوئس بنک اکاؤنٹ فاش ہو سکتے ہیں۔ روز ویلٹ ہوٹل نیویارک میں سرکاری حکام کی شب بیداریاں' مال کی تقسیم کے فارمولے اور نت نئے طریقوں پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ میامی بیچ فلوریڈا میں پاکستانی حکام کی خریدی گئی جائیداد کا گوشوارہ منظر عام پر آسکتا ہے' پھڈا پڑ سکتا ہے' گھپلے ہو سکتے ہیں اور گھمن گھیری کا گھیرا رک سکتا ہے۔ عوام متوجہ ہو سکتے ہیں چوکنے ہو سکتے ہیں' گریبان پکڑ سکتے ہیں سو بحالی کا یہ اصول وضع اور راسخ ہے کہ صرف اسی کو بحال کرو کہ جس نے ہنوز مال بٹورنا ہے جس کا ٹارگٹ ابھی تک پورا نہیں ہوا اور جس میں لوٹ مار کی صلاحیت جوبن پر ہے جو ٹیم ممبر ہے' ٹیم سپرٹ سے سرشار ہے' اپنا ہے' بے ضرر ہے' بے ضمیر ہے' ڈرو ہے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنے والا اور دروازہ کھولنے والا ہے۔ اور اسے معطل ہی رکھو کہ جس کے لئے بحالی میں کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے کوئی منفعت باقی نہیں رہی ہے جو مزید لوٹ مار کے بغیر بھی آرام دہ زندگی گزار سکتا ہے، عمرے کر سکتا ہے، نذریں نیاز سکتا ہے' چندے دے سکتا ہے' استقبالئے اور عشائیے برپا کر سکتا ہے' محفل میلاد' مراقبے' بیت المال' زکوۃ کمیٹی' جہیز فنڈ اور خدمت کمیٹی پر اپنا تصرف اور دباؤ قائم رکھ سکتا ہے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھ سکتا ہے۔

سو ایسے میں بحالی کا فائدہ ہی کیا کہ اس میں تو سارے ہنر موجود ہی ہیں۔
کسی اور کو موقع دو کہ مزید کوڑھ پھیلے کسی اور کو کوڑھ کاشت پر مامور کرو'
زیر بار کرو کہ کام آئے' حلقہ نیابت بڑھے جانثاروں میں اضافہ ہو اور جگہ جگہ
تحفظ دینے والوں کا جال بچھا ہو' نیٹ ورک موجود ہو' ایکٹیو ہو' کام جاری ہو'
چل رہا ہو' پیدا ہو رہی ہو اور پیداوار بڑھ رہی ہو کہ اسی میں سب کا فائدہ
ہے بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حرف دل آزار

جس لمحے پاکستان معرض وجود میں آیا ہم اسی لمحے سے اپنی آزادی کے چار فطری تقاضوں اور ان کی تکمیل میں سر بہ گریباں ہیں مگر ہماری آزادی سے وابستہ یہ چاروں شرائط ہنوز شرمندۂ تکمیل ہیں۔

1۔ ملک میں اسلامی نظام کا قیام
2۔ جمہوری معاشرے کی تشکیل
3۔ کشمیر کا پاکستان سے الحاق
4۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا

اسلامی نظام کے قیام پر اس قدر صفحے سیاہ کئے جا چکے ہیں' اتنی بحث ہو چکی ہے' اتنا خون بہہ چکا ہے اور اس قدر جلوس نکل چکے ہیں' اتنا انتظار کیا جا چکا ہے کہ اب تو اسلام کو نافذ ہو ہی جانا چاہئے تھا۔ ہم تو ہیں ہی مسلمان اور ہماری آزادی کا پہلا قدم اور سب سے بھاری عنصر ہی اسلام تھا' نصف صدی میں جو کوششیں ہمارے ہاں نفاذ اسلام کی ہو چکی ہیں' اگر اتنی سعی اسرائیل میں کی جاتی تو عین ممکن ہے کہ آج وہاں بھی اسلامی نظام قائم ہو چکا ہوتا۔

اسلامی نظام کا نفاذ جب بھی قریب آنے لگتا ہے ہمارے حکمرانوں کے ہاتھ پاؤں پھولنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے ایسے علمی اور مسلک ورانہ مباحثوں کا آغاز کر دیا جاتا ہے کہ جس سے اسلام کے بارے میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ کم ازکم ہمارے یہاں تو نافذ العمل نہیں ہو سکتا (نعوذ باللہ)

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو بھی موجودہ بدصورت جمہوریت کی طرح توڑ موڑ کر اپنے مفاد' ضرورت اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اب چونکہ اسلام آئینی اور پارلیمانی جمہوریت تو ہے نہیں کہ من مانی تاویلوں اور صدارتی آرڈیننسز سے اس کا رخ موڑا جا سکے۔ اسلام تو سیدھا سادا اصول معاشرت ہے' سائیٹیفک اپروچ ہے اور ماننے والی بات ہے کہ یا تو اسے جوں کا توں پورے کا پورا مانا جائے یا بالکل نہ مانا جائے۔

موجودہ درمیانی صورت حال عین منافقانہ اور سیدھا سادا جہنم کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ اب اگر اسے مانا جاتا ہے تو اشرافیہ' مقتدروں اور حکمرانوں کو اس میں اپنی موت نظر آتی ہے۔ جوڑ توڑ اور مک مکا اسلام میں ہے نہیں اور جس نظام میں جوڑ توڑ' مک مکا اور حیلہ گری نہیں ہو گی تو وہ ہمارے ہاں چلے گا کیسے؟ ایسے کسی بھی نظام میں ہمارے بددیانت اور خائن مقتدر طبقے اور بدنیت حکمران سانس ہی کتنے لے سکتے ہیں اور کیسے لے سکتے ہیں ؟ سو یا تو اسلامی نظام کے نفاذ کی امید' انتظار اور اسلام کے بارے میں اپنے اپنے جاہلانہ رویے کو لگام دی جائے یا موجودہ مقتدر اور حکمران طبقوں سے جان چھڑائی جائے۔

اس بارے میں جو بات حتمی اور سو فیصد ہے وہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سرزمین میں کم ازکم اسلام کا وہ حال اور حلیہ نہیں ہونے دیا جائے گا' جو جمہوریت کا کیا جا چکا ہے۔

آزادی سے منسلک ہماری دوسری شرطیہ خواہش' جس میں ہم نصف صدی سے گھسیٹے جا رہے ہیں' وہ جمہوری معاشرے کا قیام ہے۔ جس قدر یہ خواہش سیدھی سادھی اور بے ضرر ہے' اسے اسی قدر مشکل' ناممکن اور ناقابل برداشت بنا دیا گیا ہے۔ عوام ایک ایسے جمہوری معاشرے کے منتظر ہیں جس میں قانون سب کے لئے یکساں' انصاف سب کو میسر' عزت نفس اور آبرو سب کی محفوظ' یافت اور وسائل میں سب شریک ہوں۔

موجودہ جمہوری جبر نما تماشے میں عوام محض تماشائی کی حد تک تو شامل ہیں مگر جمہوریت کا ثمر ان کی پہنچ سے بہت دور ہے' موجودہ نظام جسے جمہوریت کے نام پر چلایا جا رہا ہے' صریحاً ایک ایسا ظالمانہ نظام ہے کہ جس کی بنیاد جنگل کے قانون پر استوار ہے۔ وہ فرد جو کئی کئی افراد کا قاتل بھی ہو مگر ہو طاقتور' تو وہ محفوظ ہے۔ طاقتور فرد کی منہ زوری اور طالع آزمائی سان گمان کی ساری حدیں پار کر چکی ہے۔ اس طاقتور فرد نے قانون' انصاف' سماج ' حکومت اور حکمرانوں تک کو نیچے لگا رکھا ہے۔ یہ طاقتور فرد اب اس قدر مضبوط اور دلیر ہو چکا ہے کہ اس کی بریت اور پشت پناہی حکمرانوں کی مجبوری بن چکی ہے۔ جہاں قاتلوں کو بھی سزا دینے کا رواج نہ ہو وہاں یو ٹرن کرنے' بسوں کے شیشے توڑنے اور بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کو کیا کہا جا سکتا ہے۔

ہمیں ایسے طاقتور فرد اور کمزور حکمرانوں دونوں سے بیک وقت نجات حاصل کرنی ہو گی۔

21 نومبر 1998ء کے روزنامہ جنگ لاہور کا ایک کالم جو جاوید چوہدری نے تحریر کیا تھا' پیش ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد بھاری مینڈیٹ کے زور پر قائم حکومت' طاقتور فرد کے لمبے ہاتھ' ہمارے محبوب وزیراعظم' میاں نواز شریف

کا انصاف سے لگاؤ' قانون کی بالا دستی' منصفوں اور عدلیہ کا قانون اور انصاف سے رویہ سبھی کچھ عیاں اور عریاں ہے۔

جاوید چودھری لکھتے ہیں کہ

"1992 میں جب کراچی میں پہلا آپریشن شروع ہوا تو تمام بڑے دہشت گرد فرار ہو کر لاہور اور ملتان آ گئے انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کے اس وقت کے جوائنٹ ڈائریکٹر خاور زمان کو دہشت گردوں کی اس نقل مکانی کی خبر ہو گئی لہٰذا انہوں نے فوراً مجرموں کے "پروفائل" تیار کئے اور جا کر آئی جی پنجاب (اس وقت) چودھری سردار کو پیش کر دیئے' معاملہ کیونکہ بہت ہی سنگین اور حساس تھا چنانچہ چودھری سردار نے بغیر وقت ضائع کئے وزیر اعظم سے رابطہ کیا۔ وزیر اعظم نے بات سنتے ہی آپریشن کی اجازت دے دی۔ چودھری سردار نے مجرموں کی گرفتاری کے لئے ٹیمیں تیار کیں اور اپنی نگرانی میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے' آپریشن اس قدر کامیاب ہوا کہ شام تک صرف لاہور سے 16 دہشت گرد گرفتار کر لئے گئے' جن میں سب سے چھوٹا مجرم 22 افراد کا قاتل تھا۔

رات دس بجے وزیر اعظم کو کامیابی کی اطلاع دی گئی۔ وزیر اعظم نے خود لائن پر آ کر آئی جی پنجاب اور ان کی ٹیم کو شاباش دی' چودھری سردار نے اس مدح و ستائش سے متاثر ہو کر آپریشن میں شامل تمام افسروں اور ماتحتوں کے لئے تعریفی اسناد اور نقد انعامات کا اعلان کر دیا۔ اگلی صبح جب ابھی اس آپریشن کی خبر ملک کے چند اہم لوگوں تک ہی محدود تھی

چودھری سردار کو راولپنڈی سے فون آگیا۔ "مرحوم" نے پولیس کی کارکردگی سراہنے کے بعد آئی جی پنجاب کو تمام مجرم فی الفور رہا کر دینے کا حکم دے دیا' یہ حکم سن کر چودھری سردار چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں بھیگ گئے۔ ان کا یہ رد عمل سو فیصد درست تھا کیونکہ کوئی بھی سمجھدار افسر کسی دوسرے ذمہ دار عہدیدار سے اس قدم کے حکم کی توقع نہیں کر سکتا۔ لہٰذا چودھری سردار نے مرحوم سے الفاظ دہرانے کی درخواست کی۔ یہ سن کر "مرحوم" کو غصہ آگیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں کہہ رہا ہوں' آپ ان 16 افراد کو فوراً چھوڑ دیں۔" چودھری سردار نے بال فوراً وزیراعظم کے کورٹ میں پھینک کر معذرت کر لی' مرحوم انکار سن کر چراغ پا ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے چودھری سردار کے ساتھ وہی کیا' جو عموماً ایسی صورت حال میں اعلیٰ افسر "چھوٹے" افسروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ بہر حال چودھری سردار کے پاس کان لپیٹ کر یہ سب کچھ سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بقول چودھری سردار "مسلسل پندرہ منٹ تک انگریزی میں گالیاں دینے کے بعد بھی جب مرحوم کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے دوبارہ فون کیا۔ لیکن میرا ایک ہی جواب تھا۔ "یہ آپریشن وزیراعظم کی خصوصی ہدایت پر کیا گیا' لہٰذا ہم ان کی اجازت کے بغیر کوئی بندہ نہیں چھوڑ سکتے"

دوپہر کو پنجاب کے ایک معروف سیاستدان آئی جی کے دفتر آدھمکے' چودھری سردار نے اس تکلیف کی وجہ پوچھی تو

موصوف نے 16 میں سے دو مجرموں کی سفارش کر دی' آئی جی کے کریدنے پر پتہ چلا دونوں دہشت گرد نہ صرف ان کے ذاتی درزی کے عزیز ہیں بلکہ اسی کے گھر پناہ گزین تھے' چودھری سردار نے اقبال صاحب کو سمجھایا "جناب آپ جن مجرموں کی سفارش کر رہے ہیں۔ "ان میں سے ایک 42 اور دوسرا 69 افراد کا قاتل ہے" آئی جی کی دلیل کے جواب میں اقبال صاحب کا موقف تھا "جناب یہ سب پروپیگنڈہ ہے' میں اپنے درزی کو پچھلے بیس برس سے جانتا ہوں وہ اس قدر شریف انسان ہے کہ ان کا کوئی عزیز قاتل ہو ہی نہیں سکتا"۔ چودھری سردار نے یہ دلیل سن کر پہلے تو قہقہہ لگایا اور پھر انہیں "معاملہ وزیراعظم کے نوٹس میں ہے' ہم مجبور ہیں' کچھ نہیں کر سکتے' آپ اوپر بات کریں' وغیرہ وغیرہ" کی "گولی" دے کر رخصت کر دیا۔

اس شام جب آئی جی پنجاب "واک" کے بعد واپس لوٹے تو وزیراعظم ہاؤس کی طرف سے ایک پیغام ان کا منتظر تھا۔ "وزیراعظم کل لاہور پہنچ رہے ہیں' ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم میں اہم میٹنگ ہو گی۔ آپ وقت پر ایئرپورٹ پہنچ جائیے گا" چودھری سردار کے لئے یہ پیغام حیران کن تھا کیونکہ اس سے قبل وزیراعظم نے کبھی ایئرپورٹ پر آفیشل میٹنگ کال نہیں کی تھی۔ چودھری سردار نے چیف سیکرٹری کو فون کیا تو ادھر سے جواب موصول ہوا "صرف آپ نہیں بلکہ چیف سیکرٹری' ڈی آئی جی' آئی بی کے جوائنٹ ڈائریکٹر اور دہشت گردی سیل کے انچارج بھی میٹنگ میں مدعو ہیں"۔ بہرحال

قصہ مختصر' وقت مقررہ پر میٹنگ شروع ہوئی' وزیراعظم نے دہشت گردوں کی گرفتاری کا سارا احوال سنا' ان کے پروفائل پڑھے' ان کے اعترافی بیانات اور جرائم کی تفاصیل ملاحظہ کیں' آئی بی اور پولیس کی کارکردگی کو سراہا۔ آخر میں جب حاضرین کے سینے غرور سے پھول گئے اور ماتھوں پر ستائش کی روشنی چمکنے لگی تو وزیراعظم نے اعلان کیا "آپ تمام مجرموں کو چھوڑ دیں" وزیراعظم کا یہ اعلان' اعلان نہیں' بم تھا۔ جس نے میٹنگ روم کے سارے دروبست جھنجھوڑ کر رکھ دیئے' رہے حاضرین تو چند لمحوں کے لئے قوت گویائی ہی کھو بیٹھے' جب ہوش آیا تو چیف سیکرٹری نے لرزتے کانپتے عرض کیا "لیکن سر!" یہ سنتے ہی وزیراعظم اپنی نشست سے اٹھے' سیکرٹری کو گھور کر دیکھا اور چلا کر فرمایا "کوئی لیکن ویکن نہیں' آرڈر از آرڈر"

وہ چودھری سردار کے 40 سالہ کیریئر کی خوفناک ترین سہ پہر تھی کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان ہی کے حکم سے وہ 16 مجرم رہا کئے جا رہے تھے۔ جن کی گردنوں پر کراچی کے 280 معصوم شہریوں کا لہو تھا' جو مدت سے انسانوں کی بجائے بھیڑیوں کی زندگی گزار رہے تھے۔ جنہیں زندہ رہنے کے لئے روزانہ کسی نہ کسی شخص کے خون کی ضرورت ہوتی تھی' چودھری سردار کے سامنے وہ لوگ حوالات سے نکلے اور معصوم انسانوں کے سمندر میں جذب ہو گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں گئے؟ انہوں نے کیا کیا گل کھلائے؟ تاریخ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اور آج پورے چھ برس بعد مجھے کراچی پولیس کا ایک اعلیٰ افسر بتا رہا تھا۔ "نہیں' وہاں کراچی میں کچھ نہیں ہو سکتا" میں نے حلق میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر پوچھا۔ "کیوں۔" اس نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ "ہم جسے گرفتار کرتے ہیں' وہ کسی بڑے شخص کے درزی کا عزیز نکلتا ہے' جسے پکڑتے ہیں وہ کسی وزیر مشیر اور سفیر کے باورچی کا بیٹا نکلتا ہے یا کسی چودھری' جتوئی اور سردار کا دوست۔ ہم انکار کرتے ہیں لیکن اوپر سے حکم آجاتا ہے کوئی لیکن ویکن نہیں'" "آرڈر از آرڈر" میں نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا کراچی کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوں گے' کیا حالات کبھی درست نہیں ہوں گے؟" پولیس آفیسر نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر جواب دیا۔ "نہیں' قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ نہیں رک سکتا کیونکہ جہاں آرڈر مضبوط ہوتا ہے' وہاں قانونِ کمزور ہوتا ہے اور جہاں قانون کمزور ہوتا ہے' وہاں قاتلوں کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا"۔ (جنگ لاہور: 21 نومبر 1998ء)

پاکستان سے کشمیر کے الحاق کے بارے میں موجودہ حکمرانوں نے صرف ایک لفظ "خدانخواستہ" کا اضافہ کر کے کشمیر کا مسئلہ جس طرح حل کیا ہے' اس سے ان حکمرانوں کی معجزاتی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے' جس مسئلے کی وجہ سے ہم نصف صدی سے مسلسل حالت جنگ اور نعرے مار کیفیت میں رہے ہیں' موجودہ حکومت نے اس مسئلے کا جو کم خرچ اور بالا نشین حل تلاش کیا ہے' اس سے ان بادشاہوں کی ذہنی صلاحیتوں پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور گمان بھی گزرتا ہے کہ محض ایک لفظ "خدانخواستہ" کے اضافے سے کیسا نزاعی اور جان لیوا مسئلہ کس قدر آسانی سے حل کر دیا ہے۔؟

کشمیر کا الحاق (خدانخواستہ) پاکستان سے۔

آزادی سے وابستہ ہم صرف ایک ہی شرط پوری کر سکے ہیں کہ بحرحال اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں' ہم اللہ کو ہر حال میں یاد رکھتے ہیں اور اس کا اظہار صبح سے شام تک ہزار طریقوں سے کرتے رہتے ہیں۔ معاشرتی شب و روز کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی بجائے ہمارے ہاں اسلام کو اپنی اپنی ضرورتوں سے ہم آہنگ کر لیا گیا ہے۔ اسلامی احکامات کی توضیح اپنے اپنے تقاضوں کے مطابق کر لی گئی ہے اور کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ اس منافقت اور بے عملی کو اسلام کی آڑ میں جاری رکھا جا سکے۔ اگر اللہ کی اسی رسی کو تھامنا پیش نظر تھا اور اگر یہ وہی رسی ہے جس کا مضبوطی سے تھامنا ہماری آزادی سے مشروط تھا تو غالباً" یہ ایک شرط تو کم از کم پوری کی جا چکی ہے۔ اسی طرح باقی بھی پوری ہو جائیں گی۔

ہم جس طرح کے اسلام پر لگے ہوئے ہیں اس کا نقشہ یہ ہے کہ کوئی بھی سودا طے ہو جائے ہم عمرے پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ کمیشن وصول ہو تو فاتحہ' دینی ہو تو نذر نیاز' جس دن پلاٹ پر قبضہ اسی شب میلاد' بلکہ میلاد پہلے قبضہ بعد میں' سودے نقد' مال ستھرا' حساب برابر' جہاں پرمٹ ملا' وہیں مراقبے میں چلے گئے' جس نے قرضہ معاف کیا' اسی کو امام ضامن باندھ دیا' جس نے ٹیکس کے گوشوارے دبا دیئے اسی کی دعائے خیر پڑھ دی' جس سرحدی ناکے سے سمگلنگ کا مال پار کیا وہیں سجدہ ریز ہو گئے' جتنی جعلی ووٹیں ملیں اسی قدر طالبوں کو کھانا کھلا دیا' جتنے قتل کئے اتنے ہی ختم قرآن پڑھ دیئے۔ بڑی صاجزادی کے پرچوں میں جتنے نمبر بڑھوائے گئے اسی کے برابر قل پڑھ لئے' جواء لندن میں کھیلا مال مدینے میں وصول کیا' ڈکیتی کی سزا کاٹ کر بشیرا مچھ جیل سے چھوٹ کر آیا تو کہہ دیا کہ بھائی جان امریکہ گئے ہوئے تھے اور لعنت

بھیجنے کی بجائے صدقہ اتار دیا' فکسڈ میچ سنگا پور میں ہارے وصولی اجمیر شریف میں کی' جھوٹی گواہی سے پہلے ورد کر لیا' وعدے کے پھرنے سے پہلے ذکر کر دیا' انتخابات نہ کرانے کا استخارہ کھینچ لیا' جہازوں کی خریداری میں کمیشن طے ہوا تو تسبیح پھیرلی' ذخیرہ اندوزی میں مال کی شرح منافع دوگنی ہوئی تو قیام لمبا کر دیا اور آشنا کے ساتھ بھاگی ہوئی بے بی واپس آگئی تو شکرانے کی نیت باندھ لی۔

اللہ کی رسی کو مزید مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کی گی تو اندیشہ ہے کہ یہی رسی گردن نہ کھینچ دے۔

ایک صورت بین بین یہ بھی ممکن ہے کہ عوام مزید نتھّو کاکا بننے سے انکار کر دیں' آنکھیں کھولیں' شاید جاگ آ ہی جائے۔ حافظہ کام کرنے لگے' یاد داشت واپس آجائے' بینائی دیکھنے کا بھی کام دینے لگے۔

جس نے وعدہ ایک کروڑ روزگار کا کیا' مہیا سو بھی نہ کئے' خواب کشکول توڑ دکھائے' مگر جھولی دراز کر دی۔ جس نے خواتین کی حالت بدلنے اور جمہوریت کا بول بالا کرنے کی یقین دہانی کرائی' اسی نے نسوانی حقوق کو سرنگوں اور جمہوریت کا ختم پڑھ دیا۔

خان صاحب نے پہلے دونوں کا گھونٹ بھر دیا

اگر یہی اسلام اور پاکسانیت ہے جس پر ہم لگے ہوئے ہیں تو اس تردّد کی خاطر دس لاکھ انسانی جانوں کی قربانی کے جواز کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہے اس طرح کے من موہنے اسلام کو تو کسی جگہ بھی جبھی ڈالی جا سکتی تھی کسی بھی خطے میں نافذ کیا جا سکتا تھا۔ بدعنوان معاشروں اور بد دیانت حکومتوں کی تشکیل کے لئے مذہب اور علاقوں کی تخصیصی شرط ہوتی ہی نہیں ہے' ڈاکے مارنے کے لئے کسی مذہب' نظریئے اور اصول کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے اور اگر

یہی نظریہ ہے کہ جس پر ہم اپنی اساس قائم رکھنے کی کوشش میں کبھی دو نیم ہو جاتے ہیں، کبھی لہولہان تو ایسے ڈوبتے ڈولتے ہم۔ وقت خطرے کی زد میں رہنے والے نظریئے پر نظرثانی کر لینے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جب مسز اندرا گاندھی یہ کہتی تھیں کہ نظریہ پاکستان کو بحیرہ عرب میں ڈبو دیا گیا ہے تو اسے چھپانے کی بجائے یہ حقیقت واضح کی جانی چاہیئے تھی کہ مسز اندرا گاندھی کا یہ کہنا غلط تھا تو کیوں اور اگر غلط نہیں تھا تو کیوں نہیں ؟۔ ہمیں، ہماری نوجوان نسل کو اور اس زمین کے اصل وارثوں پر یہ واضح ہونا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے نظریئے پر کیا گزری۔ جغرافیائی دونیمگی سے نظریاتی دولختگی بھی وقوع پذیر ہوئی یا نہیں۔ موجودہ صورت حال میں ہمارا نظریہ ہمیں کس حد تک بچا سکتا ہے۔ ہماری نظریاتی اساس ہمیں متحد رکھنے کے کام آئے گی یا مزید تقسیم اسی اساس کے کارن ہو گی (خدانخواستہ)

اس انتہائی اہم اور سنجیدہ موضوع پر چھائی ہوئی خاموشی اگر لاعلمی کے سبب ہے تو قابل مذمت ہے اور اگر بے حسی کی سبب ہے تو قابل نفرین۔

ہم پہ یہ واضح ہونا چاہیئے کہ زمین اور نظریئے میں سے ترجیحاً کس کو بچانا اولیت کا حامل ہے زمین دے کر نظریئے کا دفاع (جیسا کہ مشرقی پاکستان میں کیا گیا) یا زمین قابو رکھو، نظریئے کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ زمین پہ قبضہ رکھنے کا انفرادی تجربہ ہمارے ہاں سبھی کو ہے مگر ہمارے جرنیل مشرقی پاکستان میں اپنی اس فطری صلاحیت سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے، نظریہ بچاتے بچاتے ایک لاکھ بیالیس ہزار مربع کلومیٹر زمین یکمشت دے کر جان چھڑائی۔ وضاحت جیسے بھی کی جائے مگر یہ پیش نظر رہے کہ پاک آرمی کا تجربہ اور ریکارڈ وطن کی زمین کے دفاع کے مقابلے میں نظریاتی دفاع کا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ زمین بھی

ضرور ہونی چاہیئے کہ جس پر نظریے کا اطلاق کیا جا سکے۔ نظریاتی کھنچ قائم رکھنے کے لئے زمین کے دباؤ اور دبدبے سے دستبرداری ہمارے حق میں نہیں ہے۔

1905ء سے 1947ء تک ہماری ساری جدوجہد کا مرکزی نکتہ ایک ہی تھا کہ خواہ ہمیں ایک انچ بھی زمین دے دو ہم اس پر بھی اپنا نظریہ اور نظام نافذ کر کے اپنے مطالبے کی صداقت ثابت کر دیں گے چونکہ مطالبہ منطقی اور کرنے والا متقی تھا سو اللہ رب العزت کی بارگاہ سے پورا کر دیا گیا مگر بد عہدی کی سزا کے طور پر یہ عنایت خصوصی واپس لے لی گئی' جو کچھ رہ گیا ہے اسے بچائے رکھنے کی ایک ہی شرط اور ایک ہی راستہ ہے یعنی اسی نظریے اور نظام کا سو فیصد اطلاق کہ موجودہ صدی کا پہلا نصف جس کی یقین دہانی اور عہد باندھنے میں گزرا اور باقی نصف اسے جھٹلانے اور توڑنے میں۔ بد عہدی کی سزا سے بچتے بچتے اور بھاگتے بھاگتے ہم نڈھال ہو چکے ہیں مگر اس طرح کی بدعہدی کی سزا مسلسل تعاقب میں رہتی ہے۔

اسی کرہ ارض پر بہت ساری قومیں اور بے شمار ممالک بغیر کسی نظریے کے محض انصاف' دیانت' محنت اور انسانیت کے زور پر قائم و دائم ہیں۔ ایسے نظریے کا فائدہ بھی کیا جو ہمہ وقت ریخت کی زد میں ہی رہے۔ نظریے کے دفاع میں اگر سرحدیں دولخت اور عوام چھینٹوں چھینٹ ہو جائیں تو ایسے میں حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اس کہے پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے۔ حکیم الامت کہتے ہیں کہ:

”جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ قرار دے دیا ہو(اور زندگی سے خارج کر دیا ہو) وہ خیالات کبھی دوبارہ قوت میں نہیں آسکتے۔ قوم کے زوال کو روکنے کا یہ علاج نہیں کہ گزشتہ تاریخ سے جھوٹی عقیدت کا

اظہار کیا جائے' اور اس کے احیا کے لیے خود ساختہ اور مصنوعی ذرائع استعمال کیے جائیں۔

اب کوئی چارہ کار ہے تو یہ کہ ہم اس چھلکے کو اتار پھینکیں جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے۔ جس نے مکمل طور پر متحرک نظریہ حیات کو جامد بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حریت' مساوات اور وحدت کی اصل صداقتوں کو پھر سے منکشف کریں' تاکہ اپنے اخلاقی' معاشرتی' اور اعلیٰ سیاسی مقاصد کی از سر نو تعبیر' ان کے اصلی' سادہ اور عالمگیر نقطہ نظر سے کر سکیں۔" (بحوالہ علامہ محمد اقبالؒ)

ہم جس قدر ہمہ گیر مذہب اور جاندار نظریے کے امین ہیں ہماری حالت اسی قدر غیر ہوتی جا رہی ہے اور ہم مکمل طور پر دفاعی رویے کے اسیر ہو چکے ہیں۔ صفائیاں پیش کر رہے ہیں' حلف اٹھا رہے ہیں اور وعدے کر رہے ہیں لیکن ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوتی ہے' تذبذب اور غیر فیصلہ کن صورت حال نے ایسی بے حسی اور جمود طاری کر رکھا ہے کہ ہم عمداً فریب خوردگی کا شکار ہو چکے ہیں اور اس کیفیت سے نکلنے کو تیار نہیں ہیں۔ اپنی ناکردگی کا الزام لگانے کے لیے جب تک کوئی دوسرا موجود ہے' کام چل رہا ہے' جانتے ہیں کہ یہ شخص مال بناؤ' دو رخا' ہلکا اور ڈرو ہے' اس کے پاس ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے لیکن ووٹ اسی کو دیں گے۔ جانتے ہیں کہ یہ عورت بناوٹی' دروغ گو' دو چہرہ' اوپر اوپر اور اندر اندر ہے اور اس کے پاس بھی ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے لیکن اسے بھی ووٹ دے دیں گے۔

ہمارا نفسیاتی رویہ پشت پناہ اور خود سپرد ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے ہم بد دیانت کو منتخب کرتے ہیں اسے آگے لاتے ہیں اور اس پر سنگبار ہونے تک اس کے پشت پناہ بنے رہتے ہیں اور خود کو اس بد دیانت کے رحم و کرم پر

چھوڑے رکھتے ہیں وہ جب زینیں' مال اسباب سب کچھ ہضم کر جاتا ہے اور نوبت ہمارے کپڑے اتارنے تک آ جاتی ہے تو ہم برا مان جاتے ہیں' پھڈا پڑ جاتا ہے اور ہم مزاحم ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی حکومت کے لئے برطرفی اور سرپھٹول جمہوریت کا حصہ نہیں ہے۔

اس امید اور انتظار میں 1990ء کا عشرہ اکارت ہو گیا کہ ان مداریوں کی پٹار سے کوئی سانپ نکلا کہ اب نکلا' ہم بھی شاید یہ بھولے رہے کہ زہر بھری پٹاریوں سے کسی اکسیر کا نکلنا کس قدر ناممکن ہے اور مفادات کے زہرباد تھیلوں سے کسی تریاق کا حصول کیسا مشکل ہوتا ہے۔

زہر تاثیراندوختے سے کوڑھ اثرات ہی برآمد ہو سکتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس قماش کے حکمران ہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رہے ہیں۔ ان سے جان چھڑا لینے سے ہی ہماری جان چھوٹ سکتی ہے۔ داناؤں کا اس قول پر پکا اکٹھ ہے کہ افراد اور معاشرے اپنی اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتے ہیں لیکن جو غلطیوں کو دہرائے چلے جاتے ہیں...... ان کے حق میں دعائے خیر مسلسل اور بلند آواز سے پڑھتے رہنا ضروری ہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جاننے والے ہیں مگر وارداتیوں کو بھی کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوتا ہی ہے کہ جرم کی نوعیت کیا تھی اور سزا کیا ہو سکتی ہے۔ جانے ہمارے لئے اکیسویں صدی سزایابی کی صدی ہو گی یا باریابی کی۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر٥

اہلِ قلم کی آراء

پاکستان آج جس سیاسی اور اقتصادی بحران سے دوچار ہے وہ یقیناً" ہمارے حکمرانوں کے غلط طرز عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ 1958ء کے بعد ملک میں سیاسی عمل کو ختم کرکے فوجی حکمرانوں نے تقریباً" پچیس سال تک ایسے سیاسی نظام کو جنم دیا جس کے نتیجے میں علاقائی گروہی' مذہبی رجحانات زیادہ مضبوط ہوئے اور اس غیر فطری سیاسی نظام کو چلانے کے لئے جو لنگڑا لولا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا اس کی بنیاد کرپشن پر استوار ہوئی۔

جناب ڈاکٹر حقی حق نے اپنی کتاب کوڑھ کی کاشت میں بڑی دردمندی' دلیری' اور جرات کے ساتھ ہمارے حکمرانوں کی ایسی غلط کاریوں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے' جس کے نتیجے میں آج پاکستان تاریخ کے نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اردو ڈائجسٹ

ڈاکٹر حقی حق نے پاکستان کے نصف صدی کے سفر کا تجزیہ نظریہ "مک مکاء" کی روشنی میں کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ اس نظریے پر عمل کرنے والے حکمران دراصل "ذلت جاریہ" کا اہتمام کرتے ہیں جس کا سلسلہ حکمرانوں کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کا موقع عطا کرتی ہے اور مکافات عمل سے بچنے کے لئے تلقین بھی کرتی ہے۔

"آپ ڈاکٹر حقی حق کو منکر سمجھیں یا نکیر لیکن انہوں نے ہمارے سامنے ہمارا نامہ اعمال رکھ دیا ہے۔" اور قیامت کے روز کا انتظار نہیں کیا۔ جب کوڑھ کی کاشت کرنے والا کوئی حکمران سزائے خداوندی سے بچ نہیں سکے گا۔" یہ کتاب موقع فراہم کرتی ہے کہ آج کے حکمران اپنی بد اعمالیوں کا خود تجزیہ کریں اور اس وقت کا انتظار نہ کریں جب توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس عبرت انگیز کتاب کا مطالعہ ہر پاکستانی کو کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر انور سدید

کوڑھ کی کاشت کا موضوع کانٹوں بھری وہ فصل ہے جسے ہمارے محبوب اور مقبول حکمرانوں نے پاک دھرتی میں بویا اور جسے کاٹنے میں عوام لہو لہان ہوتے رہے۔ ڈاکٹر حقی حق نے سیاست' مذہب' و فرقہ واریت ' آمریت ' جمہوریت' عسکریت' کی صورت میں کرپشن کے متنوع انداز نئے حوالہ جات و اعداد و شمار بیان کر دیئے ہیں تلخ لہجہ' تلخ تر حقائق!

کوڑھ کی کاشت ایسا آئینہ ہے جس میں ہمارے پیارے حکمرانوں کے مسخ نقوش نظر آتے ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر حقی حق نے نہ تو کسی حکمران کو رعایتی نمبر دیئے اور نہ ہی کسی کا دفاع کیا۔ گویا تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا کر دینے کے بعد خود پیچھے ہٹ گئے اور حقائق کو زبان خلق کے نقارہ میں تبدیل کر دیا۔ دراصل اب ہم اتنے کرپشن پسند ہو چکے ہیں کہ کرپشن کی مذمت میں بھی ہم ڈنڈی مار جاتے ہیں کیونکہ پالتو تعصبات کی بناء پر ہمارے پسندیدہ ظالم اور ناپسندیدہ مظلوم ہوتے ہیں لیکن حقی حق کے حمام میں سبھی ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسا انہیں نظر آنا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

"کوڑھ کی کاشت" میں ملک و قوم کا درد بھی نظر آتا ہے اس میں کسی ایک شخصیت کو نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جو فرد یا طبقہ بھی پاکستان کی تباہی کا باعث بن رہا ہے' اسے انہوں نے معاف نہیں کیا۔" جرنیل ہو یا سیاستدان' علماء ہوں یا بیوکریٹ' سرمایہ دار ہو یا جاگیردار' انہوں نے کسی پر بھی ہتھ ہولا نہیں رکھا بلکہ سب کو خوب رگیدا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

کوڑھ کی کاشت پڑھ کر میں اس تذبذب میں پڑ گیا کہ حقی صاحب افسانہ نگار ہیں' ناول نگار ہیں' طنز نگار ہیں' انشاء پرداز ہیں' آخر کیا کیا ہیں۔ میرے نزدیک حقائق و شواہد کے علاوہ اس کتاب کی مقبولیت میں اس کے شگفتہ' نکھرے نکھرے اور تندو تیز لہجے نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ کالم نگار ہی نہیں' بلا کے خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کا انداز کالمانہ کے ساتھ ساتھ ظالمانہ بھی ہے۔ بعض جگہ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ اردو نثر نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ یہ ایک ایسی تصنیف لطیف بھی ہے جو پر مغز' جرات و بے باکی کا نمونہ' اور بے مثال تشبیہات و استعارات سے مالا مال ہے۔ تاریخ و صحافت کے شائقین کے علاوہ یہ کتاب اردو ادب کے طلبہ کے لئے بھی توشہ خاص ہے۔ اردو صحافت کے آسمان پر شورش مرحوم' مولانا صلاح الدین شہید اور الطاف حسین قریشی کے دبنگ لہجوں کی کہکشاؤں کا نظارہ ہم کر چکے ہیں۔ اب "کوڑھ کی کاشت" کی جرات و بے باکی کا مطالعہ کیجئے اور حقی صاحب کی حق گوئی کی داد دیجئے۔

پروفیسر تنویر حسین

ڈاکٹر حقی حق نے "کوڑھ کی کاشت" لکھی اور کیا خوب لکھی ایسی جو پڑھی جائے اور جسے پڑھ کر یہ محسوس ہو کہ دل و نظر کا سرمایہ رائیگاں نہ گیا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ "الفاظ کا انتخاب نفیس اور جملوں کی تشکیل خوبصورت اور برجستہ۔" قرآن کریم کے مطابق ہر قسم کی لیڈر شپ کے لئے فرد کا قوی و امین اور حفیظ و علیم ہونا لازمی ہے میرا خیال ہے کہ اس آفاقی اصول کا اطلاق اہل قلم پر بھی ہوتا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب نہ صرف قلم کو قوت کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں بلکہ ان کی تحریر تخریب کی نشان دہی کر کے تعمیر کی خبر دیتی ہے" یوں وہ قوی و حفیظ بھی ہیں اور علیم و امین بھی۔ "ان کی یہ کتاب قلم کے بہت سے مسافروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔"

ڈاکٹر شبیر احمد

لارڈ ہل۔ فلوریڈا۔ امریکہ

"کوڑھ کی کاشت ہمارے اس گم کردہ جرات مندانہ کردار کی طرف مراجعت پر اکساتی ہے جو حضرت عمر بن خطاب سے کرتے کا حساب طلب کرلینے سے وابستہ ہے۔" ایسا منفرد اور توانا لب و لہجہ' ایسی کاٹ اور ایسا بیان کہ کوڑھ کی کاشت کو کئی بار پڑھا اور ہر بار الفاظ و معانی اور اسلوب کے نئے افق روشن ہوتے گئے۔ حقی صاحب کی فکر و نظر کی وسعت' بیان کی کشادگی اور بے ساختگی نے اردو ادب میں اسلوب تازہ کا سنگ میل گاڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد صفدر سرکی

لوئی ول۔ کنسٹاکی۔ امریکہ

ڈاکٹر حقی حق صاحب ایک محب وطن انسان ہیں جو امریکہ میں بیٹھ کر پاکستان میں کوڑھ کی فصل کو پھلتا پھولتا دیکھ رہے ہیں اور یہ خواہش کر رہے ہیں کہ وطن عزیز سے کوڑھ دور ہو۔ کوئی مسیحا آئے اور اس ملک کی سرزمین کی زرخیزیوں کی نمودو افزائش کا باعث بن جائے۔ یہ دعا ان کے دل سے اٹھتی ہے اور فلک تک پہنچ رہی ہے۔ ان کی کتاب "کوڑھ کی کاشت" پاکستان کے حکمرانوں کا گزشتہ نصف صدی کا اعمال نامہ ہے۔ اس کتاب میں ان قیامتوں کا ذکر ہے جو وطن عزیز پر اس ملک کے سول اور فوجی حکمرانوں نے نازل کیں' ملک کو ترقی معکوس کی راہ پر ڈال دیا۔

آج ہماری قوم پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکائے ہوئے پتھر کی طرح ہے جو مسلسل زوال کی ڈھلوانوں پر پھسل رہی ہے اور تحت الثری کی طرف جارہی ہے۔ ڈاکٹر حقی حق نے جن ہولناک اور دلدوز واقعات کا تذکرہ کیا ہے وہ ہماری پستیوں کے آئینہ دار ہیں۔ ہم سب ان کے عینی شاہد ہیں لیکن یہ جرات حقی حق صاحب کو حاصل ہوئی کہ انہوں نے ان واقعات کو دستاویزی صورت دے دی۔ حقی صاحب کا جذبہ حب الوطنی اور عوام دوستی کتاب میں فراواں ہے اور یہی کتاب کی اصل قدرو قیمت ہے۔ کاش ہمارے حکمران اور بالائی طبقات یہ کتاب پڑھ کر راہ راست پر آجائیں اور اپنی ذات کو سنوارنے کی بجائے عوام کی حالت سنوارنے پر توجہ دیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر محب وطن کا اخلاقی بلکہ قومی فرض ہے۔

سید ارشاد احمد عارف

ڈپٹی ایڈیٹر "روزنامہ نوائے وقت"

ڈاکٹر حقی حق کی کتاب کا نام نہایت دلچسپ ہے۔ "کوڑھ کی کاشت۔" وضاحتی سطر ہے۔ "پاکستان کے لٹنے کی درد بھری داستان۔" ٹائیٹل کھیت دکھایا گیا ہے جس میں ماشاء اللہ پانچ کاشتکار کھڑے ہیں جو اپنے ملبوسات سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ہیں جرنیل' سول افسر' سیاستدان' مولوی' جاگیر دار۔ مصنف نے جو انتساب لکھا ہے۔ وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"وطن کی قہرزدہ زمین کے نام کہ جس کی ہریالی' نمو اور یافت میں کوڑھ سمو دیا گیا ہے۔ جہاں اب کوڑھ کی فصل کی کاشت کی جاتی ہے۔ کوڑھ بیجنا' کوڑھ لگانا اور کوڑھ کاٹنا۔"

جناب حقی حق نے کرپشن کی کہانی جنرل ایوب خان کے دور سے شروع کی ہے۔ نام نہاد اصلاحات اور بیکار قسم کے بے شمار تحقیقاتی کمیشنوں کے حوالے سے قوم کی خون پسینے کی کمائی کو برباد کیا گیا۔ جاگیرداروں اور وڈیروں نے سول افسروں سے مل کر زرعی اصلاحات کو ناکام بنوادیا۔ صنعتکاروں نے سول افسروں کو رشوت کی راہ پر لگالیا۔ خود ایوب خان کا فرزند دلبند گوہر ایوب بہت بدنام ہوا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ 1968ء میں گوہر ایوب گندھارا جیپ لمیٹڈ' ہاشمی کین کمپنی لمیٹڈ' گوہر حبیب لمیٹڈ' جانانہ ڈی مالوچو ٹیکسٹائل ملز اور اروسرا انوسٹمنٹ لمیٹڈ کے چیئرمین وڈائریکٹر تھے اور ان کے اثاثوں کی مالیت کم و بیش چار ملین امریکی ڈالر تھی۔ اس کے علاوہ گوہر ایوب نے غازی ٹیکسٹائل مل کے لئے 16 کروڑ نوے لاکھ کا جو قرضہ لیا وہ کبھی ادا نہ کیا جبکہ پانچ ملین روپے کے قرضہ جات انہوں نے معاف کروا لئے۔

ایوب دور میں جن "مشاہیر" نے حکومت سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو ایکڑ زمین کا تحفہ وصول کیا ان میں ہر بڑے طبقے کے لوگ شامل تھے حتیٰ کہ عدلیہ سے متعلق بھی بعض شرفاء شامل تھے۔ مثلاً جسٹس ایس اے رحمان' جسٹس محمد منیر' جسٹس عبدالعزیز' جسٹس کیکاؤس' جسٹس انعام اللہ خان وغیرہ۔ کم و بیش اتنی اتنی زمین افسروں نے بھی وصول کی مثلاً میاں امین الدین (گورنر مغربی پاکستان)' ایم ایم احمد

(سیکرٹری خزانہ)' چوہدری اکبر علی (وزیر پاکستان)' چوہدری اکبر علی (وزیر داخلہ)' خدا بخش بچہ' کرنل اے ایس بی شاہ (چیئرمین پبلک سروس کمیشن)' اے ایچ قریشی (چیف سیکرٹری)' آغا شاہی (سیکرٹری خارجہ)' ایس ایم شریف (سیکرٹری تعلیم)۔

ڈاکٹر حقی حق نے ضیاء الحق کے دور میں زمینیں الاٹ کروانے والوں کے نام بھی فہرست میں شامل کئے ہیں۔ 28 صفحات پر مشتمل یہ طویل فہرست کھلم کھلا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پاکستان میں انصاف حاصل کرنا عام آدمی کے لئے کیوں دشوار ہوگیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہر شخص زمینیں الاٹ کروانے' قرضے لینے' قرضے معاف کروانے' فیکٹریاں لگانے' مختلف اشیاء کی درآمد کے لئے لائسنس پرمٹ وغیرہ جاری کروانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ سب سے بڑا المیہ تو عدلیہ کا تھا کہ جج بھی اسی دوڑ میں شامل ہوگئے۔ ڈاکٹر حقی حق نے ان لوگوں کی بھی تفصیلی فہرست پیش کی ہے جو مختلف فوجی اور سول حکومتوں کے دوران علاج کروانے کیلئے امریکہ اور انگلینڈ وغیرہ جاتے رہے اور ان کے تمام اخراجات قومی خزانے سے ادا کئے جاتے رہے۔ ان کے نام دیکھیں تو تعجب سے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں کہ یہ سب لوگ کروڑ پتی ہیں۔ ان کی جائیدادوں اور بینک بیلنسوں کا شمار قطار ہی نہیں۔ ان کے بیٹے' بھتیجے اور داماد بڑے بڑے سول اور فوجی افسر ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذاتی خرچ پر بھی بیرون ملک علاج کروا سکتے تھے لیکن قومی خزانے کو لوٹنا شاید بہت ضروری سمجھا۔ چند نام ملاحظہ فرمایئے:

غلام دستگیر خان' مسز غلام دستگیر خان' میر نبی بخش کھوسہ' میاں عبدالخالق' یحیٰی بختیار' شریف الدین پیرزادہ' ظفر علی خان' غلام فرید چشتی' مسز ملک سلیم اقبال' طارق اقبال (فرزند ملک سلیم اقبال' دو دفعہ)' مسز ذوالفقار کھوسہ' سردار محمد عارف نکئی' حسن اختر موکل' رانا پھول خان' مسز منظور احمد وٹو وغیرہ۔

مہران بینک اور یونس حبیب سے براہ راست مستفید ہونے والوں کے نام بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ جاوید ہاشمی (20 ملین)' غلام مصطفیٰ جتوئی (5 ملین)' مرزا اسلم بیگ

(60 ملین)، مصطفیٰ کھر (4 لاکھ روپے)، جام صادق علی (برائے افتتاح مہران بینک 1506 ملین) وغیرہ وغیرہ۔

مالی کرپشن کے علاوہ سیاسی کرپشن پر بھی مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس حوالے سے ضیاء الحق کے بطور چیف آف آرمی سٹاف تقرر پر لکھا ہے۔ ''کرنل کے عہدے کے بعد جنرل ضیاء الحق کی ترقی کے مدارج جس قدر تیزی سے طے ہوئے اسی قدر پراسرار اور غیر شفاف بھی ہیں ورنہ جیسے واجبی ذہانت، تعلیم، غیر تسلی بخش ریکارڈ اور قیادت کی اہلیت کے شدید فقدان کے حامل شخص کا اس ذمے دارانہ منصب پر فائز ہو جانا مملکت کی بد قسمتی، عوام اور اس عہدے کی توہین کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی ترقی کی شرائط مروجہ و مطلوبہ سے زیادہ خفیہ اور اندرون خانہ ہی تھیں۔''

مصنف نے میاں شریف فیملی کی بے اعتدالیوں پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کے دور میں بھی صحافیوں اور ممبران اسمبلی کو جس جس طرح نوازا جاتا رہا اور خود شریف فیملی نے معاشی میدان میں جو عروج حاصل کیا اس کے بارے میں اعداد و شمار دیئے ہیں اور ان حربوں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ لوگ امیر ترین بن گئے۔ ان کو دو دفعہ اقتدار میں لانے کیلئے صحافیوں کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ نتیجے کے طور پر وہ صحافی کس کس طرح نوازے گئے وہ اعداد و شمار بھی حیران کن ہیں۔

''کوڑھ کی کاشت'' ہماری قومی زندگی کا ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری صورت اس انداز سے جلوہ گر ہوئی ہے کہ جس پر سوائے دکھ اور پچھتاوے کے کچھ بن نہیں آتا۔ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر اپنی قوم کو جگانے کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ ہر باشعور شہری پر لازم ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

خالد ہمایوں

''ہفت روزہ زندگی''

حرف تیکھے' لفظ کاٹ دار' لہجہ پر اثر اور بیان پر زور۔ کوڑھ کی کاشت کے مطالعے سے پہلے میں ایسی کسی تحریر سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ جہاں "الفاظ کا گھاؤ خنجر سے گہرا ہوتا ہے" والا مفہوم یوم کھل سکتا جیسا کہ اس کتاب کے پڑھنے پر آشکارا ہوا۔ اسلام ' جمہوریت' انصاف اور خوش حالی کے نام پر ہمارے ذبح کئے جانے کی اذیت اور حقی صاحب کی جرات اظہار' بے ساختگی اور حق گوئی پر حیرت کی کیفیت قاری کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتی۔

کوڑھ کی کاشت اردو ادب میں منفرد اسلوب اور تبصرہ و تجزیہ نگاری کی سمت میں نئے رخ کا تعین کرتی ہے۔ یہ کتاب پاکستان کے لوٹے جانے کی تاریخ کا مستند حوالہ ثابت ہوگی۔ میں حقی کو اللہ کرے زور قلم اور زیادہ والی دعا کی بجائے انہی کے بقول یہی مشورہ دوں گا کہ "سرجی ہتھ ہولا رکھو"

ڈاکٹر احسان پیرزادہ

ہارورڈ یونیورسٹی کیمبرج (یو ایس اے)

"کوڑھ کی کاشت" پڑھتے پڑھتے میں قدم قدم پر چونک اٹھا۔ کئی موقعوں پر گمان گزرا جیسے اپنی ہی کوئی بھولی بسری تحریر ہو۔ منافقانہ تکلف سے پاک یہ "بدتمیز تحریر" مجھے بہت پسند آئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ گالی سرگوشی میں نہیں دی جاتی اور دعا دیتے ہوئے چیخا نہیں کرتے۔

جیسا عنوان' ویسا ہی اسلوب کہ پاکستان کے بدمعاش حکمران طبقات اور ان کے طفیلیوں پر لکھتے ہوئے یہی لہجہ درکار تھا جو ڈاکٹر حقی حق نے اختیار کیا۔

جو کوئی پاکستان کے مختلف "معزز قبضہ گروپوں" کی اجتماعی تصویر (گروپ فوٹو) دیکھنا چاہیئے......... اس کے لئے یہ تحریر ہی کافی ہے جس پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حسن نثار "روزنامہ جنگ"

A BOLD CRITIQUE

A Ph.D in education, associated with the Board of Education, Chicago, USA, Dr. Haqqui Haq, has recently written 'Korh Ki Kaasht'. The author has worked hard, weaving references and facts, to expose the 'achievements' of our rulers. "Korh Ki Kaasht" (Harvest of Leprosy), focuses on how religious leaders, politicians, feudals, bureaucrats and army officers, have exploited the country and turned it into a god forsaken land.

Dr Haq has tried to expose the true face of our rules using facts and evidence. In Dr Haq's own words; "For the sake of their vested interests bureaucracy, image making media, yellow journalism and turban clad religious leaders try to hide the facts but like fragrance we cannot restrict foul smell by building walls and erecting barriers.

Occasionally, Dr Haq is harsh in his choice of words. For example, he writes; "These rulers at times call themselves Muslim League or Republicriticized the ill-deeds of the military and political governments needs to be appreciated. His criticism of the ruling class of Pakistan is unbiased, bold and effective ----- a quality not found in many of the books written on the same topic.

Azmat Abbas

Thanking by Daily **THE NEWS**

July 23, 2000

اسی ایک فضاء میں

جنرل پرویز مشرف کے عہد اقتدار کے اولین دنوں میں ان کی اور ان کی حکومت کے بارے میں درج ذیل تاثرات عوامی اور قومی سطح پر نہایت سنجیدگی سے مرتب ہوئے اور اس بات پر یقین کرلیا گیا کہ صورت حال میں تبدیلی واقع ہوگی' یہ توقع باندھ لی گئی کہ تبدیلی آئے گی' لائی جائے گی اور اسے یقینی بنایا جائے گا:

1۔ جنرل پرویز مشرف اپنے پیش رووں سے مختلف ہوں گے

2۔ بالآخر کڑے مواخذے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

3۔ جنرل صاحب کو کوئی نہ کوئی بنیادی تبدیلی لانا' انقلابی مژدہ سنانا اور اقتصادی چمتکار دکھانا ہی پڑے گا کہ اس کے بغیر ان کا حق حکمرانی مکروہ اور بلا جواز رہ جائے گا۔

لیکن کچھ بھی نہ ہوسکا

کچھ نہ کچھ کر دکھانا جنرل صاحب پر ہر طرح سے واجب اور ضروری تھا

کیونکہ ان کی پرواز کا جہاں کسی اور فضا سے متعلق لگتا تھا۔ جنرل پرویز مشرف احتساب کی جگہ اگراہیوں پر اور مواخذے کی بجائے وصولیوں پر لگے ہوئے ہیں۔ عوام کی امید اور تقاضا یہ ہرگز نہیں تھا کہ جس نے جو مال ہضم کیا ہوا ہے اس سے واپس لیا جائے بلکہ مطالبہ یہ بھی تھا کہ مال کی واپسی کے ساتھ ساتھ خائن کی چمڑی بھی ادھیڑی جائے۔ اس طرح کا ادھورا' ہتھ ہولا اور مخولیہ احتساب تو لگا ہی رہتا ہے جنرل صاحب اس میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دے سکے ہیں بلکہ انہوں نے یہ سیسہ پلائی ہوئی مثال کھڑی کر دی ہے کہ جرائم کی نوعیت خواہ کیسی ہی سنگین کیوں نہ ہو ہمارے قانون کی کشادگی ' سربراہ حکومت کی فراخ نظری اور مک مکا کے حصار سے باہر ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔

معافی سے لے کر جلا وطنی تک، متعلقین کے لئے ہر طرح کا تریاق جنرل صاحب کی پٹاری میں موجود ہے۔

شاید یہی وجہ ہو کہ ہم خیال' ہجولیے' خیالات سے بالکل عاری اور متصادم خیالات والے سب کے سب یک جان اور دو قالب ہو رہے ہیں چونکہ سب جانتے ہیں کہ نہ صرف اتفاق میں برکت ہے بلکہ اتفاق کی برکت سے ہی سب کی چمڑی بھی محفوظ رہ سکے گی۔

جنرل پرویز مشرف عدالتی فیصلے کی جس منڈیر پر کھڑے آئین میں نئے نئے پھول بوٹے اگا رہے ہیں اور نقش و نگار ابھار رہے ہیں عین ممکن ہے کہ یہ منڈیر اس قدر دیرپا اور دراز نہ ہو کہ جتنی نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یوں بھی عدالتی فیصلوں پر آفرین اور واہ واہ کا دورانیہ مختصر لیکن نفرین اور ملامت کا عرصہ طویل تر ہوتا ہے۔ انشاء اللہ اس مذکورہ عدالتی فیصلے کو بھی حسب معمول گلی گلی رگیدے جانے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی جنرل صاحب

جس عدالتی فیصلے کے بھرے میں آئین اور قانون سے چھیڑ خانیاں اور من مانیاں کر رہے ہیں یہ اس قدر دیرپا نہیں ہوگا۔ پانسہ پلٹنے اور بازی اکھڑنے میں بھلا دیر ہی کیا لگتی ہے یوں بھی جہاں عدلیہ کے ستون اور سائبانوں کا سایہ حکومتی مراعات، بخششی پلاٹوں اور ارزاں نرخ اراضی پر پڑ رہا ہو وہاں نظریہ ضرورت کی تپ اور معینہ مدت کا میعادی بخار جلد ہی اتر جاتا ہے۔

کل تک جن اعلیٰ منصفوں کا نام بنا وضو لینا جائز نہیں تھا آج ان کے بارے میں ہماری قومی تاریخ عجیب مخمصے میں ہے کہ ان کی عظمت کا کتبہ ان کے کئے گئے فیصلوں پر لگایا جائے یا ان کے حاصل کردہ بخششی پلاٹس پر۔

ہمارے خیال میں یہ جہاں بھی گاڑا جائے گا بدنماں ہی لگے گا:

جسٹس ایس اے رحمان 150 ایکڑ

جسٹس محمد منیر 150 ایکڑ

جسٹس عبدالعزیز 150 ایکڑ

جسٹس زیڈ بی کیکاؤس 150 ایکڑ

جسٹس انعام اللہ خان 100 ایکڑ

جسٹس مسعود احمد 40 ایکڑ

جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ 2 کنال

پچھلے دس پندرہ سالوں کے جن اعلیٰ منصفوں کے نام یہاں شامل نہیں ہیں ان کے نام بھی دستیاب ہوتے ہی یہاں شامل کر دیئے جائیں گے۔ (انشاء اللہ)

جنرل پرویز مشرف کو اس تاریخی مخمصے کے بارے میں تاریخ کی شہادت ہی سے راستہ نکالنا پڑے گا کہ نہ تو کسی بھی مقتدر کو اقتدار اعلیٰ کا ایسا بے محابا استعمال کبھی راس آتا ہے اور نہ ہی ایسے فیصلے مقتدر کے کسی کام

آتے ہیں کہ جن کے کرنے والے بذات خود تاریخ کے نزاع میں مبتلا ہوں۔

ہم اپنی کم علمی اور نااہلی کی وجہ سے یہ سمجھنے سے ابھی تک قاصر رہے ہیں کہ اقتدار کے اوّلین ایام میں جنرل پرویز مشرف کا نعرہ یہ تھا کہ احتساب سب کا ہوگا، بلاامتیاز، کڑا اور شفاف لیکن اس کی نفی وہ کئی بار کر چکے ہیں آخر کیوں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب انہیں مختلف حکومتوں سے مال بٹورتے رہنے والے صحافیوں کی فہرست پیش کی گئی تو وہ اس پر مواخذے کا عمل درآمد کرانے کی بجائے اس پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ صحافیوں کی اس مذکورہ فہرست کے شائع ہوتے ہی الزام و دشنام کی موسلادھار میں وہ خود کو بھی گیلا ہونے سے نہیں بچا سکیں گے۔ اسی طرح کا متضاد و مشفقانہ رویہ اُنہوں نے حمود الرحمٰن کمیشن کے نامزد مجرموں سے روا رکھا ہے۔ اس ضمن میں پہلی بدعملی تو یہ کی گئی کہ پوری رپورٹ کو افشاء نہیں کیا گیا اور دوسری بدعملی یہ کی گئی کہ جنرل صاحب اور ان کی حکومت کو یہ فکر لاحق ہے کہ پوری رپورٹ کے افشاء سے کون کون ناخوش ہوگا حالانکہ فکر یہ ہونی چاہیئے تھی کہ پوری رپورٹ افشاء نہ کرنے سے کہیں ان کا نام بھی ہماری تاریخ میں ان کے پیش رووٴں کے دوش بدوش تو نہیں لکھ دیا جائے گا۔

بددیانتوں کا بددیانتوں کو تحفظ دینا تو سمجھ بھی آتا ہے اور ہماری ریت بھی ہے مگر جنرل پرویز مشرف کی ایسی کوئی مجبوری ہرگز نہیں ہے۔ میاں نواز شریف کی جلاوطنی نے ظاہر کر دیا ہے کہ جنرل صاحب کا طریق کار لاکھ مختلف ہو مگر ان کی پرواز ہو بہو اسی فضا میں ہے کہ جس میں ان کے پیش رو محوِ پرواز رہ چکے ہیں۔

شفیق پبلی کیشنز کی دیگر مطبوعات

دلیل آفتاب — ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے مطالعات نعت

محراب — پروفیسر سیف اللہ خالد

دینی موضوعات پر نشری تقاریر

دیار عشق — مرتب: زبیر احمد

منتخب نعتیہ مجموعہ

کیسر کیاری — احمد ندیم قاسمی

شگفتہ کالم، ماضی کی امانت حال کے صفحات

ریزہ ریزہ — سید کاظم بخاری

شاعری

مزید گنجے فرشتے — عطاء الحق قاسمی

شگفتہ خاکے

شام ہوگئی جاناں — عزیز احمد

شاعری

کوڑھ کی کاشت — ڈاکٹر حقّی حق (شکاگو)

پاکستان کے لٹنے کی درد بھری داستان

سورۃ بنی اسرائیل، گواہی دے — ڈاکٹر حقّی حق (شکاگو)

اپنا اپنا جبرائیل — ڈاکٹر حقّی حق (شکاگو)

ہوئے تم دوست جس کے — ڈاکٹر حقّی حق (شکاگو)

مزاج بخیر — تنویر حسین

طنز و مزاح

پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال — پروفیسر سیف اللہ خالد

اُردو ادب کا مختصر جائزہ

ایک بوسے پہ یہ قیامت — اختر حسین ثمر

شاعری

ILLumination of Heart — ڈاکٹر نذیر احمد (برمنگھم)

ریزہ نجف — سید اسد رضوی

شاعری

ناشر

شفیق پبلی کیشنز

چوک گڑھی شاہو لاہور

فون: 092-42-6304761, 6370989

اسٹاکسٹ

جہانگیر بُک ڈپو

لاہور۔ راولپنڈی۔ ملتان۔ فیصل آباد۔ حیدر آباد۔ کراچی

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (مدیر اعلیٰ اردو ڈائجسٹ)

'کوڑھ کی کاشت ہمارے حکمرانوں کی ایسی غلط کاریوں کا ناقدانہ جائزہ ہے، جس کے نتیجے میں آج پاکستان تاریخ کے نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے'۔

حسن نثار (روزنامہ جنگ)

منافقانہ تکلف سے پاک یہ 'بدتمیز تحریر' مجھے بہت پسند آئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ گالی سرگوشی میں نہیں دی جاتی اور دعا دیتے ہوئے چیخا نہیں کرتے۔ جیسا عنوان ویسا ہی اسلوب کہ پاکستان کے بدمعاش حکمران طبقات اور ان کے طفیلیوں پر لکھتے ہوئے یہی درکار تھا جو ڈاکٹر حقی حق نے اختیار کیا۔

ڈاکٹر محمد صفدر (سرکی لوئی ول کنٹاکی۔ امریکہ)

'کوڑھ کی کاشت' ہمارے اس گم کردہ جرات مندانہ کردار کی طرف مراجعت پر اکساتی ہے جو حضرت عمرؓ سے کُرتے کا حساب طلب کر لینے سے وابستہ ہے۔

سید ارشاد احمد عارف (ڈپٹی ایڈیٹر نوائے وقت)

'کوڑھ کی کاشت' پاکستان کے حکمرانوں کا گزشتہ نصف صدی کا اعمال نامہ ہے اس کتاب میں ان قیامتوں کا ذکر ہے جو وطن عزیز پر اس ملک کے سول اور فوجی حکمرانوں نے نازل کیں۔

ڈاکٹر انور سدید (نوائے وقت)

آپ ڈاکٹر حقی حق کو منکر سمجھیں یا نکیر لیکن انہوں نے ہمارے سامنے ہمارا نامہ اعمال رکھ دیا ہے اور قیامت کے روز کا انتظار نہیں کیا۔ جب کوڑھ کی کاشت کرنے والا کوئی حکمران سزائے خداوندی سے بچ نہیں سکے گا۔

ڈاکٹر شبیر احمد (لارڈہل۔ فلوریڈا۔ امریکہ)

ڈاکٹر حقی نے کوڑھ کی کاشت لکھی اور کیا خوب لکھی۔ وہ نہ صرف قلم کو قوت کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں بلکہ ان کی تحریر تخریب کی نشاندہی کر کے تعمیر کی خبر دیتی ہے۔

ڈاکٹر احسان پیرزادہ (ہارورڈ یونیورسٹی کیمبرج امریکہ)

حرف تیکھے، لفظ کاٹ دار، لہجہ پر اثر اور بیان پر زور۔ میں حقی کو اللہ کرے زور قلم اور زیادہ والی دعا کی بجائے انہیں کے بقول یہی مشورہ دوں گا۔ 'سرجی ہتھ ہولا رکھو'

Azmat Abbas
(THE NEWS 23-07-2000)

The author has worked hard, weaving references and facts, to expose the achievements of our rules. His criticism of the ruling class of Pakistan is unbiased, bold and effective -- a quality not found in many of the books written on the same topic.